



# کھیا دھوا انفوق

محمد خالد اختر

## محمد خالد اختر

محمد خالد اختر کے لیے اس کے والدین نے سوچا تھا کہ وہ ایک بڑا انجینئر بن کر نام اور دولت پیدا کرے گا۔ لیکن انگریزی ادب، جو سکول کے زمانے سے ہی اس کے منہ کو لگ گیا تھا اور رابرٹ لوئی سیٹونسن نے اسے ایک طرف ادب کا کیڑا بنا دیا۔ اور دوسری طرف اس کے اندر نیلے کھلے سمندروں، بادبانی جہازوں اور ہل کھاتی ہوئی ندیوں کے لیے ایک گہری جذباتی لگن پیدا کر دی۔ وہ انجینئر ضرور بنا اور ولایت میں اس نے کچھ سال عملی تربیت بھی پائی، لیکن اپنے مزاج اور ذہنی ساخت کے اعتبار سے وہ ایک سیلابی ادیب ہی رہا جو اپنی روح کی غذا کے لیے شہروں سے دور قصبوں اور صحراؤں اور دریائی علاقوں میں بھٹکنا پسند کرتا ہے۔

محمد خالد اختر ۱۹۴۶ء سے لکھ رہا ہے اور اب تک اس نے افسانہ، طنز و مزاح، سفرنامہ، خاکہ کی شکل میں اردو ادب کو بہت کچھ دیا ہے۔ ملازمت اور خالگی زندگی کی پابندیاں اس کے اندر کے ادیب کو پوری طرح نہیں کچل سکیں۔ وہ چار سال سے اپنے مخصوص انداز میں اردو کے ماہنامہ ”نون“ کے لیے بڑی باقاعدگی سے لکھ رہا ہے، اور ان دنوں وہ اردو میں ایک نئی طرز کے ناول پر کام کر رہا ہے!

محمد خالد اختر  
کھویا سوا اُفق

افسانے ، مضامین

مکتبہ حبیب لاہور

جید حقوق محفوظ

بار اول ————— ۱۹۶۸ء

طابع و ناشر: ————— رشید احمد چوہدری

مکتبہ جدید پریس لاہور

# انتساب

ضیاء کے لیے

جو کچھ تم نے مجھے دیا  
اس کا یہ صلہ نہیں  
اس کا صلہ کوئی کیسے دے سکتا ہے!  
او مجھلا، بیس کے شہزادہ!  
حصین، جلیے اور فولاؤ کی طرح چمے  
انسانیت کی ترپ اپنے دل میں لیے  
کس کھوٹے ہونے افت پر تہادی نظریں ہی ہیں۔  
یہ خاموشی کیا ہے؟  
یہ برخانی چاڑوں کے دامن میں لپٹی ہوئی جھیل کا سکوت!  
ہمیشہ میں نے چاہا کہ تم کسی طوفان سے آشنا ہو جاؤ  
بعض دند میں تمہیں بالکل نہیں سمجھ پاتا  
ایک عام انسان جیسا کہ میں ہوں  
اپنی کمزوریوں اور خواہشوں کی آگ میں سگتا ہوا  
میں کیسے ایک دیوتا کو سمجھ سکتا ہوں!

محبت اور ہمت اور اگلی جو تم نے مجھے دی

اس نے زندگی کو جینے کے قابل بنایا۔

اس سے زیادہ میں نے زندگی میں کچھ نہیں پایا

کہ میں تمہیں جانتا ہوں

اس لیے یہ کتاب جیسی کچھ بھی یہ ہے، تمہاری ہے۔

تم اس کو رو! تم، جس نے مجھے وہ کچھ بنایا جو میں ہوں!

# ترتیب

پیارے بچے والے سے

۹

کھوٹا تراغ

۲۷

سائیں حیدر علی قندک

۳۵

فرقہ ڈائمنیشن

۴۷

پھلیاں اور عبدالباقی

۹۳

رفقہ ادب

۱۰۳

ایک باتصویر سوسائٹی میگزین

۱۱۳

سٹرکچر کا ادبی کیریئر

۱۶۹

ڈیلیوسے نوں کوٹ سبک

۱۵۵

معلوماتی قاعدہ - ۱ - پگڑی کے لیے

۱۶۳

مقیاس المبت

۱۸۹

تفصیل نگاری سے توجہ

۱۹۹

زیبر سکیم

۲۳۱

چچا سام کے نام آخری خط

۲۴۱

دہقاننیرینورشی

۲۸۳

معلوماتی قاعدہ - ۲۰ - تدریس بچے پگڑی کے لیے

۲۹۹

آخری دن

# پیارے پڑھنے والے سے

یہ مجھ سے میرے ان انسانوں، طنزیہ خاکوں اور سفرناموں کا انتخاب ہے، جنہیں میں نے دیکھا  
 فرمایا اپنی بلا متعلقہ کاپی زندگی کے پچھلے انیس بیس سال کے عرصے میں لکھا۔ جب میں نے انہیں لکھا  
 تھا تو مجھے قطعاً یہ خیال نہ تھا کہ وہ کبھی ایک کتاب کی شکل میں چھپیں گے۔ اس لیے میں نے ان کو  
 صفحہ خورد کھینے کی جگہ کرکٹس نہ کی۔ مجھے کوئی بدحوالی نہیں کہ وہ ادبی شاہکار ہیں، یا ان میں باریک یا اسٹو  
 کی کوئی خاص خوبی ہے۔ میں نے انہیں اپنے اکیلے اداس لمحوں میں غم کو مہلانے کے لیے لکھا تھا،  
 اور جب وہ عیروں کی فراخ دلی کی بدولت ماہناموں میں چھپے تو مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہو کہ چند  
 پڑھنے والوں کو ان کا اندازہ چھا لگا۔

اب انہیں دوبارہ پڑھتے ہوئے ہیں دیکھتا ہوں کہ وہ کچھ کچھ تاریخی رنگ سے آلودہ ہو  
 چکے ہیں۔ ایسے (SSA۲) کی مادہم جو انگلستان میں ولیم پیرلٹ، چارلس لیب اور سٹیون  
 کے زمانوں میں بڑی مقبول تھی اور جسے بیسویں صدی کے اوائل میں جیمس ٹرن، ہیلنگ اور رامہٹ  
 رنڈ جیسے استادوں نے اپنے خیالات کے اظہار کے لیے بڑی خوبی سے استعمال کیا، اب  
 وہ ان مرحلوں کے ہے۔ ہماری زبان میں اس صنف کو پینے کا موقع ہی نہیں ملا اور اس نسل کے  
 نوجوانوں کے لیے اس میں اب کوئی کشش نہیں۔ بلکہ جھپکنے میں ہم غلطی دور میں داخل ہو  
 گئے ہیں اور ایک خوفناک رقارے ایک نئے 'یوٹوپیا' یا ایک نئی بربریت کی طرف جھاگے  
 جا رہے ہیں۔ آئین فلینگ جیسے مصنفوں کی مقبولیت جس کے ناول سبزی اور مار وھاڑ کے واقعات  
 کے سستے مرکب ہوتے ہیں اس دور کا ایک سہل ہے۔ تنہید کلاسیکی ادب کا دور رہا جسے ہم اب  
 سمجھتے آئے تھے، اب ختم ہو رہا ہے۔ ہمارے بچے اب کامکس پر کل رہے ہیں۔ خواہ ہم اس کا  
 ماتم کریں یا نہ کریں یہ حقیقت ہے کہ فلم اور ٹیلی ویژن کے میڈیم انسانوں کے افکار اور اشغال میں ایک  
 ناگزیر انقلاب لے آئے ہیں اور ان تمام ابھی مستقبل کے دھندلوں میں ہے۔ بڑے کثیر المقداد چھپنے



واسے اخبارات ادب کی جگہ لے رہے ہیں۔ 'لائٹ' اور 'ٹائم' جیسے میگزینوں کو دیکھتے ہوئے یہ بیدار قیاس نہیں معلوم ہوتا کہ آئندہ ادب اضافہ لکھنے والی مثلیوں پر تیار ہونے لگے، ایک ڈھلے ہوئے خاص اسلوب میں۔ وہ دنیا بھر اکٹس لکھے اور جاوے آرویل نے اپنے تخیل کا داروہ مجریہ نیو ورلڈ اور ٹائٹینیم ایٹی فور میں تصور کی ہے اگر ایم آئی نہیں تو آنے والی ہے!

اس انتخاب میں مشورہ کیانی دکھایا ہوا نئی میری آدھن چیزوں میں سے ہے۔ یہ نیا نیا ۳۴م ۱۹م میں اسے ہر وار کی ایک سرے میں لکھا تھا اور اپنی پہلی شکل میں اس کی طوالت موجودہ صورت سے دو گنی تھی۔ سالوں بعد ۱۹۵۴م ۱۹۵۵م میں سہادت حق غرض سے "سوریا" میں شکار کا ذکر بیروت کے بعد چھاپا اس نے اس میں تبدیلیاں نہ کیں، صحت کئی حصے حذف کر دیے جو اس کے نزدیک کہانی کے تاثر کی وحدت کو زائل کرتے تھے۔ استاد کے تصور سے "ٹچ" سے یہ کہانی واقعی بہت بہتر اور پہلے سے خوبصورت ہو گئی کیونکہ غنیمت سب کہہ کر دینے میں نہیں، بلکہ کچھ ان کا چھوڑ دینے میں ہے۔ یہ اس تجربے میں سب سے اچھا اور مکمل شے ہے۔

"ڈیپلو سے نوں کرٹ ٹک" ایک سفری روزنامہ ہے۔ یہ ۱۹۴۵م میں لکھی گئی جب میں نصر پاد کو کس اس دور دراز صحرائی تیلے گاؤں میں سکول ماسٹر تھا۔ ان دنوں میرا دوست احمد زیم "تاسی" ادب لطیف "کالڈیٹر تھا جس نے یہ روزنامہ لکھی اور خواہش ظاہر کی کہ یہ ہمارے مشترکہ ناموں سے چھپے۔ ندیم نے اس غلط سلاط لکھی ہوئی چیز کو سزاوار اور اس میں کئی حسین ٹچ دیے۔ جب یہ شائع ہوئی تو میں خوشی اور غم سے پھولا نہ سکیا۔ یہ میری پہلی چیز تھی جو کسی اور دور سے بچ چکی تھی۔ میں نے اپنی اس مطلوبہ چیز کو جیلوں بار پڑھا اور اپنے نام کو چھپا ہوا دیکھ کر میری طبیعت نہ جھرتی تھی۔

"ایک دہقان پر نیرد رشتی" بام پور کے ایک گاؤں میں لکھی گئی اور ساری کی ساری

ایک نشست میں ایہ واحد چیز ہے جو میرے تخیل (۱۹۸۵ء) نے مجھ سے کھوئی۔ میں نے اسے نہیں لکھا۔ یہ "سوریا" میں صہیت واسے نے چھاپی "مقیاس الحبث" جو میری چاکر اڑوہ میں

ایک بار وہ گردیوں کا حاصل ہے، بھی "سویرا" میں چھپی اور خوشی کے واسطے اس کے بارے میں انہی اور حوصلہ افزا تھی۔ باقی مضامین میں سے بیشتر "آؤنگار" میں چھپے ایک دو ادب لطیف "اور داستان گو" میں۔ انہیں میں نے دل بہلا دے کے لیے لکھا اور میں امید کرتا ہوں کہ پڑھنے والے کو ان میں کچھ خوشی ملے گی۔

میں ایک قدرتی لکھنے والا نہیں ہوں۔ میں بڑی وقت سے ایک ایک کر لکھتا ہوں۔ جیسے لکھتے ہو وہ آدمی جلا ہلکا کے باتیں کرتا ہے۔ لکھتا میرے لیے بڑا جان جو کھوں اور خون پسینہ بہانے کا کام ہے۔ حقیقتاً میں انگریزی ادب کا میٹر ہوں جس کے لیے میری جھوک کی سیر میں نہیں ہر پاتی۔ کتابوں کی خوشبو میرے دماغ میں لٹھیل شراب کی طرح چڑھتی ہے، اور میرا خوشی کا تصور ایک کتابوں کی دکان یا ایک لائبریری کے اندر جانے اور کتابوں کو سونگھنے، چھونے اور ان کے ورق الٹنے، دیکھنے، سے پورا ہوتا ہے۔ مجھے لگتی تھی کہ اچھی کتاب دے دی جائے، کوئی سٹیو سنوٹن، دماغ، آپ جی، یا سفری سرگزشت! میں دنیا سے اور کچھ نہیں چاہوں گا اور مکمل طور پر خوش اور نکل رہوں گا۔ میرا لکھنا محض حسن اتفاق ہے اور سالوں کی انگریزی کتابوں میں ڈوبے رہنے کی لت سے میری یہ عادت پک چکی ہے کہ میں انگریزی میں سوچتا ہوں اور اردو میں لکھتے ہوئے مجھے انگریزی میں سوچنے ہوئے جھلوں کا ایک طرح سے ترجمہ کرنا پڑتا ہے۔

بعض وقت بالکل لفظ لفظ! اور درہن بچا ہنٹ! آئی۔ شاید آتے آتے آجائے!

اس انتخاب میں میں نے دو عبدالباقی، کمانیاں بھی شامل کر دی ہیں۔ میں نے بہت سی عبدالباقی کمانیاں لکھی ہیں۔ اور اس کو دار نے دی ہیں (میں پڑھنے والوں کے دل میں تصویریں بہت کسی جگہ حاصل کر لی ہے۔ مجھ سے اکثر پوچھا جاتا ہے کہ آیا چاہا عبدالباقی کافی اوتاج و جدو ہے یا دھکم پیر تخیل کی پیداوار ہے۔۔۔۔۔ عبدالباقی زیادہ تر میری اپنی تخلیق ہے۔ میں نے اسے اپنی جان سپینے کسی خاص شخص پر نہیں ڈھالا۔ خود مجھ میں بہت کچھ عبدالباقی 'سوجھو' ہے۔

اس کتاب کے چھپنے میں مجھ سے زیادہ میرے ناشرین اور میرے چند مخلص دوستوں کی

ہمت اور مستحق کا دخل ہے۔ ان کی ہمت کے بغیر یہ افسانے اور مضامین کبھی ایک کتاب کے سرورق کے درمیان یکجا نہ ہو سکتے۔ میں دنیا کا کمال ترین شخص ہوں اور میں نے اپنی نگارشات کو حفاظت سے سنبھالنے کی کبھی زحمت نہیں کی۔ انہیں اب مختلف رسائل میں سے کشاکش کرنا ایک ناممکن نہیں تو بے حد کٹھن کام معلوم ہوتا تھا۔ اگر میرے بھائی اور دوست ضیاء نے ان میں سے کئی ایک کو سنبھال کے نہ رکھا ہوتا تو وہ پرانے ماہناموں کی خاکوں میں بالکل کھو چکے ہوتے (اگرچہ اس سے اردو ادب کا بال بھی بیکانہ ہوتا)

میں اپنے دوست اور ہم پیشہ رفیق کاظم کا بھی شکر گزار ہوں جس کا ادغام کوئی حد ہی نہیں جانتا۔ اس انتخاب کی ترتیب و تدوین میں اس نے میرا ہاتھ بٹایا بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ سدا کام ہی اس نے سر انجام دیا۔ اس کے غلوں کے بغیر مجھ کو اتنی آسانی سے اشاعت کے مرحلے تک نہ پہنچ سکتا۔

ادب ایک آخری لفظ !

ثوبی ہاتھ میں لئے اور کھیل شروع ہوئے سے پہلے سٹیج پر آخری بار جھکنے ہوئے میں پیارے پڑھنے والوں پر یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میری خامکارانہ قلبی فوضفیں ادب نہیں، اور نہ ہی ادب ہونے کی دعویدار ہیں۔ لیکن جیسا کہ آبیور گولڈسمتھ نے اپنے مشہور ناول "وکر آف وکسفیڈ" کے پیش لفظ میں لکھا ہے (وہ اسے اختیار کرتا ہے)۔

ایک چیز میں سو عیب ہو سکتے ہیں اور سو باتیں ان کو خرابیاں ثابت کرنے کی خاطر کہی جاسکتی ہیں۔ یہ سب کچھ یوں ہی ہے۔

"ایک کتاب ان گنت غلطیوں کے باوجود درست بن سکتی ہے، یا ایک بھی یہودگی کے بغیر بہت روکھی پھسکی اور غیر دلچسپ ہو جو اس کے پُرکمزج سمجھتے ہیں، میری کتاب میں ان کو کچھ لطف حاصل نہ ہوگا۔۔۔۔"

یہی کچھ میں اپنی کتاب کے بارے میں کہتا ہوں۔۔۔۔۔ یہ تمنا کرتے ہوئے کہ پڑھنے والا کم از کم اسے ایک کتاب دینے والی کتاب نہ پائے گا۔ میں نے یہ کہانیاں اور افشاں تیر خیزی اپنا ہی بھلانے کے لئے لکھی ہیں، اور اگر وہ کسی اور کو بھی بخوشی ہی فرحت دے سکیں تو مجھ کو خوش نصیب اور کون ہوگا؟

محمد خالد اختر لاہور

# کھویا ہوا اُفت

وہ سرائے جس میں جا کر میں ٹھہرا، ریوے اسٹیشن کے بالکل سامنے تھی، جو دراصل یا قریوں کے لیے مخصوص تھی۔ میرا کردہ داغنے کے دروازے کے باتیں جانب اوپر کی منزل پر تھا۔ کمرے کے دروازے پر ایک پھوٹی سی آہنی تختی لگی ہوئی تھی جس پر ایک مربیع میں چند ٹیک نال ہند سے مندرج تھے۔

اگر اندر کا دروازہ اور باہر کا سلاخوں والا دروازہ دونوں کھلے ہوتے تو چڑیا گھر کے کسی پتھرے میں رہنے کا احساس ہوتا اور مجھے تو کوئی بار عروس ہوا کہ اپنی سرخ نماتی، سبز ہیٹ اور بنی لے کی ڈگری کے باوجود میں کوئی بہتر قسم کا لنگوڑ ہوں جو کھڑکی میں سے نیچے اسٹیشن کے سامنے بیٹھے ہوئے بندوں کو پہچان کر بجائی بندی کے جذبے کے تحت مسکرا رہا ہے۔

صبح ہوتے ہی میں بندروں اور دیوتاؤں کے اس مکن کو جسے ہر دوار کہتے ہیں، کھوجنے کے لیے نکل پڑا۔ میں نے آنکھوں پر دھوپ کا سیاہ چشمہ لگا رکھا تھا اور اپنے سبز فیلٹ کے اگلے گیسے کو نیچے کیچنے لیا تھا۔

کسی اجنبی جگہ کو دیکھنے اور اس کا بغیر غائر مشاہدہ کرنے کا بہترین طریقہ میرے نزدیک یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو اس کی نگہوں، اس کے کوچوں اور بازاروں میں کھودے۔ میں نے آج تک کبھی کسی جگہ کے قابل دید مقامات کے بارے میں کسی سے نہیں پوچھا۔ ہمیشہ اپنی دریا فنتوں پر کولمبس کی طرح اچانک اور ناگہانی

آنکھن ہوں اور مجھے اس میں لطف آتا ہے۔

دھبہ کے آخری دن تھے۔ سخت سردی تھی۔ میں اس طرف ہوا جدھر کو پوڑی ہے۔ خدا کی میٹھی "ہر" تک بے جانے والا یہ راستہ ایک فراخ سینٹ کی بنی ہوئی سڑک ہے۔ دوکانیں بند تھیں مگر خندہ جو انسان کے مقابلے میں زیادہ سحر خیز حیوان ہے، جاگ رہے تھے اور ہر جگہ موجود تھے۔

خدا معلوم وہ میرے متعلق کیا سوچتے تھے۔ بظاہر ان کے انداز سے ایک بڑا ترانہ معنات سی ٹپکتی تھی۔ غالباً وہ اس شہر کو اپنا شہر سمجھتے تھے اور انسانوں کو غاصب اور ناخواندہ مہمان۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کو چھوڑ کر دوسرے حیوانوں سے ان کے مراسم نہایت خوشگوار اور مہذب ہوتے تھے۔ ایک جگہ میں نے دس بارہ بندروں اور ایک نو عمر ساڑ کو مکمل اتفاق سے کچھ کھاتے ہوئے بھی دیکھا۔

اپنے بائیں طرف مکانوں سے دو در — بہت دور، میں نے سورج کو چند گلاب کی پاڑیوں کے اوپر جھانکنے ہوئے دیکھا۔ ان پاڑیوں پر زرو لمبی گھاس سے کی تاروں کی گھسیاں لگتی تھی۔ ایک پاڑی پر چھوٹا سا مندر تھا۔ میں نے دل میں کہا "یہ ہے وہ رومان جس کو دھونڈنے سے تم اتنی دور آئے ہو —"

میرے سامنے ایک دیوار پر لکھا تھا — ذب ذب کلیم — آنکھوں کی ہر بیماری کا واحد علاج — ساتھ ہی بڑے بڑے حروف میں ہمیشہ اور بلا نامہ نازیبول اور ناز استوا استعمال کرنے کی ہدایت تھی — اس سے نیچے اردو ادب کی سب سے مشہور تصنیف کا اشتہار تھا — "ہدایت نامہ خاوند، مصنفہ کویراج ہرنام واسس بی۔ اے۔"

میں لاہور سے اور کئی چیزوں کے علاوہ جس شخص سے بھاگا تھا وہ حضرت

کو براچ ہر نام داس بی۔ اے جی تھے جو دیواروں پر، مندروں پر، مناروں پر، ہر جگہ اپنے مختلف ہدایت ناموں سمیت موجود ہوتے اور اب بھی یہاں براجمان تھے۔ سرک کے خانے پر میں پوڑی پرپسج گیا۔ اب زندگی اور حرکت کے آثار پیدا ہو رہے تھے۔ وہ مخلوق جوا افتار کے مختلف مرحلے طے کر کے بندرے انسان میں جمی ہو چکی تھی اپنے اپنے کاموں پر نکل رہی تھی۔

پوڑی پر ایک بورڈ منظرین کی طرف سے آویزاں تھا۔ پوڑی پر سوائے ہندوؤں کے اور کسی غیر مذہب کے آدمی کو جانے کی اجازت نہیں۔ میں جنرل آدمی ہوں اور اس قسم کے نوٹسوں کا پاس کسے والا انسان ہوں۔ — شرک پر کچھ اگے نکل گیا۔ ایک طرف گسے پانی کا تالاب تھا، جس میں بھارے جسم کی ایک عورت اپنے کپڑوں اور اپنی عینک سمیت کھڑی بار بار ڈبکیاں لگا رہی تھی۔ روٹی کی طرح گول، عینک لگا کر عید سنجیدہ چہرہ لپکا پڑا تھا، اور پھر نیچے چلا جاتا۔ اپنے گمان میں وہ اپنے پچھلے پاپ دھو رہی تھی۔ — اس بے حد متین، سنجیدہ اور عینک لگے چہرے کے ساتھ۔ ! میں اب ریڑھے لائن پرپسج گیا اور یہاں سے واپس پوڑی کی طرف مڑا۔ گنگا کا پاٹ یہاں بہت ہی تنگ ہے۔ اس کے دوسرے کنارے پر بازار اور گھاٹوں کے درمیان ایک دیوار ہے۔ شیشے کے چوکور لال ٹینوں والی سفید دیوار۔ اس پر بھی ایک نوٹس لگا تھا اور دیوار کے اوپر سے دوسری طرف جھانکنے سے منع کرتا تھا۔ مگر میں طویل قامت انسان ہوں۔ — پنوں کے بل کھڑے ہوتے بغیر میں نے منوعہ منظر کی ایک جھلک دیکھ لی۔ . . . . لیکن یہ بتانے کی کیا ضرورت ہے کہ میں نے کیا دیکھا۔

میں نے دل کوڑا کیا۔ کسی کھلا کیا پتا ہے کہ میں مسلمان ہوں۔ — بازار کی چند

پوچھ گچھیں مل گئیں اور گھاٹ پر پہنچ گیا۔ اسل پڑی تھی جہاں جھگڑاں کسی زمانے میں اترے تھے۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں پانڈوؤں کا ہاتھ پکڑ کر انسان اپنے تمام پاپوں سے نجات حاصل کر لیتا ہے۔

گھاٹ، دھوپ میں چمک رہا تھا۔ — دائیں ہاتھ دوکانیں، چوتھیں اور چوٹی ہوشیاں بیچنے والے دیدوں کے اسٹال تھے اور بائیں ہاتھ گھٹا — تیز رو اور بے پروا، ہڑی تیزی سے اپنے دو ہزار میل لمبے سفر پر سمندر سے ملنے جا رہی تھی۔

گھاٹ زندگی کی چل پہل اور گہما گہمی سے پر شور اور پُر رنگ تھا۔ فیض چاہتے اور مسحاتیوں کی دوکانیں، خراپچے والے، بڑی بڑی چھتریوں کے نیچے بیٹھے ہوئے جہاں دھاری سادھو — آگے بڑھا تو گھاٹ کے فرش پر بیٹھی ہوئی سحاموں کی فوج نے جو باتریوں کو چھیلنے کے انتظار میں تھی، لمبے ہاتھوں ہاتھ دیا۔ بعض نے مجھے صاحب بباد کہہ کر دعوت دی، بعض نے ہمارا ج، بعض نے راجہ صاحب اور چند نے محض رائے صاحب — !

ایک نئے خوبصورت بلی پر سے گزرد کر میں چھوٹے گھاٹ پر آیا۔ جس پر دھوپ میں چند عورتیں اپنے کپڑے اور بال سکھا رہی تھیں اور جہاں دھاری سادھو چھتریوں کے نیچے آس جاتے آنکھیں سینک رہے تھے اور چند گز رنے والی استریوں سے لیتا لگتا لیٹا جان کی باتیں کر رہے تھے۔

رات کو میں دیہات کے کمرے میں لیٹا پڑھا رہا۔ دس بجے مٹی نے بجلی اونٹ کر دی تھی، لیکن میں دیا جلایا، اس کی مدد سے پیل روشنی میں ایک بجے تک جا سکی تاویل برآمدی کا مڑہ "پڑھنے میں مشغول رہا۔ — یہ جا سوسا ناول بھی کتنی ذہنت اور کارگر جی سے لکھے جاتے ہیں۔ — خاص طور پر اس آدمی کے لیے جو کہ فرار چاہتا

پڑھتے پڑھتے سر گیا۔۔۔ اس کے باوجود کہ میں نے لارسی میں سے مرگے  
بھنے والے کئی خواب دیکھے، میری نیند گہری اور پُرسکون تھی۔

دوسرے دن میں رڑکی چلا گیا۔۔۔ صبح اٹھنے پر زندگی مجھے ایک بارسی ملے ہی  
تھی۔۔۔ ایک بیزار کن مشغلہ۔ زندگی کی خواہش بھی جنسی خواہش کی مانند کہیں چوٹی پر  
ہوتی ہے، کہیں نشیب میں۔

میں ہر کی پوڑی کی سڑک پر اتر آیا۔ سامنے سے ایک لارسی آرہی تھی، اس میں  
بیچہ گیا۔۔۔ سفر بھید طویل اور اکٹھا دینے والا ثابت ہوا۔ لارسی بنادر پور کے گاؤں  
پر چند رہنٹ کے لیے رکی۔ یہ گاؤں چند دوکانوں پر مشتمل تھا۔ ایک دکان پر میٹے سے  
بورڈ پر غلام قادر بالبر لکھا ہوا تھا۔ نیچے قلعینوں، استروں اور صابروں کی باتھ  
سے کھینچی ہوئی میٹر بھی میٹر بھی تصویریں تھیں۔ میں نے سوچا یہ حجامت کرانے کا بہت  
جی نادر موقع ہے۔ لارسی ڈرائیور سے کہہ کر میں غلام قادر بالبر کی دکان میں داخل ہوا۔  
اس اچھے آدمی نے اس خلق اور کشادہ پیشانی سے میرا استقبال کیا جیسے میں اس کا  
ماں جا یا بھائی ہوں۔

شیو کراتے ہوئے میں نے اس کو باربر کے بجائے بالبر کھنے کی غلطی بتائی۔ اس نے  
بڑے وثوق سے کہا "جی نہیں۔۔۔ اصل میں بالبر ہی صحیح ہے۔ باربر غلط ہے۔ بالبر  
بال سے بنا ہے۔ لوگوں نے خواہ مخواہ اسے گھاڑ کر باربر کر دیا ہے۔" میں نے اس دلیل  
کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا۔

کچھ دیر رڑکی میں بے مقصد آوارہ پھرتا رہا۔ پھر لارسی میں واپس ہرودار لوٹ  
آیا۔ بنادر پور کچھ دیر کے لیے رکے۔ غلام قادر بالبر کی پوڈا رہتی دکان کے باہر کھڑی



تمی۔ میں نے کمر کی میں سے ہاتھ ڈایا، اس پر اس نے دھیان نہ دیا۔

رات کو میں ہر دو وار کے واسطے سینا "گنگا ٹائمر" میں غم "موجی جیون" دیکھنے لگی۔  
اشتہاروں کی پہلی سلائیڈ غوروار ہوئی۔ ہدایت مار خاندان۔ مسند کو پراج ہر نام  
واس بی۔ اے۔ میرے خدا۔ یہ حضرت یہاں بھی موجود تھے۔

کچھ کا انجام بخیر ہوا تو میں اداسی سے منٹنگانے واپس اپنے سراتے کے خبرے  
کو لٹا۔ اسٹیشن کے سامنے سے گزرتے وقت شیرھیروں پر ایک دم فراخ مسکراہٹ  
سے میری ڈھیٹر ہوئی۔ سیاہ اچکن اور سفید طرے دار چٹائی میں ایک بست  
ہی فراخ مسکراہٹ۔ یہ "ٹ" تھا۔ پڑت "یہاں کہاں؟

اس اچانک ڈھیٹر کا اثر کچھ دور ہوا تو میں نے "ٹ" سے پوچھا "مجھے یوں  
تمہارے یہاں آنکھنے کا دم و گمان بھی نہ تھا"  
"ٹ" مسکرایا۔ وہی فراخ مسکراہٹ۔

تم آئے کیوں؟

وہی فراخ مسکراہٹ پھر "چلو آؤ چاہتے ہیں۔ یہی جھوکا ہوں؟  
ہم ریوے اسٹیشن کے ڈانگ دم میں جا بیٹھے "ٹ" نے چاک اور توسوں کا  
آؤر دیا اور سہوین اٹھا کر گویا میرا وزن کرتے ہوئے کہا۔ "تو یہاں تم دو ماں تلاش کر رہے  
ہو۔ کوئی علامت؟"

میں نے جواب دیا۔ پایا ہے، صرت دم کی کسراتی ہے؟

ایک فراخ مسکراہٹ کے بعد "ج"؟

"ج"۔ یہ بتاؤ تم کب آئے؟

"چھ بجے کی گاڑی۔ یہاں سراتے گیا۔ بڑی خشکوں سے پتا چلا کہ تم

وہیں ہو — اپنا صحیح نام تم نے کیوں درج نہ کیا؟

”ادہ — میں اس کے متعلق کھینا جھول ہی گیا — بات یہ ہے کہ میں اپنی خودی سے ٹھیکہ دار حاصل کرنا چاہتا ہوں — ہر پانی چیز انسان کو ماضی کی طرف کھینچتی ہے۔“

”ٹ“ نے چائے پیالی میں انڈلی — تم اپنے آپ سے بھاگنا چاہتے ہو — کیا فی الواقع ایسا ممکن ہے؟

”میرا خیال ہے — اگر انسان اس کا فی الواقع متمنی ہو۔“

چائے خلافت معمول بہت اچھی تھی۔

”ٹ“ نے پوچھا ”تم میں ایسا کیسی کیوں اٹھ جائے؟“

میں نے اس کی طرف دیکھا اور کہا ”ٹ“ تمہیں یاد ہوگا۔ جب ہم کالج میں پڑھتے تھے۔ تو میں نے ایک نظم لکھی تھی — ایک چھوٹی سی افتاد، نا پختہ اور بے بڑی چیز۔ آؤ بیکل چلیں، — آؤ بھاگ چلیں ہمارا یہاں سانس گھٹتا ہے — تم میرا مذاق اڑا یا کرتے تھے — ”مگڑٹ“ میں سچ کہتا ہوں، اگر ذی ضرب اشل کے مطابق یہ میرے جذبات آنے والے حادثات کا پیش خیر تھے — میں یہاں کیوں بھاگ آیا ہوں — اس کی وجہ کہنے میں اب تمہیں کوئی زیادہ وقت نہ رہتی چاہیے۔“

”ٹ“ بولا ”زندگی کو سنوارنا چاہیے ذکر بگھاڑنا۔“

میں نے کہا۔ ”تم زندگی کا سنوارنا کہتے ہو — یہ کہ میں امتحان پاس کروں۔ ایک محفوظ مگر بے روح ملازمت حاصل کروں۔ ایک بے وقوف بات تو فی عورت اپنی یا میری موت تک میری زندگی کے ساتھ چپک جاتے — یہ دیکھی روایتی زندگی صاف کرنا ایک تیندوہ ہے جو انسان کو اپنے بنوں میں بکڑ لیتی ہے — مجھی میں زندگی کے غلطے

ہیں اسٹیٹمنٹ کا چیلہ ہوں — میں تو ایک سیلا فی آوارہ گرد کی طرح زندہ رہنا چاہتا ہوں اور سیلا فی آوارہ گرد وہی کی طرح شرک کے کنارے چٹا چٹا کسی جہاز سی کی اوٹ میں اس خوبصورت زندگی کو الروداع کہوں گا۔

”ٹ“ نے میری بات سن کر صرف اس قدر کہا ”میں تمہیں مینے آیا ہوں اور تمہیں چن ہو گا۔“

اس کے لیے میں جاکا تیتھن تھا۔ میں نے ہوئے سے کہا ”اچھا“  
 ”ٹ“ کی آمد سے رومان ہمیشہ یوں ہی ختم ہو جاتا کرتا تھا — واپس جانا پڑتا تھا — واپس اسی دنیا میں۔

دوسرے دن ”ٹ“ اور میں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے سڑے سے باہر نکلے۔ پلے ڈالنے گئے۔ پھر اسپورٹس کا سامان بیچنے والی دوکان میں ”ٹ“ کو ڈمبل اور سینے کو کٹا وہ کرنے والے اسپرنگوں کو دیکھنے اور آزمانے کا خطہ ہے۔ اس کے بعد ”ٹ“ کا پروگرام کنگز اور چوڑیوں کی دوکان پر جانے کا تھا۔ اس نے کہا کہ چوڑی گری ہر دواری خاص صفت ہے، حالانکہ میں نے اسے یقین دلایا تھا کہ ہر دواری کی صفت صرف روحانیت ہے۔ — اس کے علاوہ وہاں کوئی اور صفت چنپ ہی نہیں سکتی۔

”ٹ“ عجیب و غریب آدمی ہے۔ بہت ہی خوش کلام سوکھے سے سوکھے موضوع پر ہری بھری گفتگو کر سکتا ہے۔ ہر چیز سے دلچسپی رکھتا ہے۔ ”ڈمبلوں اور سینز کٹا وہ کرنے والے۔ اسپرنگوں سے لے کر ریشمی اور سوتلی کپڑوں تک۔ کپڑوں کی جس اس میں بہت نیکی ہے۔ چنانچہ اس نے ہر دوام کے تمام برادروں کو اپنی اس جس کا شکار بنایا۔ ایک گرہ کپڑا دیا، لیکن تب ہے کہ ان میں سے ہر ایک کا چہرہ بیسیوں تھان کھرنے پر بھی ہشاش بشاش رہا۔

کچھ وقت یوں گزار کر ہم پھر گھاٹ پر نکل آئے۔ سورج کی چھیلی روشنی میں گھاٹ اپنی جلد و گھینوں سمیت پورے جوہن پر تھا۔ تصویروں کا ایک جھرمٹ تھا جو کھلے آسمان تلے کھل رہا تھا۔ میں اور 'ٹ' دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے پاٹ شالوں، اشالوں، سادھوں اور جاموں کے پاس سے گزرتے ہوئے سفید پل پر آتے جو اس گھاٹ کو ہلانا اور ڈالے گھاٹ سے ملتا ہے۔ 'ٹ' ہر چیز میں دلچسپی لے رہا تھا۔ بڑی بڑی چھتریوں کے نیچے، جیسوت بے سادھو، ٹنک ٹنک ٹنک ٹنک ڈالے ہاتھ، ڈکیاں لگانے والے یا تری۔ ہر ایک میں 'ٹ' کے لیے دلچسپی کا سامان موجود تھا، اور میرا 'ٹ' کو گرد و پیش کی چیزوں سے متعارف کرانے اور ان کو دکھانے کا انداز کچھ ایسا تھا جیسے میں اپنی جاگیر پر اپنے کسی دوست کو ادھر ادھر بھرا رہا ہوں۔

کچھ دیر گھومنے کے بعد ہم شرک پر جانے کے لیے سیڑھیوں کی طرف بڑھے تو راستے میں ایک عجیب و غریب عورت ملی۔

میں یہاں صاف کتنا جانتا ہوں کہ اب تک جو کچھ میں نے لکھا، دراصل اسی عجیب و غریب عورت کے لیے لکھا — کہ میں اس سے ملا — میں نے اسے دیکھا — میں نے اسے محسوس کیا — وہ ان عورتوں میں سے تھی جو گھاٹ پر سبک دھنگ کر پٹ بھرتی اور تن ڈھانکتی ہیں — لیکن وہ ان سے بے حد مختلف تھی، اس لیے کہ وہ عورت تھی، لیکن اس کا ایک ایک خط و خال کتنا تھا کہ وہ عورت سے یا تو بہت زیادہ ہے یا بہت کم — لیکن یہی ہی بہت گہری تھی یعنی کہ اگر تھی۔

اس کی آنکھیں صاف اور بے باک تھیں — لیکن اس بے باکی میں دور، بہت سی درد ایک بہت ہی بھولی نگاہ جیسے پڑے پڑے گرد آلود ہو گئی تھی — بچلا ہونٹ کچھ عجیب مزاجیہ انداز میں نیچے کو مڑا ہوا تھا۔ اس کے دونوں ہونٹ آپس میں کبھی نہیں

ملنے تھے، شاید اس خوف سے کہ اگر ملے تو ایک دوسرے سے چپک جائیں۔

اس کا سزا مل جل کر اس کوئی یا لگائی اور ایک جلتی ہوئی خواہش یا جلی ہوئی خواہش کا تاثر تھا۔

مجھے معلوم نہیں میرے ان الفاظ کا مطلب بھی ہے یا نہیں — وہ ایک جلی ہوئی عورت تھی جس کے بل ابھی تک نہیں گئے تھے۔

پل پر ہارے مٹانے آئے ہی اس نے عجیب فرائض انداز میں کہا "آؤ باتیں کریں۔" وہاں اس

گھاٹ پر نگہبانی کے پاس میری گائیں کر رہی تھیں۔

"باتیں کریں" ٹ نے اپنے ہونٹوں پر وہ خاص مسکراہٹ پیدا کی جو وہ عورتوں کے

دل جیتنے کے لیے استعمال کیا کرتا ہے۔ — یہ مسکراہٹ بے حد میٹھی اور پھیلی مسکراہٹ

ہوتی ہے جس میں ایک دیگر بات کے کا احساس تنہائی صاف پڑھا جاسکتا ہے۔

ٹ، محل ترین پیچیدہ و عاشق ہے۔ مجھے حیرت ہوئی کہ اس عورت کے لیے اس نے

یہ حربے کیوں استعمال کیا، لیکن میں نے سوچا کہ عورت کو تو جی ہو، اس کے اندر جذبہ ترحم

کو متحرک کرنا شاید ضروری ہوتا ہے۔

ٹ نے پھر اس سے بڑی علامتی سے پوچھا "آپ کا نام کیا ہے؟"

وہ عورت خلاء میں دیکھتی ہوئی بولی۔ "میرا نام؟ — میرے تو بہت سے نام

ہیں — جانکی بائی۔ سینہ پر ہوا۔ دھرتی ماتا۔ ستیا۔ بدرا۔ آڈیا۔"

لب دہان، ایسا جیسا بچے کا ہوا، غر قبل از وقت پڑا ہو گیا ہو — صاف اور بے لاگ

آنکھوں میں ایک ناقابل بیان یا سس تھی — ایک کھوئی ہوئی روشنی۔

ٹ نے دلچسپی لینے ہوئے صرف اس قدر کہا "خوب"

اس عورت نے جس کے اتنے سارے ہم تھے، اور یا کی جھللاقی ہوئی دوست کی سمت

اپنے نیلے جھورے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا "آؤ، وہاں لنگائی کے پاس بیٹھ کر باتیں کریں"

’ٹ‘ بولا۔ ہمیں بیٹھ جاتے ہیں — باتیں ہی ہیں کہیں کر لیں — کیوں؟  
”اچھا“

وہ مان گئی۔ ہم تینوں چل کے فرش پر منڈیر کے پاس بیٹھ گئے۔ ’ٹ‘ میں  
اداس عورت کے علاوہ بیسویں قسم کے ہلکے، یا تری، ساوھو، پانڈے، بچے، لٹکے  
اس چل پر سے گزر رہے تھے۔ ان میں اکثر تھپس نکلا ہوں سے ہمیں دیکھتے۔ غالباً  
سوچتے تھے کہ ہم گھاٹ کی اس عورت کے ساتھ بیٹھے کیا کر رہے ہیں۔  
منڈیر کے نیچے پوتر تالاب تھا جو عورتوں کے لیے مخصوص تھا۔ ڈبکی لگانے کے بعد  
جس وقت انسانی میڈ کیاں باہر نکلتیں تو پہلے سے کہیں زیادہ مضحکہ خیز اور فلیٹ دکھاؤ  
دیتیں۔ تعجب ہے کہ وہ پانی جو ان کے جسم کی غلاظت دور نہیں کرتا تھا، کیونکر انکی صبح  
کو مصیبتی کر دیتا تھا۔

تقریباً تین ساڑھے تین فٹ گہرے پانی میں چھ سات لڑکیاں اور عورتیں اپنی  
ساڑھیوں اور دھوتیوں سمیت کھڑی ڈکیاں لگا رہی تھیں۔ جب باہر ابھرتیں تو  
ایک عجیب انداز سے مسکراتیں — ان کے جسم کے تمام تر خدو خال —  
تمام اعضاء اور خم — تمام راز اور اسرار جامے سے باہر تھے — ’ٹ‘ بہت  
ہی پُر سکون مقبرے۔ وہ اس نظارے کو بھی دیکھ رہا تھا اور گھاٹ کی اس بکراں  
کی طرف بھی متوجہ تھا۔ چنانچہ جب اس نے اپنی پھٹی ہوئی قمیص کی جیب سے ریڈ  
لیپ سگریٹوں کا پکیٹ نکالا اور ہماری طرف بڑھایا تو ’ٹ‘ نے شکر ادا کر کے  
ایک سگریٹ لیا۔

اس عورت نے ہم سب کے سگریٹ سلگائے، ایک اپنے لیے سلگایا۔ پھر باتیں  
شروع ہو گئیں۔

’نٹ‘ نے پوچھا ”آپ کون ہیں — کیا کرتی ہیں؟“  
عورت نے جواب دیا ”تم نے پریم ادیب کا نام نہیں سنا — اس نے ہمارے  
ساتھ بیروانی کیا۔ ہم ادھر اس کے سنگ چلم کپڑی میں بیرونی کا پارٹ کرتے تھے۔  
اس نے ہمارے ساتھ شادی کا وعدہ کیا — پر وہ ایک اور عورت سے آیا — ہم  
یہاں گنگا نائی کے چرنوں میں جیون تباہ کرنے لگے آگئے۔“

’نٹ‘ نے میری طرف دیکھا — ایک صرٹ غلوں سے اس کو کوئی دلچسپی نہیں۔  
ہیں نے اس کو بتایا: ”پریم ادیب ایک ایکٹر ہے — کافی مشہور ایکٹر ہے۔“  
’نٹ‘ نے اس عورت سے پوچھا: ”ادھر فلم میں آپ کا نام کیا تھا؟“  
اس نے فوراً ہی جواب دیا ”سہانا سمرتہ“

ظاہر ہے کہ وہ سوجنا سمرتہ نہیں تھی۔ خیر اداوی طور پر میرے منہ سے نکل گیا ”ہرگز  
نہیں —“ یہ جھوٹ کہتی ہے۔

ماریسی کا بہت ہی گہرا سار اس عورت کے چہرے پر تھا اور تھوڑی دیر کے  
بعد گزدگیا — مجھے بہت انوسس ہوا کہ میں نے اس کی خود فریبی کے اٹھنے کو  
بھٹیں پہنچائی۔

وہ اصرار کرنے لگی ”نہیں — میں سہانا سمرتہ ہوں — میں ہی سہانا سمرتہ  
ہوں — سہانا سمرتہ ہی تو ہوں — سہانا سمرتہ۔“

اس ٹکڑے سے وہ مجھے نہیں، دراصل خود کو یقین دلانے کی کوشش کر رہی تھی کہ وہ  
سہانا سمرتہ ہے — میں جھوٹا ہوں اور وہ سچی ہے — اپنے کو مزید یقین دلانے  
کی خاطر اس نے ایک نئی گیت دھیمے دھیمے سُر میں گانا شروع — آواز میں فن نہیں  
تھا، لیکن دردمو جود تھا۔

’ٹ‘ نے پوچھا ”آپ کہاں کی رہنے والی ہیں؟“  
اس نے جواب دیا ”ہم — ہم امرتسر کے رہنے والے ہیں“  
”اوہ — آپ کا نام“

’ٹ‘ نے جواب دیا ”لام چند رہا“ — ہونٹوں پر وہی قراخ مسکراہٹ تھی۔  
عورت نے ’ٹ‘ کی طرف غور سے دیکھا ”تمہاری شکل بھی دام کی سی ہے۔“ پھر  
سے مخاطب ہو کر اس نے پوچھا ”تمہارا نام“  
”میرا — مرلی دھڑ“ مجھے کبھی کوئی رومانی نام نہیں سونچا۔  
عورت مسکراتی ”تمہارے ہاتھ میں مرلی تو بے نہیں“

میں جھینپ گیا — مگر بردوار میں جہاں ہر اتارے تھے، گلابی فضا میں ریڈ لپ  
کا دھواں منہ سے نکالتے ہوئے، مجھے ایک لمحے کے لیے محسوس ہوا کہ رومان میری نئی ٹنگی  
کے کندھوں سے چھو گیا ہے — میرا نہیں کسی اور کا — پر جانا پہچانا ہوا۔  
مگر کچھ دیر باتیں کرتے رہے۔ نیچے تالاب میں عورتیں اپنے گناہ و حقوق رہیں — کبھی  
کبھی ’ٹ‘ کی نگاہ اس طرف اٹھ جاتی تھی۔ دفعتاً جاگتی سجانا آتھائی طیش میں اٹھتی اور مل  
کی منڈیر کے پاس جا کر اس نے ہانے والیوں کو ایسی ایسی ٹنگی لگائیں دیں کہ وہ بوکھلا کر  
اپنے پاپ و دھونے چھوڑ کر باہر نکل گئیں۔ جب وہ ’ٹ‘ کے پاس آکر بیٹھی تو اس نے اس  
سے پوچھا ”تم نے بھنگ کیوں دیا ان کو“

عورت نے کوئی جواب نہ دیا — خلا میں چند منٹ دیکھ کر اپنی آنکھوں میں سے  
غصے کا میل صاف کر کے وہ ’ٹ‘ سے مخاطب ہوئی ”ہمیں ایک گھنٹے سے دو دام —  
— دات کو بہت ٹھنڈ لگتی ہے۔“

مجھے حیرت ہے ’ٹ‘ نے بڑے روکھے انداز میں اس سے کہا ”ہمارے پاس



تو کچھ بھی نہیں۔

عورت نے بڑے جھول پن سے کہا ”ہیس ے دو گئے کھل؟“  
 ’ت‘ نے پھر اسی رد کے انداز میں جواب دیا ”نہیں“ لیکن فوراً ہی اس کا لہو بدل  
 گیا۔ ”آپ ہمارے ساتھ چلتے — کیاں گھاٹ پر کیا پڑا ہے — ہم تمیں اکٹھے  
 رہیں گے — اچھا؟“

”میں — میں کہاں رہوں گی؟“

”جہاں ہم دونوں رہیں گے — ہمارے ساتھ“

عورت کی آنکھوں میں وہ ’جو‘ دور بہت ہی دور ایک گرد آلود سی چیز تھی اور سن  
 ہوئی — اور پھر سی چیز دو موٹے موٹے آنسوؤں میں تبدیل ہو گئی — غمنوں  
 مشکو لمبے میں اس نے کہا ”مام بھی ایسے ہی تھے؛  
 یہ کہ کہ وہ غلامی گھرنے لگی — ’ت‘ نے پوچھا ”کیسے؟“

”آپ جیسے — بالکل آپ جیسے — آپ ہی کی طرح سندر اور جگٹ“ خلا  
 میں گڑھی چوٹی ٹھا ہیں ’ت‘ کی طرف پھر کر اس نے بچوں کی طرح کہا ”تم مجھے اپنے ساتھ  
 لے جاؤ گے؟“

’ت‘ نے میری طرف اشارہ کر کے اس سے پوچھا ”یہ کیسے لگتے ہیں تمہیں؟“  
 عورت نے بڑے دلوق سے جواب دیا ”یہ — یہ کشمن ہیں — کشمن“  
 کہاں میں اور کہاں پُرسکون راتم کا ابیلا، جان پر کھیل جانے والا سجاتی کشمن سبجے  
 ایسا محسوس ہوا جیسے کشمن کی شان میں مجھ سے کوئی گستاخی ہو گئی ہے۔

’ت‘ نے پھر بڑے پیار سے عورت سے پوچھا ”آپ کون ہیں؟“

عورت پھر اسی دلوق سے بولی ”میں — بیٹے — میں سیتے ہوں“

ٹ کے بھی میں فرزندِ ساجد پیدائو گیا " سیتے نہیں — کو خلیا — دام مکھن  
کیاں کو خلیا "۔

" سیتے نہیں؟ اس کے لمحے میں انتہائی استغاب تھا — اس بچے کا استغاب جس  
کے یقینِ کامل کو یہ کہہ کر بدلتے کی کوشش کی جاتے " بھاپہ نہیں ماموں! وہ مزہ کھوے  
کہے " ماموں؟ "۔  
وٹ نے قطعیت کے ساتھ کہا " نہیں "۔

" نہیں " اور اس کئی ماموں والی عورت کی آنکھوں سے کئی آنسو چھپک پڑے ۔  
وٹ کا لہجہ فوراً ہی بے حد ملائم ہو گیا " تم بہاد سے ساتھ چلو — ہم تمہیں اپنی ماں  
کی طرح چاہیں گے — تمہاری سیوا کریں گے — ہم تمہیں اپنے محبت بھرے  
دل دیں گے "۔

" دل؟ " اس عورت کی آنکھیں کھل کر ڈراؤنی سی ہو گئیں — " دل؟ کہاں ہے  
دل؟ — لاؤ کہاں ہے تمہارا محبت بھرا دل؟ " اس نے اپنے بڑے بڑے ناخنوں سے  
ہاتھ یوں بڑھایا جیسے وہ وٹ کا دل نوچ کر باہر نکالے گی — لیکن فوراً ہی اس  
نے اپنا ہاتھ پیچھے پٹھایا " ماں سے محبت نہیں ہو سکتی — محبت استری سے ہوتی ہے۔  
شیو کی پارتی سے، شام کی رادھی سے، دام کی سیتے سے — میں تمہاری سیتے ہوں۔  
میں تم سے اسی طرح محبت کیا کروں گی جس طرح سیتے دام سے کیا کرتی تھی؟ "۔

وٹ اور میں دونوں سمجھ گئے تھے کہ یہ عورت محبت کی جھوکی ہے — اور بھی  
زیادہ جھوکی ہے۔ اس لیے کہ اس کے اگے ایک بار کھڑے ڈال کر بٹایے گئے ہیں۔ وہ  
بھیک مانگ رہی تھی، ایک حفاظت کرنے والے بچہ کا رنے والے مضبوط ہاتھ کی۔  
اور وٹ اس سے مطالبہ کر رہا تھا جو وہ اپنے وجود میں کسی اور کے لیے محفوظ رکھنا چاہتا

تھی — اس نئے چہرے کے لیے جس کی دھندلی دھندلی تصویریں وہ ہزاروں بار اپنی کوکھ میں بنا اور دشا چکی ہوگی۔

’ٹ‘ نے بڑی بے جگری کے ساتھ اس سے کہا ”نہیں سیتے نہیں؟“

عورت یلوس ہو گئی اور غلامیں دیکھنے لگیں جہاں شاید اس کا رام کھو گیا تھا۔  
تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے ایک آواز کو شش کی — ’ٹ‘ سے مخاطب ہو کر اس نے بڑے ہی دل کو موم کر دینے والے لہجے میں کہنا شروع کیا ”تیرہ سال سے گنگا مائی کے چہرہ میں پڑی راہ دیکھ رہی ہوں — میرا دم ایک دن آئے گا، ضرور آئے گا — اور مجھے بے جاتے گا،“ پھر اس نے ہرے سے کہا۔ ”گنگا مائی نے مجھے دھین دیا تھا — پانی کی بوندوں نے میرے کان میں بتایا تھا۔ جا کی چناؤ کرتا رہا۔  
دام ضرور آئے گا، اس کی آواز بلند ہو گئی، سو آج میرا دم آ گیا — میں نے کل رات جاڑے میں کانپتے کانپتے ایک مینا بھی دیکھا تھا — جیسے اس نے آنکھیں بند کر کے خواب کو یاد کیا، جیسے رام اور گلشن دونوں میرے دوارے بھوکے اور پیاسے آئے ہیں — دام تمہاری شکل کے تھے اور گلشن ان کی شکل کے، اس نے میری طرف اشارہ کیا اور ’ٹ‘ کی طرف جھیک مانگنے والی آنکھوں سے دیکھا، مگر اسے خواب کا جواب نہ ملا۔

بے حد یلوس ہو کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور جس طرح ایک سایہ چلتا ہے وہ آہستہ آہستہ میٹر جیوں سے اُتر کر روانہ ہو گئی، اور تھوڑی دیر بعد گھاٹ کے ان گنت بوٹوں کے دھبوں میں گم ہو گئی۔

میں سوچ رہا تھا کہ کتنی ناموں والی عورت جو تیرہ سال سے گنگا مائی کے چہرہ میں اپنے دام کا انتظار کر رہی ہے، شاید ہمیشہ ہمیشہ کے لیے میری زندگی سے چل گئی ہے۔

اور میں رام کا کردار اپنے کردار میں سمونما رہ گیا ہوں — انسان بھی کس قدر کمزور۔  
کس قدر عاجز اور کس قدر قابلِ رحم حد تک بیوقوف ہے۔

میں نے سوچا کہ یہ عورت کب تک اپنے موہوم رام کا انتظار کرتی رہے گی؟ — کب  
تک یونہی محبت کی بھیک مانگتی رہے گی؟ — کب تک؟ — ایک روز یونہی غلامی کھیتی  
دیکھتی رہ جائے گی۔

کیا دوسرے جہون میں اپنے رام کو پاے گی؟ — کون جانے؟  
میں نے سوچا اس عورت نے چوریاں کن ہوں گی، اور یقیناً پانڈوؤں، سادھوؤں  
اور جاموں کے منکودہ بازوؤں میں بھی میٹھی ہوگی۔ — یہ عورت جس کے بہت سے  
نام تھے اور جس کی دُوح گنگا جلی سے کہیں زیادہ پو تر تھی۔

# سائیں علی حیدر فندک

مصنفِ آپ جیات سے معذرت کے ساتھ،

فندک تفصیل۔ علی حیدر نام۔ خاندان کے نام سے آنا ہی چاہتا ہے کہ والدین کے دھنیے کا پیشہ کرنے تھے، اور لاہور میں قتلان سے چھیند روں کے ایک گروہ کے ہمراہ آئے تھے۔ انہیں لاہور کی آب و ہوا ایسی داس آئی کہ وہیں کے ہو رہے، اور پھر جہانے کا نام نہ لیا۔ فندک اٹھارہ سال کے تھے کہ والد کا انتقال ہو گیا، کچھ دن تو روٹی دھنک کر گزر اوقات کرتے رہے، مگر اس کام سے طبیعت بہت جلد سبک گئی، ایک روز دھنکے کے سامان کو، جو کہ میراث تھا بعد حسرت نہ بآتش کیا، اور فندک دین گئے، شوخ مزاجی اور موزونی طبع سے کراتے تھے۔ میٹھے میٹھے شہری مضمون باندھنے لگے۔ چنانچہ اس وجہ اس میں کمال پیدا کیا کہ لکھتے روزگار ہوئے اور عندیہ زمانہ کھلائے۔

اللہ اللہ کیے لگ تھے۔ آجکل کے محضر شاید ان کا کلام سن کر جنہیں، مگر انصاف کی بات کہو تو جیسے سادہ روزمرہ کو شعر میں بانوں نے نبھایا ہے وہ کچھ ان ہی کا حصہ تھا۔ سنا ہے چند حاسدان کو پکارتا کرتے تھے، اور بڑھاکتے تھے۔ ان کے کان پر بھن تک نہ دیتی۔ قرۃ العین تیز کہتے تھے، میں نے ان کو درگاہ پر ڈورے شاہ کے دروازے کے باہر لٹکوا پنے نہ دیکھا ہے۔ جلال میں آتے تھے تو ٹٹکوا بھی آتا دیتے تھے اور انت ہو جاتے تھے۔ واہ گزروں کو ایسی بے نقط سناتے کہ سب چھوٹے بڑوں کا ان سے ناک میں دم تھا۔ ان کا ایک چلیا تھا کہ شکر رنگت کی رعایت سے اسے کا لو پکارتے۔

وہ لکڑی کا حق تازہ کر دیتا، یہ بیٹے دم لگاتے رہتے۔ بھنگ بھی کالو ہی گھوٹا تھا۔ ان کے دل میں بھی کالو کی قدر تھی۔ چنانچہ منہ ہے کالو پر ایک ٹنوی بھی موزوں کی تھی، افسوس کہ اس کے اوراق امتداد زمانہ سے خالص ہرچکے ہیں اور اس دیوانے کی سبب سے جو کچھ باوجود اس ٹنوی کا سراغ نہیں مل سکا۔

جیسے ہر اکمال کے حاسد ہوتے ہیں ان کے بھی تھے کہ ایک بار لاہور کے چند بے فکروں کو ان سے ششدر کی سوچی۔ انہوں نے ان پر ایک جہر شیخ باقر ڈگڈگی سے لکھوائی اور دات کو ٹیکے کی دیوار پر چپکا آئے۔ صبح ان کی نظر پڑی تو فوراً سمجھ گئے کہ جہر کس کے دماغ کی تخلیق ہے۔ پہلے تو غائبانہ اپنے حریفوں کو جی بھر کے گالیاں دیں۔ پھر اسی دقت میں کہ ڈگڈگی پر ڈیڑھ دو سوا اشار کی جہر لکھ مادی۔ اس سے ان کی روانی طبع اور مشق سخن کا اندازہ کرنا چاہیے۔ اس ٹنوی کا ایک نسخہ کالو کے نوکر کے لڑکے کے ہاں موجود ہے۔ اس کے مطلع میں لکھتے ہیں،

واہ واہ کیسے بھتی ہے ڈگڈگی  
نما چاہے بند جب بھتی ہے ڈگڈگی  
اور ڈگڈگی پر رکھ دو ایک اور ڈگڈگی  
تو برائے نشت بن جاتی ہے کمری  
واہ واہ رے ڈگڈگی

باقی اشار اس قابل نہیں کہ انہیں نقل کیا جا سکے۔ افسوس! ان جہر ہرات میں سے بیشتر ہر درجہ تہذیب و دانش کی سے گم ہوئے ہیں اور کمال عشق اور امتداد جہر کی کثافت سے بھرے ہیں۔ دراصل اس زمانے کے شعر اکابر دلتور تھا، اور ان چیزوں کو شاعری میں ردوار کھتے تھے۔

سبحان اللہ کیا شگفتہ مزاج یار باش لوگ تھے۔ گو کہ جہاں دشمنوں میں ایک دوسرے کی خوب خاک اڑاتے تھے لیکن طبیعتوں کا آئینہ دشمنی اور عداوت کے دھوئیں سے ملبا ہوتا تھا۔ ایک یہ زمانہ ہے کہ کسی کے بارے میں رسالے میں ایک دو لفظ تنقید کے لکھ دو اور وہ بھی بغرض اصلاح تو فوراً منہ کو آتا ہے، اور ڈنڈا لے کے پیچھے ہو لیتا ہے۔

جوانی میں پیلوانی کا بھی شوق تھا۔ اسناد و مرحوم فرماتے تھے کہ ایک بار موچی دروازے کے باہر دنگل ہوا۔ بڑے بڑے نامی پیلوان لکھنؤ اور میرٹھ سے آئے تھے۔ ان کو بھی دیکھنے کا شوق چرایا۔ وہاں پہنچے۔ مہاجے پیلوان اور موٹو پیلوان کی ہندوستان بھر میں زور آزمائی کا مشہور تھا۔ کبھی کے بعد یہ بھی لگوتا کس، حم ٹھٹھک اکھاڑے کے بیچ جامہ بورد ہوتے اور دونوں پر ہاتھ مار کر مقابلے کی دعوت دینے لگے۔ منتظمین دنگل نے انہیں بہتیرا سمجھایا کہ اکھاڑا خالی کرو ابھی اور حور ہونا ہے یہ جھلاکس کی سنتے۔ ڈٹے کھڑے ہیں اور دشمن سے مس نہیں ہوتے آخر کو ایک ولایتی نے جو کہ منتظمین کا سربراہ تھا، اکھاڑے میں جا کر ان کی گردن دبوچی اور گھونٹے لگا کر انہیں باہر نکالا۔ اس کے بعد یہ چار مہینے بستر پر صاحب فراش رہے اور ایک سال تک لنگر مار چیتے تھے۔ پھر دنگل کا نام نہ لیا اور کسا کرتے۔ یہ میاں جوانی میں اچھے اچھوں کو پچھاڑا اب تو صنفیت ہو گئے ہیں۔

کھانے کے بے حد شوقین تھے۔ ماشاء اللہ خان بیگ شاہ سے ہیں کہ میں قلعہ سے انٹوں پر بغرض تہذات کشمکش و بادام لادنے آتا تھا کہ دوسرے شاہ کی درگاہ کے پاس سے گزر ہوا۔ دیکھا کہ دروازے کے باہر ایک کالا بھینگ شخص، تن پر ہنڈا، لاکھ سر پر، سر کو گھٹنوں میں دیتے بیٹھا ہے۔ ایک ٹوٹا لکڑ کا حقہ

پاس پڑا ہے۔ اس نے سر اٹھا کر نگاہ غلط انداز ڈالی اور پھر خدا جانے کیا سوچ کر ہاتھ اٹھا کر مجھے رکنے کا اشارہ کیا۔ میں رکا تو وہ شخص لولا میاں یہ کیا ہے جا رہے ہو۔ کچھ ہمیں بھی کھلا دیا۔ ماشاء اللہ خان کہتے ہیں کہ میں پہلے تو سہا یا اور اس شخص کی دیدہ دلیری پر حیران ہوا۔ ایک نوخیز لڑکا کہ جس کی مسیں انہی نہ بھلکی تھیں پاس سے گزرا، اس سے پوچھا کہ یہ کون شخص ہے۔ اس نے بتایا کہ قدک ہیں۔ یہ حالت زبوں دیکھ کر افسوس ہوا۔ قدک بڑی وضع داری اور رکھ رکھاؤ سے ملے۔ ایک سالم بوری کشش کی تہ والی اور پھانک پھانک کر کشش کھاتے رہے۔

عالم پیری میں دنیا سے بالکل الگ تھلگ ہو گئے تھے۔ سخاوت علی انکرایم۔ ایل۔ اے جو ان کے ساتھ بچپن میں اکٹھے کھیلے تھے کہتے ہیں کہ میں ایک بار ترکیہ میں غیم کے پٹر کے نیچے ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ سر اٹھا کر ایک سرسری سی نگاہ ڈالی اور پھر اپنے چہرہ میں سے جوتی نکالنے میں لگ گئے۔ مجھ سے بات تک نہ کی۔ میں نے بھی قفل دینا مناسب نہ سمجھا۔ میں ایک گھنٹہ بیٹھ کر اٹھنے لگا تو اوپر دیکھ کر کہا میاں! کیسے آئے تھے؟ میں نے عرض کیا "شرقی زیارت سے آیا" اس پر کہا "شکل آشنا معلوم ہوتا ہے۔ کیا نام ہے؟" میں نے نام بتایا۔ بڑی دیر تک سوچتے رہے۔ کہنے لگے حافظ کمزور ہو گیا ہے۔ کچھ یاد نہیں پڑا۔ لیکن میاں یہ تھیں انکر تھلک کی کیا سوچی۔ کچھ کہا کرتے ہو؟ میں نے اپنی بیاض نکال کر کھولنی شروع کی کہ ایک ٹھنڈی تہ بھر کر کہنے لگے "ہے دور پھر کبھی سہی؟"

جوان میں کو چہ عشق سے بھی آشنا نہیں رہے۔ اگرچہ بعد میں عورت کے نام سے چٹ ہو گئی تھی۔ مشورہ کہ تیس تیس سال کے تھے کہ ایک گنجرے کی بیوی سے شت ہو گیا۔ جیسے کالے جھنگ یہ خود تھے، ویسی ہی وہ بھی تھی۔ چترک عورت تھی، بدتر



بے حیا۔ استاد مرحوم نے بھی اس کبوتر کو دیکھا ہوا تھا۔ اور قصب کیا کرتے تھے کہ خندک کو اس میں ایسی کیا بات نظر آئی کہ ان کا پورا دیوان اس کی تعریفوں میں ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے دل پر کوئی حکم نہیں ہوتا۔ یہ ایک بار اسے جھگڑا ہی لے چلے تھے کہ کسی نے کبوتر سے کہہ کر کہہ دی۔ اس نے میرا مذاق نہیں ہے عزت کیا۔ کبوتر نے ان کے سر پر الزام ٹھہرا۔ اس واقعے کے بعد عورت کے سامنے سے کوسوں دور بھاگتے تھے اور جہاں کہیں کسی عورت کو سامنے سے آتا پاتے، پیٹھ پھیر لیتے۔ کہتے ہیں کہ کبھی کبھار لنگوٹ اتار کر کوٹ اور تپڑن پہن لیتے کہ کسی قدر دان نہ آئیں و یا تھا اور مال روڈ پر ایک قہوہ خانے میں جا بیٹھتے۔ استاد مرحوم کہتے تھے کہ پانی کا گلاس میز پر رکھا رہتا تھا، اور یہ ہیں کہ سر کو کہنیوں پر ڈالے گویا مراتبے میں بیٹھے ہیں۔ کسی نے قہوہ پلا دیا تو انہوں نے پی لیا ورنہ اسی حالت میں بیٹھے رہے۔ حضرت زیاں کا کہنا ہے کہ میں نے خندک کو ایک بار موٹر میں بھی بیٹھے دیکھا ہے۔ مگر یہ بات قرین قیاس نہیں معلوم ہوتی۔ ممکن ہے وہ دوسرے خندک ہوں۔ حاجی اللہ بخش خندک جن کی شہرہ خیمہ دوزی کے بارے میں مشہور ہے اور جو شہر کے عالی قدر روڈ سا کے زمرے میں شمار ہوتے تھے۔

ان کے کلام کے بارے میں یہ ہے کہ ان کے مصرعے عموماً ایک بحر میں نہیں ہوتے۔ انہوں نے گویا شاعری میں ایک نئی روش پیدا کی اور نظم کا رشتہ شاعر سے جوڑا۔ یہ اشعار میں لگی پٹی اشعار نہیں رکھتے۔ سادگی اور شستگی ان کے کلام کے جوہر ہیں۔ گو کہ اس کا بیشتر حصہ مبتذل اور اخلاق سے گرا ہوا ہے۔ اصل محاورے اور روڑے کو خواہ پنجابی کا ہو خواہ اردو یا سندھی کا ہاتھ سے نہیں دیتے، اور جوں کا توں شعر میں جڑ دیتے ہیں، جیسے انگوٹھی میں گیند۔ ان کا ذوق کمال یہ ہے کہ چار پانچ زبانوں کا مرکب تیار کر کے ایک ایسی خوش ذائقہ جاشا اختراع کی ہے کہ آدمی ہرٹ چاٹا رہ جاتا ہے۔

آپ نے کسی کی شاگردی نہیں کی۔ ملازمت کے طوق سے بھی دور ہی رہے۔ ہر چند کہ تنگدستی کی شکایت احباب سے اکثر کرتے تھے۔ لیکن مجال ہے جو وضعدار می اور خانہ دانی شرافت پر محنت آنے دیا ہو۔ استاد مرحوم کہتے تھے کہ ان کے سخن کے ایک جوہر شناس راجہ جلا درائے تھے۔ انہوں نے ایک دفعہ ایک ہرکارے کے ہاتھ انہیں دو سیر لٹ وادہ دس روپے تاج و راہ بھیج کر بنگالہ بلوایا۔ انہوں نے لٹ وادہ دس روپے رکھ لیے اور لوہا کیا یہ شعر لکھ بھیجے۔

بہنیں مجھ سے چھوٹ سکتا لاہو  
یہ بن ہے ترو تازہ! میں اس کامو  
ذکر مجھ کو مجبور حبلا درائے  
کہ بنگال مجھ سے پہنچا نہ جاتے

جلا درائے بھی جلا ماننے والے نہ تھے۔ وہ مصر ہوتے اور مزید دو سیر لٹ وادہ پندرہ روپے جو کہ لاہور سے بنگالہ کا تقریباً کلاس کا کوہ یہ تھا ہرکارے کے ہاتھ بھجوا یا اور ساتھ لکھا کہ آپ نہ آتے تو میں خود پہنچتا ہوں۔ یہ نہ گئے۔ استاد مرحوم کہتے تھے کہ اصل میں لاہور نہ چھوٹ سکے کا فقط بہانہ تھا۔ دراصل انہیں لکھا تھا کہ جلا درائے نام کیا پتا جی میں آئے تو بلوا کر گئے پر چھری چھری۔ جلا درائے کی خود آنے کی دھمکی سے اتنے ڈرتے تھے کہ دو ماہ نیم کے اوپر چمچ لٹھکے سوتے تھے اور کالو کو نیچے پرے پر کھڑا رکھتے تھے۔ افسوس اب نہ وہ جلا درائے سے قدر دان سخن ہیں اور نہ وہ محبت اور اخلاص۔ چشم بصیرت سے دیکھو تو اس زمانہ میں بھی جہنستان ادب مرغانِ نواسخ اور طوطیاں خوش الحان سے خالی نہیں مگر کوئی ان کا پرسانِ حال نہیں ہوتا۔ اچھے اچھے باکالوں کو گر جن میں سے بعض نقادانِ عالی مقام اور بعض فاضلانِ شیریں مقال ہیں۔ اس

سات میں دیکھتے ہیں کہ جب میں ہاں بے پیرتے ہیں مگر کوئی اللہ کا بندہ سگریٹ پیش نہیں کرتا۔ اس ناقد رچی سخن پر جس قدر بھی ماتم کیا جائے کم ہے۔

مولوی جنون اس جلاوڑاٹے کے قصے کے بارے میں کہا کرتے کہ چند سحر و نے ان کا مذاق اڑانے کر یہ سوانگ بھرا تھا اور ان کی دم میں ندا بانہا تھا۔ ورنہ جلاوڑاٹے انہیں کب بنگلہ بولنے واسے تھے۔

آخری عمر میں فذک دونوں ٹانگوں سے معذور ہو گئے تھے۔ کہتے ہیں سوتے میں نیم سے نیچے اگے اور گھٹنوں کے جوڑ مل گئے۔ یہ بھی سنا ہے کہ و ماخ بھی چل گیا تھا۔ کچھ عجیب نہیں۔ وہی ماشاء اللہ خان ہینگ محمد خاں داروغہ سے روایت کرتے ہیں کہ اس نے کہا کہ میں پر واٹہ سرکار کے ساتھ دو سپاہیوں کو ہمراہ لے کر انہیں پاگل خانے جانے کے لیے گیا تو کالو نے انہیں خبر دی۔ ان کے دل میں خدا جانے کیا آئی، فوراً درخت پر چڑھ گئے۔ بڑی مشکل سے نیچے اترے۔ کہنے لگے "میاں محمد خاں! بدخوردار۔ تم ہو۔ مجھ کو بوجہ ضیعفی دکھائی کم پڑتا ہے۔ ہاں بھئی سمجھا کیوں آتے۔ مگر جلدی کیا ہے۔ ابھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔ پھر ٹھنڈی آہ بھر کر کالو سے مخاطب ہوتے۔ "کالو بینگ پلاوے۔ ہاں سرکار کے گھر تو یہ کہاں نصیب ہو گی۔ کالو نے بینگ گھوٹ کر انہیں پالیہ پیش کیا تو انہوں نے برہم ہو کر کہا کہ سخت چلے مٹانوں کو پلاؤ۔ بڑے اصرار سے انہیں بینگ پلائی اس میں کلام نہیں کہ طبعیت بڑی متواسخ پائی تھی اور مٹانوں پر جان چھڑکتے تھے۔

اس صاحب کمال نے انہیں سوچا لیس عیسوی میں اس جہان فانی سے رحلت فرمائی۔

پاگل خانے کے پاس ہی ایک قبرستان میں جسے قصابوں کا قبرستان کہتے ہیں دفن ہوئے۔ میاں ڈگڈگی نے 'فذک نیم چڑھا' سے تاریخ و فوات نکالی۔ میں بھی ایک بار حضرت ننگوڑی کے ہمراہ ان کی قبر پر دعائے مغفرت کے لیے حاضر ہوا تھا۔ ٹوٹی ہوئی ٹھکڑے

ہے کہ اسے دیکھ کر اس پنج روزہ قیدِ حیات کی حقیقت آشکارا ہو جاتی ہے۔ وعائے مغفرت  
سے فارغ ہوتے تو کسی نے بتایا کہ یہ قادیانہ کی قبر ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

# فورٹھ ڈائمنشن

سٹرکچرل ٹائمنس کے نظریہ اضافیت نے جس کی رُو سے لمبائی چوڑائی اور گہرائی کے علاوہ ایک چوتھی بُعد وقت کی بھی ہے۔ جدید علم ریاضیات کے سارے تشکل ہی کو بدل دیا ہے۔ سٹرکچرل ٹائمنس اور معدومے چند دوسرے ریاضی دانوں کے سوا بہت کم لوگ اس نظریہ کی مامیت کو سمجھ سکے گا دعویٰ رکھتے ہیں، اور اگر آئن ٹائمنس ایک سنجیدہ اور مسلہ شہرت کا مالک نہ ہوتا، تو ممکن ہے اس نظریہ کو اس کا ایک خلاق تصور کیا جاتا ایک جدت اور لوگوں کی نظروں میں آنے کے لیے ایک چوکھادینے والا ڈھونڈ سکتا۔ میں نے اس نظریہ کو سمجھنے کی کبھی کوشش نہیں کی، لیکن وقت کے چوتھی بُعد ہونے کا خیال مجھے بے حد پرکشش اور عجیب لگا ہے۔ اس نظریہ میں فلسفہ اور ریاضی کا امتزاج نظر آتا ہے جو ظاہر ناممکن ہے۔ کیونکہ فلسفہ اور ریاضی دو متضاد علوم ہیں۔ صرف آئن ٹائمنس ہی جو ایک ماہر ریاضیات ہونے کے ساتھ ایک گہرا فلسفی بھی ہے، ایسے خوبصورت اور جبران کن نظریہ کے متعلق سوچ سکتا اور اسے ہندسوں اور مساویوں سے ثابت کر سکتا تھا۔ مجھے یہ علوم نہیں کہ آیا دیوتاؤں اور ملکوتی وجودوں کو اپنے آسمانی مقاموں میں بھی اعداد و شمار رکھنے کے لیے ریاضی کی ضرورت پڑتی ہے۔ اگر ان کو کبھی ریاضی سے کام لینا پڑتا ہے تو آئن ٹائمنس کی ایجاد کہ وہ ریاضی ہوگی جس میں وقت ضرور ایک چوتھی بُعد ہوگا۔ اس شاعر ریاضی دان

ڈا۔ ڈائمنشن کا اردو ترجمہ ہند ہے۔

نے فلسفہ اور ریاضی کو کیا کر کے ثابت کر دیا ہے کہ وہ حقیقی معنوں میں ایک جینس ہے۔ ایک مشہور جدید انگریزی ڈرامہ نگار نے اپنے کئی ڈراموں میں اس نظریہ کو بطور ایک فلسفہ اور ایک مرکزی خیال کے استعمال کیا ہے اور نتائج پرکشش اور عجیب غریب تھے۔ آدمی اب وقت کو ایک نظریہ سے دیکھنے لگ گئے ہیں۔ مختصراً اس انگریزی ڈرامہ نگار نے اس کا نام پریشلے ہے، آئن سٹائن کے نظریہ کی فلسفیانہ اصطلاح میں جو تشریح پیش کی ہے وہ یہ ہے کہ آدمی کبھی نہیں بدلتا۔ صرف تو تھی بعد وقت بدلتی ہے اور اس بعد واقع کے بدلنے سے آدمی بظاہر مختلف نظر آتا ہے۔ اس وقت سے جب کہ وہ پہلے پہل اس دنیا میں آنکھیں کھولتا ہے اس وقت سے جب کہ وہ اپنی ماں کے پیٹ میں محض ایک جینس کی شکل میں ہوتا ہے اس وقت سے جب وہ اپنے باپ کے چٹوں میں ایک تند سپریم <sup>SPERM</sup> ہوتا ہے اور اس سے بھی پہلے اپنے لاتعلو دھوڑوں کے خون میں وہ وہی ایک ہی آدمی ہوتا ہے جو وہ اب ہے، جو وہ دس ہزار سال بعد ہو گا۔ میرا خیال ہے ہم سب نے کبھی نہ کبھی یہ منہ دو محسوس کیا ہو گا کہ ہم اپنی پہلی زندگی ہیں، ہم جاوہانی اور ملام ہیں اور یہ کہ ہم ازل کی تاریک کھوؤں تک زندہ رہیں گے۔ مذہب کے سب بڑے بائیوں نے اسے منہ دو محسوس کیا ہو گا، ورنہ ہر مذہب میں روحوں کی ذلی تخلیق، انسان کی زندگی کی ابدیت اور کسی نہ کسی طریق پر موت کے بعد وجود میں ہونے کا تصور نہ پیش کیا جاتا۔ مذہب مذاہب کو چھوڑ کر افریقہ کے جیش کا، ہندوؤں کا، اس کے سامنے اگرچہ ایک مختلف طریق پر حیات بد موت اور ستر و جزا کا یہی تخیل دکھاتا ہے اور یہ امر کہ آدمی کی ابدیت ہر مذہب کا بنیادی اعتقاد ہے بخش اتفاق نہیں ہو سکتا۔

اس احساس کو کئے ہوئے لفظ کی تید میں نہیں لایا جاسکتا، اسے صرف کسی الہامی لمحے میں اچانک محسوس کیا جاسکتا ہے۔ اسی احساس نے ہندوؤں کے متواتر نسخ کو جنم دیا

اور یہی ایک مسلمان کے سزا و جزا کے عقیدہ کا موجب ہے۔ اس وقت کی ابدیت کے عظیم پس منظر کے سامنے جانچنے پر قوی کی پیدائش اور موت کی ازلی زندگی میں دو بالکل غیر معمولی امور محولی واقعے نظر آتے ہیں اور صرف اس کے دنیاوی سفر میں آغاز اور اختتام کے دو سنگ میل قرار پاتے ہیں۔

بعض دفعہ ایسے بڑے خا ہوا دواں دواں وقت پیچھے بھی دوڑ سکتا ہے اور پھر ظاہر عجیب اور ناقابل فہم باتیں علم میں آتی ہیں ایسا ہی چونکا دینے والا اور ناقابل فہم تجربہ خندہ روز ہوتے ان سطور کے کلمے والے کے ساتھ پیش آیا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ اس وقت مینا بابت الطبیعیاتی مسئلہ کو زیر بحث لاکر پڑھنے والے کو اس احساس کے سمجھانے کی غائب ہے ناگدہ کوشش کا متکرب نہ ہوتا۔

میری اول ترین یادوں میں سے ایک جو ایک عرصے کی دلچسپی ہوتی خواب کی طرح دھندلوں میں لپٹی ہوتی ہے۔ چار پائی پر سفید چادر میں غوث ایک ساکن میٹھی ہوتی شکل کی ہے۔ چادر برف کی طرح چمکیلی سفید ہے۔ چار پائی جس پر وہ ساکن شکل لیٹی ہے ایک وسیع چوڑے کے وسط میں ہے اور اس کے پیچھے ایک وسیع مکان کے برآمدے کے قرانی دروازوں کا پس منظر ہے۔ چار پائی کے ارد گرد بہت سے آدمی جمع ہیں۔ ان میں سے متنازع اور باقی سب لوگوں کے لیے میل مرکزی بنا ہوا ایک لمبا سفید بزرگانہ دائرہ می والا شخص ہے۔ بہت سے آدمی اس کے پاس آتے ہیں اور چہرہ اور ہر کچھ جاتے ہیں۔ وہ اسی طرح جامد ایک گڑھی ہوتی لاش کی طرح کھڑا رہتا ہے۔

وقت غالباً پچیس پہر کا ہے اور دھوپ کی روشنی زرد دُڑی ہے۔ میں اپنی اتالیکیاں کی اٹلی پگڑے ایک سنہری دھوپ میں نہاتے ہوئے جیسے شہر میں پُراسرار وسیع گلی کوچوں میں چل رہا ہوں اگرچہ میں اکیس سال جی چکا ہوں اور کئی ملکوں اور کئی ہزاروں میں سے

میں نے اس شہر کی تلاش کی ہے وہیں نے اس شہر کو نہیں پایا۔ وہ شہر شاید زمین پر ہے  
 نہ آسمان پر۔۔۔۔۔ ماسوا ایک بچے کے مانع میں۔ ہاں قدیم فرعونوں کے خلیجیں  
 (HTEBES) کی تصویروں میں مجھے اس شہر کی ایک جھلک دکھائی دی ہے، مانی الجھان  
 قدرے تیز تر چل رہی ہے۔ میری چھوٹی ٹانگیں اس کے ساتھ برابر قدم نہیں رکھ  
 سکتیں اور میں تقریباً گھسٹ رہا ہوں۔ اچانک ہم ایک بوڑھے لکڑچی کے پھاگ کے پاس  
 آکر رکتے ہیں جو کہتا ہے۔ اس میں سے وہ منظر ناگہانی ہمارے نظروں کے سامنے آتا  
 ہے۔ برف سی سفید چادر میں لپٹی ہوئی شکل اور خاموش لوگوں کا منظر جسے میں نے پہلے  
 بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔

میں مانی کچان سے پوچھتا ہوں "ہاں یہ کیا ہو رہا ہے" وہ کہتی ہے "بیمیاؤہ عورت جن کے گھر ہم جاتے رہتے تھے اور جو ہمیں تیس کھاڑک کا شربت پینے کے لیے دیا کرتی تھی، مر گئی ہے اور یہ اس کا جنازہ جا رہا ہے۔"

مجھے مرنے کے متعلق کوئی واضح پتا نہیں کہ وہ کیا ہوتا ہے۔ پھر بھی میں محسوس کرتا ہوں کہ اس میں ڈرافٹنی کچھ ہوتا ہے۔ مجھے اس گھانڈ کا شریک ملانے والی موٹی، مہربان عورت کا اس طرح اگر چا دیا وڑھ کر ساکن لیٹ جانا بے حد عجیب معلوم ہوتا ہے۔

میں مانی کجائی سے اس کے متعلق اور بہت سی باتیں پوچھتا ہوں، لیکن وہ بڑوں کی سی بے اعتنائی کے ساتھ مجھے کوئی جواب نہیں دیتی۔ میں حیران اور عجیب طور سے ڈرا ہوا اس منظر کو دیکھتا ہوں۔

جیسے مجھے یاد ہے۔ اماں کب جان بھاد سی واپس تھی۔ ہم اس کو اس تعجب اور تفریب سے دیکھا کرتے تھے جس طرح بچے اپنے سے بڑوں کو دیکھتے ہیں۔ مجھے اس کے



میرا ایک پہل چہین نہ آتا تھا۔ اسے شاہزادوں اور دیوتاؤں کے عجیب و غریب قصوں کے  
 بیچ میں سوجھانے اور خراٹے لینے کی جھلا دینے والی عادت تھی اور مجھے اور میری بہن کو  
 اسے جگانے کے لیے اس کے زور زور سے چٹکیاں لینے پڑتیں کیونکہ وہ ایک گہری نیند  
 سوتی تھی۔ وہ جاگتی اور ہم پر چھتے "اماں کجاں گئے کیا ہوا۔۔۔۔۔"

"میں کہاں پر تھی؟ وہ پوچھتی۔"

"تو کہہ رہی تھی ناشا ہزا دے نے پر ہی سے پوچھا کہ تو ہنسی کیوں اور دوتی کیوں؟ ہم  
 بے سببی سے اسے یاد کراتے۔"

وہ کچر منٹ اور ادھگتے جیسے قصہ سنانے والی اور ایک مناسبت و لہجہ اور اضطراب کن  
 قصے کے درمیان خراٹے لینے لگتی۔

میری اماں کجاں ایک عام واقفیت کی عورت تھی۔ تقریباً شہر میں ہر کوئی اس کو  
 جانتا تھا اور راستے میں کئی آدمی اس کو ٹھہرا کر اس کی خیریت پوچھتے اور حال لیتے اور  
 دیتے۔ اماں کجاں اپنے چالیس کے سی کے باوجود اور اپنی فریبگر لہجہ سی صورت کے  
 باوجود اس وقت بھی رو مینٹیک عورت تھی اور میرا خیال ہے کافی چاہنے والوں کے نام گنا  
 سکتی تھی۔ اس کے پہلے خاوند مرگ چکے تھے یا وہ ان کو فراموش کر چکی تھی جب میں میری  
 میں پڑھتا تھا تو اس نے ہمارے پچاس سالہ سائیں بابا الٹی بخش جسے ہم بابا لالیا کہا کرتے  
 اور جو اپنی مندی سے درگی ہوتی ڈاڑھی کے ساتھ ایک مناسبت پڑو قار ٹھنٹھ لگتا تھا نکاح  
 پڑھوایا جو اس کی پہلی شادیوں کی طرح عارضی نوعیت کا ثابت ہوا۔

وہ ایک اچھی اور جہان دیدہ عورت تھی، اور غالباً بیشتر گھرانوں میں اس کی جواہر نگشت  
 ہوتی تھی۔ وہ اس کے تحصیل دار صاحب کی نوکرانی ہونے کی حیثیت سے ہوتی تھی۔ اس  
 کے علاوہ وہ ادھر ادھر کے 'عال احوال' دیشے کے فن میں اپنے طبقے کی ساری عورتوں

کی طرح طاق تھی۔ اس زیادہ باتیں کہیں اور شہروں کے اسکینڈل کے بارے میں ہر تھی جوں کی،  
 جن کو مستی اور جن پر بحث کرنا ہمارے گھروں کی چار دیواری میں مجھوس زمانہ مکینوں کا جیتا شہر  
 ہے۔ مجھے اس کے ساتھ بے حد محبت تھی۔ اور میں اس سے پہلے بھر کے لیے جدا نہ ہوا تھا۔ اگر وہ  
 کہیں مجھے چھوڑ کر چلی باقی تو میں زور زور سے رو کر اس کی وہ باتی دیتا۔ اور خدا اور غصہ  
 سے آنگن کے فرش پر لوٹنے لگتا اور اس وقت تک بغیر تسلی پذیر ہوتا جب تک کہ اس  
 بکھان مجھے اٹھا کر سینے سے نہ چمٹا لیتی۔ وہ ضدی اور غصیلی تھی اور مجھے یہ اکثر بتایا گیا ہے  
 کہ میں نے اپنی خدا اور غصہ ماں بکھان سے لیا ہے۔ اگر یہ سچ ہے تو میں اماں بکھان کا  
 شکر گزار ہوں کیونکہ میری ضد نے مجھے کئی محنتوں سے بچایا ہے اور مجھے اپنی مرضی  
 اور خوشی کے مطابق زندگی گزارنے کے لیے اسکا لیا ہے۔ اماں بکھان نے مجھے اپنی آواز  
 اور اپنا لہجہ ضرور بخشے ہیں۔ میرا وہ باتی سار نیلگتا ہوا لہجہ بڑی دیر تک میرے گھر والوں  
 کے مذاق اور تندرے ایسی کامیاب رہا۔ وہ میرے اس لہجہ کی ذمہ داری میری بیاری  
 اماں بکھان کے سر تھو پتے تھے اور میں اس اچھی عورت کا شکر گزار ہوں وہ وہ مر چکی ہے،  
 کہ اس کی وجہ سے مجھ پر اپنی کسی کوتاہی کا الزام نہیں دھرا جاتا۔ اصلی قصور وارانہ بکھان  
 ٹھیراتی جاتی ہے۔ جن دنوں میں اور اماں بکھان کیوں میں گشت کیا کرتے تھے اور موٹی مہران  
 عورتوں کے گھروں میں میں بلائے ممان بنا کرتے تھے ان دنوں کی میری ایک تصویر  
 اب تک میری بڑی چھوٹی کے تختہ آتش داں پر محفوظ ہے اور اس وقت میرے حلیے اور  
 لباس پر روشنی ڈالتی ہے۔ — ایک سیب سے گالوں والا گول مثل لڑکا جس  
 کے سر پر کئی ستاروں سے کاڑھی ہوئی گول ٹوپی ہے اور جس نے اوپر اٹھی ہوئی ٹوڑوں  
 واسے بالان بوت پہنے ہوئے ہیں ایک سٹش طرفی کھدی ہوئی میز پر ٹانگیں لکھائے  
 بیٹھا ہے، اور ایک معصوم تناسل سے سامنے دیکھ رہا ہے۔ پیچھے نوکر گراف کا پرہ ہے۔

جس پر جہازوں والے ستون اور کچھ گئے سے رنگے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔ مجھے بھی یاد پڑتا ہے سلی ستاروں والی ٹوپی مجھے بے حد پسند تھی اور میں دوسری جماعت میں آتے تک اس کو پہنتا رہا۔ اونچی اٹھی ہوئی ٹوٹوں والے بوٹوں سے مجھے سخت نفرت تھی اور میں ان کو پسند نہ کرنا تھا مگر ان دنوں ان کا رواج عام تھا۔ وہ شش طرفی نقش میزائے پائڈلن سمیت ظاہر دانی ہے اور چھوٹا رنگوب والے لمپ کی طرح اب تک (یعنی ستائیس) اٹھائیس سال گزرنے کے بعد تک بھی اجمادے گھر میں ہے۔

میں تحصیل دار صاحب کا کاکا کا تھا۔ اس لیے میری والدہ جہاں تک ممکن ہوتا مجھے مٹا کپڑوں میں رکھتی اور مجھے بتایا گیا ہے کہ اکثر جب میں ماں کھان کے ساتھ گشت پر نکلتا تھا تو میرا لباس وہی ہوتا تھا جو میں نوٹو گرام میں پہنے بیٹھا ہوں۔ یعنی سلی ستارے والی ٹوپی، ایک زریں سی واسکٹ، شلوار اور اٹھی ہوئی ٹرواے (کتے بد نما) بوٹ جیب میں نے بڑے پچاٹک کے نیچے سے زرد ملی سا حرائذ سی دھوپ میں چوتروے پر اس سفید ساکت سمیت پر نظر ڈالی ہوگی تو میرا یہی لباس ہوگا۔ اگرچہ مجھے خود یاد نہیں کہ میں نے کیا کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ .... گلاب میں جانتا ہوں کہ میرا وہی لباس تھا۔

اس واقعے کے بعد جب میری عمر زیادہ سے زیادہ ساڑھے تین سال ہوئی میں نو سال ادا ڈاکٹر میں رہا۔ میرے بچپن اور ٹرکپن کا سنہری زمانہ اسی گھلے پے فریب شہر میں گزرا۔ اس عرصے میں مجھے بھی وہ بے حد بڑے پچاٹک اور ناشائسی وسعت والے چوتروے والا مکان نظر نہ پڑا۔ گو کہ میں نے خاص طور سے اس کی کھن تلاش نہیں کی۔ کبھی وہ فعد میں قعب کو تاکہ وہ میری یاد دالی جگہ کو نہی تھی اور کہاں تھی۔ مجھے اب یقین ہے کہ اگر میں اس کے پاس سے گزرا ہوں گا تو میں خاصے پہچاننا ہوگا۔ بچپن میں چیزیں اصلیت سے کہیں زیادہ ٹپا سرار اور وسیع لگتی ہیں۔ اور مجدد ہیرت ناک!

پھر میرے باپ کی بہاولنگر سے بہاولپور تبدیلی ہو گئی۔ بہاولپور ریاست کا دارالافتادہ تھا، شاندار شہر تھا۔ وہاں نور محل تھا اور سینا۔ وہاں بجلی بھی تھی۔ میں تمام لڑکوں کی طرح ایک نئے اور بڑے شہر میں جانے پر جمید خوش تھا۔ میں ایک نئے اسکول میں داخل ہونگا، نئے دوست بناؤں گا، نئی اور عجیب و غریب جگہیں دریافت کروں گا۔ زندگی زیادہ دلچسپ ہوگی۔۔۔۔۔

مگر بہاولپور میرے لیے ایک خوش شہر ثابت ہوا۔ یہاں ہم ایک تنگ کوچہ میں ایک شاندار پختہ مکان میں آکر ٹھہرے تھے مگر میں تنہا اور بڑے کے ساتھ بہاولنگر میں اپنے چچا اینٹوں کے گھر کے خواب دیکھا کرتا۔ وہ مروانہ کی چھوٹی دیوار۔ وہ دروازے کے باہر ایک لوبے کے باڑے سے لگتی ہوئی میونسپلٹی کی لائٹیں۔ وہ چھوٹی دیوار کے پرے رستہ میں جہاں میرے دوست مصنوعی جنگیں لڑا کرتے تھے۔ وہ مکان کے عقب میں بڑے بڑے جوتے کے چمکے سیاہ اور پیرا سرا دیوانے، جہاں آدمی جا کر انجمنوں اور گارڈیوں کو دیکھ سکتا تھا۔

بہاولپور میں انہیں اپنی جماعت میں چمکا مگر کئی وجوہ سے میں اس اور کھویا کھویا سا رہنے لگا۔ یہاں ایسے دوست نہ تھے جن کے ساتھ مل کر آدمی مصنوعی جنگیں لڑ سکتا ہو، یا اینٹوں کے بنے ہوئے قلعوں پر چلے کر سکتا ہو یا رنگین کاغذ کے تاج پہن کر اوڑھ لگتی کی توڑ کمر میں دسی سے باندھ کر بادشاہ اور وزیر کے نام لکھ لکھ سکتا ہو، جو ایک شوخ اور صحت مند لڑکا تھا، اب زیادہ عرصہ گھر میں گھس کر رہنے لگا۔ میں ایک سوچنے والا اور رامب بن گیا۔ اپنا غم غلط کرنے کے لیے میں نے کتابوں میں خود فراموشی اور تفریح ڈھونڈی کتابیں رتہ رتہ انیم کی طرح میری آگاہ بن گئیں اور ایسے دوست جنہوں نے مجھے تمام تدریج انسانی تعلقات سے بے نیاز کر دیا۔ میں نے بی لے بہاولپور سے پاس کیا، اس وقت

اپنی تنہائی اور ول کی تادیب کی وجہ سے میں انسانوں سے ڈسنے لگ گیا تھا اور یقین کرتا تھا کہ میں دیوانگی کی سرحد پر کھڑا ہوں۔

پھر بھی ایک امید تھی۔ وہ امید بہاول نگر تھی۔ یہاں سے صرف سو میل دور دنیا کا خد بہودت ترین اور تبرک ترین شہر تھا جہاں میں کھویا ہوا فقیر سے پاسکتا تھا اور اپنے بچپن کے چلبیلے دن رات کی شاید پھر تیز کر سکتا تھا۔ اپنے باپ کی بہادری میں تبدیل کے دس سال بعد گاڑی مجھے پھر تیز ٹیلوں اور چیلہاتی دھوپ میں پتے ہوتے میدانوں میں سے بہاول پور کی طرف سے جا رہی تھی، میں ایک نئی زندگی شروع کرنے کے لیے گھر سے بھاگ رہا تھا مگر نئی زندگی میرے لیے کسی جگہ بھی بہاول نگر کے جج کے بیڑے میں تھی۔ میں وہی اور دور دسیوں کا عازم مگر میں نے فیصلہ کیا کہ راستے میں چند گھنٹوں کے لیے بہاول نگر میں حوروں اتروں گا اور اس کی گلیوں میں اپنی کھوئی ہوئی خوشی کی تلاش کروں گا۔

جب گاڑی کو کئی اور گز گزائی، کٹنے کے پچانے ہوتے انباروں، ٹنٹ کٹنے ہوتے انجنوں، دیوانی کے ٹکڑوں کے پاس سے سناتی ہوئی بہاول نگر چلکشی میں داخل ہوئی تو میرا دل دھڑک رہا تھا۔ میرے حلق میں ایک پچانس سی غمی۔ یہ میری زندگی کے تبرک ترین لمحوں میں سے ایک تھا۔

نیچے گلیوں والے پیٹ فارم پر اترنے پر مجھے ایک پانا دو دست مل گیا جسے پہنانے میں مجھے کچھ دقت ہوئی۔ وہ اب کافی مڑتا اور جسم ہو گیا تھا۔ اور دو ٹھوڑیاں حاصل کر چکا تھا۔ پرنکول کے دونوں میں وہ ہماری مصنوعات جگلوں میں دشمن فرج کا نائب سردار ہوا کرتا اور میں نے ایک دفعہ اس کو چپت کر کے اور اس کے بیٹے پر چڑھ کر مگر ٹی کی تھوار سے اس کا ناک کاٹنے کی کوشش کی تھی۔ وہ جنگ ہم نے جیتی تھی اب وہ حکمران میں گر دا اور خانو گریا اس قسم کی کوئی اور چیز تھا۔ وہ میری مرصفا نہ حالت پر اظہارِ شوقس کرتا رہا

اور پھر اس نے احمد کو کیا کہ میں اس کے پاس چل کر تعمیر دوں اور لوگوں سے اس خلی خوت کے باوجود جو س سال کی دہائیہ زندگی کا نتیجہ تھا، میں نے اس کی دعوت کو منظور کر لیا۔ گاڑی بہاؤ فلگر میں شام کے سات بجے پہنچی تھی اور سامنے شہر پر اندھیرا چھا رہا تھا۔ میں نے پل پر ہی سے دیکھ لیا کہ ہمارے گھر کے گرد و بہت سے اور مکان بن گئے ہیں اور شہر کی بہت بہت کچھ تبدیل ہو گئی ہے۔ وہ دیتلا میدان جہاں ہم کھیلا کرتے تھے۔ اب کچے مکانوں میں تبدیل ہو چکا تھا۔ ہم شہر کے بازاروں میں سے گزرے اور میں نے کئی پرانے چہرے، ایک لڑکے کے ساتھ پچانے۔ بازار بالکل ویسے ہی تھے صرف رنگیں بنی ہو گئی تھیں۔

رات کو میں اپنے دوست کے ہاں رہا۔ دوسرے دن گاڑی نے مجھے بارہ بجے ملن تھا اور میں علی الصبح ہی اپنے دوست سے کسی ملاقات کرنے کا ذکر کر کے اکیلا اپنے بچپن کے بہاؤ فلگر کو کھڑے ہونے کے لیے چل کھڑا ہوا۔ میں پہلے اپنے پرانے گھر کی طرف گیا اور آخر سے ڈھونڈ نکالا۔ مگر یہ ایک مختلف گھر تھا۔ اس میں اتنی تریمیں اور اضافے ہوتے تھے کہ اسے پہچانا نہیں جاتا تھا۔ چھٹی کئی دیوار کا نشان نہ تھا اور نہ ہی دروازے پر میونسپلٹی کی لائین تھی۔ مراد اور زمانہ اب دو الگ الگ گھر بنا دیے گئے تھے۔ یہاں سے میں ہسپتال اور ایف ایس کے والی سڑک پر پہنچا ہوا ڈیڑھ گھنٹہ پر گیا جہاں ہم سادوں کے دنوں میں بیڑ ہوٹیاں پکڑنے اور سادوں بنانے جایا کرتے تھے۔ وہاں سے شہر کا باہر سے چکر لگا کر میں مغربی طرف پر پرانے تعمیر شدہ پتلا جس کی چھت تب جس دھڑی اور اب بھی دھڑی اور جہاں ٹیک پڑی شیر کی گرج عرف چنگیز خان، اور سڑک لنگ جیسے شاندار کھیل ہوا کرتے تھے اب یہاں پاکباز محبت لگا ہوا تھا۔ اس تعمیر کے بعد میں نے اپنے آپ کو ایک چوڑی سڑک پر پایا جو مجھے اب یاد نہ تھی۔ یہ میدی بازار میں کہیں جا سکتی ہے۔

میں ایک بڑے کھلے چٹانک کے پاس سے گزرا۔ اندر ایک چبوترے پر ایک چارپائی پر سفید چادر میں لپی ہوئی ایک شکل ساکت چڑی تھی اور بہت سے لوگ جمع تھے۔ یاد کا ایک مبہم تار میرے دل میں گونسا، ماضی کی پٹائیوں سے گونجیں آئیں۔ میں نے اس منظر کو پہلے کیوں دیکھا تھا۔ میرے پاؤں چٹانک کے باہر گم ہو کر رہ گئے۔

اندروں چبوترے پر کئی لوگ جمع تھے۔ بعض رو رہے تھے۔ میت کے پاس ایک لبا مہر سفید ریش شخص کھڑا تھا۔ لوگ اس کے پاس آکر اخبار انوس کر رہے تھے۔ ہر ایک چیز مجھے آشنا سی لگی اور میں سوچ رہا تھا کہ دیکھنے لگا۔

اسی وقت میں نے اپنے سامنے — آنا نزدیک کر میں اس کو بازو سے پکڑ کر اٹھا سکتا تھا۔ ایک سیب سے گالوں والا لڑکا دیکھا۔ وہ ایک سلی شادوں سے نکال رہی ہوئی قدر سے مدھی گول ٹوپی پہنے تھا۔ اس کے پاؤں میں براؤن اور نیچے ٹو والے بوٹ تھے۔ وہ ایک موٹے قرعہ چہرے والی عورت کی انگلی پکڑے، حیرت سے بڑی بڑی آنکھوں کے ساتھ سامنے چبوترے پر رکھی میت کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ قرعہ چہرے والی عورت کی قمیص پکڑ کر اس کے ساتھ دیک گیا اور اس کی طرف نظریں اٹھا کر ایک عجیب سی چٹائی میں بوللا۔

”اماں! میری کہہ گیا ہے“

بوڑھی عورت اپنے ہونٹوں میں سے بڑبڑاتی ”کا کا! آغا صاحب کی نگیم جہاں نون کھنڈ کھلا ندی ہونڈی سی نا اوہ فوت ہو گئی ہے“ اور پھر وہ نیچے جھکی۔ چھوٹے خوبصورت بچے کی ناک صاف کرنے کے لیے جو اس کے منہ تک پہنچا تھا۔

اس کے بعد وہ قرعہ عورت چھوٹے بچے کو ساتھ چلی گئی ہوئی چٹانک پر آئی۔ میری زندگی کا سب سے عجیب ترین واقعہ ہے اگرچہ بہت اس کا بہت ہی نہیں کریں گے۔

## مچھلیاں اور عبدالباقی

دراصل جھپٹے۔ مجھے جو وقت رہی ہے وہ یہ کہ مجھے ایسے حصہ دار نہیں ملتے رہے ہیں میں سرمایہ لگانے کا حوصلہ ہر — درنہ بزنس میگزینٹ بنا کوئی مشکل چیز ہے۔ ایک سگریٹ تو چلاؤ۔

چچا عبدالباقی اور میں ایک سنہری شام وکٹوریہ روڈ پر چہل قدمی کر رہے تھے چچا اپنے حصہ داروں کی حساست پر اپنے خیالات کا اظہار کر رہا تھا۔ ہم کو اپنے پچھلے مشرک کاروبار میں — جس کا تعلق غالباً پرانے ٹکٹوں کی فروخت سے تھا اور جس میں چچا عبدالباقی اس کا دس سالہ بیٹا عبدالرحمن اور میں برابر کے حصہ دار تھے، بڑا فقدان برداشت کرنا پڑا تھا۔ اس کے بعد سے ہمارے تعلقات قدرے کشیدہ ہو گئے تھے۔ چچا عبدالباقی کا اپنے حصہ داروں کی حساست کا ذکر مجھے ایک نرم گوشے میں چھپونے کی خاطر تھا۔

اس نے مجھے اپنی مصائب کرنے کی صلت نہ دیتے ہوئے اپنی تقریر کو جاری رکھا۔ ”ورنہ“ اس نے سگریٹ پر اپنے پرائیمنٹ کنکشن سے ”ورنہ“ بھیختا رہیں بڑے کام کا آدمی ہوں۔ آج تک اپنے سے اچھا آرگن نذر دیکھنے کی حسرت رہی ہے۔ کیا میں نے تم سے اس بات کا ذکر کیا ہے کہ پچھلے ہفتے جب میں سیکرٹری تربیت حیوانات سے بلا تو ایک گھنٹے کی ہی گفتگو میں وہ میرا اس قدر گرویدہ ہو گیا کہ کہنے لگا عبدالباقی صاحب۔ میں متعجب ہوں۔ میری سمجھ سے بالا ہے کہ اس قدر خوبیاں ایک واحد شخص میں کیسے اکٹھی ہو گئیں۔ آپ سچ سچ بتائیے۔ بھلا اتنے عرصہ کہاں چھپے رہتے آپ



کو تو کسی ملک میں سفیر ہونا چاہیے تھا۔

ایک فرانبردار بھتیجے کی طرح میں نے سیکرٹری حکمران تربیت حیوانات کی چپاکی قابلیت کے متعلق رائے سے اتفاق کرتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا کہ چپا جیسے شخص کے لیے واحد موزوں جگہ ستر میں وزارت ہے۔

مست کی سلوش اس کے گول دودھ پتے بچے کے سے چہرے پر نمودار ہوئیں۔ اس نے میرا ہاتھ اپنے قرب ہاتھ میں سے کوٹھکڑا نہ اور رازداری کے اظہار کے طور پر دیا۔

”جسے بختیار۔ تم ان صدو سے چند آدمیوں میں سے جو جو بچے سمجھ پاتے ہیں۔ لیکن عبدالباقی کو منٹر کون بتاتا ہے۔ یہاں تو بھتیجے۔ قابل آدمی کو نزدیک نہیں ٹھکنے دیا جاتا.....“

ہم پیراڈائز سینا کے سامنے کوئی بیویں وقفہ کے ٹکٹ گھر کے سامنے کیڑا لگا شروع ہو چکا تھا۔ ہم کچھ دیر کھڑے داخلے کے اوپر گئے ہوئے فلم کے رنگین اشتہار کو لپٹائی ہوئی نظروں سے دیکھتے رہے۔ ہم دونوں اس انتظار میں تھے کہ ہم میں سے کون دوسرے کو فلم دکھانے کی دعوت دیتا ہے۔ میری حیب میں بے دے کے صوفی ساٹھے بارہ آنے کے لیے تھے..... اور چچا عبدالباقی اپنی حیب میں نقد ڈال کر گھر سے باہر آنے کے حق میں کبھی نہیں رہے۔

”بچھر کو نہی ہے۔“ مسکن اینڈ ڈیلاڈ چچا عبدالباقی نے ظاہر اتفاقہ مجھے میں کہا۔ اچھی معلوم ہوتی ہے۔ سنا ہے بیکل کمانی ہے۔“

”کیا خیال ہے چچا۔ اسے دکھانے جائے۔ میں نے پراپید نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ مسکن تھا کہ شاید وہ زندگی میں پہلی مرتبہ اپنا اصول قبول کیا ہو۔“

”جیسے تعدادی مرضی، جتنی ہے۔ چچا عہد الباقی نے کہا۔“ اگر تعدادی بچہ دیکھنے کی صلاح ہے، تو ابھی سے کیوں نہیں جا کر کھڑے ہو جاتا۔“

مجھے اقرار کرنا پڑا کہ میری جیب میں گل بارہ آنے ہیں۔

”اوہو۔ جتنی بشتیار تم نے مجھے گھر کیوں نہ بتایا کہ تمہارا بچہ دیکھنے کا ارادہ ہے۔ میں پیسے جیب میں رکھ لیتا۔ ویسے جتنی، میرا تھیں یہ مشورہ ہے، برا ماننے کی ضرورت نہیں کہ جب تک جیب میں پیسے نہ ہوں تھیں لوگوں کو سنا دیکھنے کی دعوت دینے سے احتراز کرنا چاہیے۔ یہ ایسی کیٹ نہیں ہے۔“

اس کے انداز میں تدریسے سخن کا اشارہ تھا۔ پھر اس نے کہا۔

”تم مجھ سے اگلے روز گروہی کی دوکان کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ یہاں پاس ہی کھانا دوکان میں ایک گروہی کی دوکان ہے۔ جہاں گھڑیاں اور فونٹین ہیں وغیرہ گروہی رکھے جاسکتے ہیں۔“

اس نے امید کی نظروں سے کوٹ کی اوپر والی جیب میں لگے ہوئے پارک فونٹین ہیں کو دیکھا جسے میں نے اپنے دوست محمد بنیر تنویر سے چند دنوں کے لیے مستعار لیا تھا۔

”اس وقت گھڑی میرے پاس نہیں ہے۔ پھر کسی وقت سہی۔“ میں نے جواب دیا۔

”فونٹین یہی بھی وہاں گروہی رکھے جاسکتے ہیں“ چچا عہد الباقی نے کہا۔

پروپرائیٹر میرا دوست ہے۔ چلو گروہی نہ رکھنا۔ میرے ساتھ آؤ۔ دوکان کے دیکھ لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔“

”چچا۔ تم مجھے دوکان وکانے پر اتنے مصر ہو جیسے تم خود اسے چلا رہے ہو۔“ اس بات سے اسے کچھ تکلیف پہنچی اور ہم ایک دوسرے سے روٹھے اور کچھ ہوئے پیراڈائز سے واپس ہو کر پٹری پر درمیان میں غاصلہ رکھ کر چلنے لگے۔

میں نے دیکھا کہ چچا عبدالباقی کے چہرے کا رنگ نفی ہو گیا — جاسوسی ناول نگاروں کے الفاظ میں نیش کی طرح زرد۔ اس نے اپنے ہاتھ ایک غوطا لگایا اور پاس کی دوکانوں میں سے ایک لمحہ کے اندر پھرتی سے غائب ہو گیا۔

میں کھڑا ہو کر چچا کی اس عجیب حرکت پر غصہ کر رہا تھا۔ ایک طرف دارالحکومتی سنے، ہونیکا، شکل کا انسان، جس کے چہرے سے جھنجھٹ، مٹھنوں کے حساب سے برس رہا تھا، میرے دوہرو اکر بھڑ گیا۔

”یہ آدمی جو ابھی آپ کے ساتھ آ رہا تھا، کہاں چلا گیا ہے؟“ اس نے اپنی چھٹری ہلاتے ہوئے کہا۔

”کوئی آدمی“ میں نے مصوئیت سے کہا۔

”وہ آدمی جو آپ کے ہمراہ تھا۔ اس کا نام عبدالباقی ہے؟“  
”عبدالباقی“ میں نے تعجب سے کہا۔

”عبدالباقی۔ اچھی اچھی آپ کے ساتھ آ رہا تھا، طرے والا آدمی اب اپنے کو کچھ بیوقوف محسوس کر رہا تھا۔“ ترکی ٹوپی پہنے ہوئے تھا۔ موٹا تازہ آدمی ہے۔ مصوم بچوں کا سا چہرہ ہے۔ چوکور شیشوں کی عینک پہنتا ہے۔ کراچی میں اس وقت غالباً سب سے مشہور چار سو بیس ہے۔“

”میں اسے نہیں جانتا“ میں نے کہا۔ ”ویسے شکریہ۔ میں اس سے بچ کر رہوں گا۔“  
”مجھے یقین ہے کہ وہ آپ کے ہمراہ تھا۔“

”ہو سکتا ہے۔ بہت ممکن ہے آپ اس سے۔“ عبدالباقی سے ملنے کے اس قدر مشتاق کیوں ہیں؟

”اس کو میرا چلہنوار دو پیرو دیا ہے۔ اس کے گھر جاؤ تو اندر سے کھلا ہوتا ہے کہ

وہ گھر پر نہیں ہے۔

”یہ تو آج کل کئی لوگ کرتے ہیں۔ میں خود اسی طرح کرتا ہوں۔“  
 طرے دار گڑھی والا شخص مجھے قاتلاؤنگا ہوں۔ سے گھورتا ہوا آگے چلا گیا۔ اس کے  
 جانے کے بعد میں نے ارد گرد چچا عبدالباقی کی تلاش میں نظریں دوڑائیں۔ وہ بالکل غائب  
 ہو چکا تھا۔ اور مجھے کہیں نظر نہ آتا تھا۔ پھر میں نے ایک آواز سنی۔  
 ”بیٹھے آل گیر ہو گیا ہے؟“

آواز کی سمت دیکھتے ہوئے میں نے چچا عبدالباقی کی چوکور عینکوں کو ہیرکننگ  
 سیلون کے سونگ دروازے کے اوپر دیکھتے ہوئے پایا۔  
 ”آل گیر ہے۔ آجاؤ۔“ میں نے کہا۔

”اچھی طرح اطمینان کر لو کہ وہ آدمی واقعی چلا گیا ہے۔“

میرے اطمینان دلانے پر وہ سونگ ڈور سے باہر نکلا۔ اس نے مجھ سے آٹھ آنے  
 ادھار لے لیے اور ہیرکننگ سیلون میں حجامت کرائے کے لیے لوٹ گیا۔ اس نے کہا کہ  
 حجام سترے لے اس کا انتظار کر رہا ہے اور اس وقت حجامت کرائے بغیر محل دنیا شرافت  
 سے بعید امر ہے۔ جس وقت ٹیڈ کرا کے باہر نکلا تو میں نے اس سے اس طرح بھاگنے  
 کی وجہ دریافت کی۔

”یہ طرے والا شخص کون تھا؟“ میں نے پوچھا۔ مجھ سے کہہ رہا تھا کہ تم سے چار ہزار  
 روپیہ لینا ہے۔“

میں اس شخص کا نام ایم اے خان ہے، چچا عبدالباقی نے مجھے اطلاع دی یہ نہایت  
 کم ظرف اور ذلیل انسان ہے۔ یہ موٹر سپیر (SPARE) پر زوں کے کاروبار میں  
 میرا برابر کا حصہ دار تھا۔ اس کی خواست کی وجہ سے فرم کو سات ہزار روپے کا خسارہ

ہوا۔ اس کا خیال ہے کہ میں چار ہزار روپے کا مال خود برد کر گیا ہوں۔ وہ اصل بھتیجے،  
تم میں ایک مکمل حصہ دار بننے کی صلاحیت ہے۔ تم اور میں اگر مل کر کوئی کام شروع کریں  
تو.....“

چچا عبدالباقی میرا مکمل حصہ دار بننے کے سلسلے میں درست ہی کردہ تھا۔ ہماری  
دوستی اتنی تباہ کن کاروباری شرتوں کے بعد بھی ناقصانہ طور پر زندہ رہ گئی تھی..... لیکن  
پچھلے تجربات کی بنا پر میں نے اس سوچ کو جو گفتگو اب سینے کی تھی پسند نہ کیا اور میں محتاط  
ہو گیا.....“

”مجھے ابھی ہر کسنگ سیلن میں ایک خیال سر جیا ہے؟ عبدالباقی نے اپنے بازو کو  
میرے بازو میں نسل کرتے ہوئے کہا ”مجھے ہمیشہ اپنی بہترین سیکمیں ٹیو کرتے ہوئے  
سوچتی ہیں۔ میں چاہتا ہوں تم بھی اس پر غور کرو۔“  
”میں اسے سنتا چاہتا ہوں“ میں کرا ہا۔

”جیسی وہی ڈنچی سیکر ٹری تربیت حیوانات جس سے میں نے پچھلے دنوں طاقت  
کی تھی اور جو میرا اس قدر مددگار ہے۔ میرے پچھے پڑا ہوا ہے کہ میں گورنمنٹ فشریز  
کی پھلیوں کی خرید کا ٹھیکے لے لوں۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ وہ مجھے یہ ٹھیکہ  
دلوانے میں پوری مدد دے گا۔ وہ اپنے لیے منافع میں دس فیصدی سے زیادہ کی  
بھی خواہش نہیں رکھتا۔ میں تم سے اس معاملے میں بہت پہلے گفتگو کرنا چاہتا تھا  
مگر تم مجھے ملے ہی اتنے دن بعد ہوئے“

”کیا وہ تمہیں سفارت دلوانے میں مدد نہیں دیگا؟“ میں نے پوچھا۔  
چچا عبدالباقی نے میرے اوجھے وار کو نظر انداز کرتے ہوئے گورنمنٹ فشریز کی  
پھلیوں کے ٹھیکے کے فوائد مجھ پر واضح کئے۔

”بھئی بختیار۔ یہ ایک ایسی بزنس ہے جس میں نقصان کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ تو گھر بیٹھے بٹھائے نوٹ بنانے والی بات ہے۔ گورنمنٹ فشر ڈیپارٹمنٹ کے ٹوالر پھلیوں کے کیچ بننے میں دو روز لاتے ہیں۔ ہمارا کام محض آٹا جو گا کر ڈاکس پر جا کر اس مال کو پھل کے شوک پو پادلوں کے ہاتھ بیلا کر دیں اور رقم جیب میں ڈال کر مزے سے گھر آجائیں۔ میں نے ابھی شیو کراتے ہوئے سارا حساب کر کے دیکھا ہے کہ ایک کیچ پر کم از کم پانچ ہزار روپیہ میں بچتا ہے۔ یعنی سب خرچہ وغیرہ نکالنے کے بعد“

”تو چچا۔ یہ ٹھیکہ تم بیٹے کیوں نہیں“ میں نے اپنے آپ کو اس حکیم سے عقیدہ کرتے ہوئے کہا۔

”اور مزے کی بات یہ ہے چچا عبدالباقی نے کہا کہ اس کے لیے زیادہ سرمایہ کی بھی ضرورت نہیں۔ چار ہزار روپے سے کام شروع کیا جاسکتا ہے۔۔۔ یہ تو ڈپٹی سیکرٹری مجھ پر ذاتی طور سے احسان کرنا چاہتا ہے۔ ورنہ اس ٹھیکے کے لیے تو بڑی تلک و دوا اور سفارش کی ضرورت ہے۔ واصل یہ ڈپٹی سیکرٹری میرا گرویدہ ہو گیا ہے۔“

”لیکن چچا یہ چار ہزار روپے کی رقم تم کہاں سے لو گے؟“

”بھئی بختیار۔ تمہارا خیال ہے کہ میں تم کو اس میں حصہ دار نہیں بناؤں گا۔ تم کیسے سوچ سکتے ہو کہ اتنے تعلقات کے بعد میں اس قدر کیلنگ کا مظاہرہ کروں گا۔۔۔ اس پر غور کرو بھتیجے! یہ سونے کی کان ہے۔ روپیہ کاؤ۔ بزنس میگنٹ بنو۔۔۔“

ایک غرارہ پوش لڑکی ہمارے پاس سے گزری اور چچا نے اسے دیکھتے ہوئے اپنے ہونٹوں کو سیکڑ کر سٹی سیائی۔ واصل وہ اس وقت اپنے گواہی عمر سے بیس سال چھوٹا محسوس کر رہا تھا۔ اس کی چال میں بھی ایک غفلانہ لپک آگئی تھی۔ بھیبوں نے مستحق کو خوش آئند اور گھلائی بنا دیا تھا۔

ہم چلتے چلتے وکوڑیہ روڈ کے آخر میں ایک موٹر شوروم کے سامنے رک گئے۔ مجھے  
شیٹے کے دروازوں کے پیچھے بجلی کی تیز سفید روشنی میں نئی چمکیں موٹر کاریں ایک دوسرے  
سے ناک بھڑائے کھڑی تھیں۔ چچا عبدالباقی نے ان کو گہری دلچسپی سے دیکھا۔  
”بھتیجے“ چچا عبدالباقی نے کہا۔ ”ڈا سو جوہ۔“ مینے کے آخر میں ہم دونوں کے پاس فٹ  
کلاس موٹر کاریں ہوں گی۔ میں نے تو کیڈ لاک خرید کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ڈپٹی میکر ٹری  
تربیت حیوانات کے پاس بھی کیڈ لاک ہے۔ ایک مینے کے بعد ہم کراچی کے فٹ کنگ ہوں گے؟  
عبدالباقی شوروم میں جا کر کاروں کی قیمتیں دریافت کرنے کا آزاد و مند تھا لیکن میرے  
یہ بتانے پر کہ یہ کیڈ لاک کاریں نہیں ہیں بلکہ گھٹیا میک کی کاریں ہیں۔ اس نے اپنا ارادہ  
تبدیل کر دیا۔

بعض تفصیلات اور کات مہیا ہے

آگے چلتے ہوئے اس نے اپنے حصار کو ایک اور فضا خانہ پیشکش کی۔  
 ”اور سچ ہے“ اس نے کہا، ”اس دفعہ میں تم کو سڑیہ لگانے کے لیے بھی نہیں کہوں گا۔ اس کے  
 بارود تھا اور پچاس پچاس کا حصہ ہو گا۔ سڑیہ کی ایک ایک پانی تک میری ہر گلی تھیں صرف  
 پچھلے مجھے چاہ نہ اور دو پیریلوہ قرض حسنہ کے دینا ہو گا۔ ایک مہینے کے اندر تمہارا یہ چار ہزار  
 تھیں واپس مل جائیگا۔ ایک ایک پانی۔۔۔۔۔“

میرے پاس تو ایک چوٹی کوڑی نہیں، میں نے کہا، چاہا اب بھیجے ڈھڑ چلبے، سانسے  
میرے ٹیلے کی دودکان ہے،  
میرے چھوٹے مڑ کر جینے لگے۔

”کیا تمنا واسارے کراچی میں ایک بھی ایسا دوست نہیں جرتھیں پانچ ہزار کی رقم صرف ایک مہینے کے لیے دے سکے۔ صرف ایک مہینے کے لیے“ اس نے پرامید صبح میں کہا۔

اگلے دن تم مجھ سے اپنے دوست محمد منیر کا ذکر کر رہے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر تم اس کے پاس جاؤ تو وہ انکار نہیں کرے گا۔ دوست آخر اسی بے ہوتے ہیں کہ بوقت ضرورت قرض دے سکیں۔ کیا خوبصورت لڑکی ہے؟ اور اپنے ہونٹ نکیر کر چھا عبدالباقی نے چہرہ پیش کیا۔

”کیا خوبصورت لڑکی ہے؟“ کاریارک ایک سٹوٹی، اٹھے ہونے ناک والی حسین سی چیز کے بارے میں کیا گیا تھا، جو ہاتھ میں لیڈیز مینڈ بلیگ دکھانے اونچی اڑیوں کی گرگایوں پر ٹپ ٹپ کرتی ہمارے پاس سے گزری تھی۔ میں نے چھا عبدالباقی کو کبھی اس مستدر رونٹک اور بیٹاش نہیں دیکھا تھا، جبنا اس شام کو۔ وہ اٹنے پاؤں چہر لڑکی کے چمچے جانے کا خواہشمند تھا مگر میں نے اس کو پھر یاد دلایا کہ اس طرف میرے ٹیلر کی دکان ہے۔

ہم فریڈال کی طرف چلتے گئے۔ پھلیوں کے لگائی دو پہلی خواب بکھتے اور شرکت کی شرائط پر بحث کرتے رہے۔ ہم نے پھلیوں سے متعلق سب امور کو خوش اسلوبی سے طے کر لیا۔ اگرچہ ہمیں زندگی میں پھلیوں کے ساتھ اس سے زیادہ کوئی تعلق نہیں رہا تھا کہ وہ کبھی کبھار ہمارے دسترخوان کی نعمت بنتی تھیں۔ پھر جس معاملہ فہمی اور کاروباری انداز سے ہم نے اس رات پھلیوں کے متعلق باتیں کیں اس نے ہمیں خود حیران کر دیا۔

۲

دوسرے دن صبح نو بجے میں اور چھا عبدالباقی وکٹوریہ میں کھٹن پر ڈپٹی سیکرٹری محکمہ تربیت حیوانات کے دفتر میں گئے۔ میں وکٹوریہ میں میٹار، اور عبدالباقی ڈپٹی سیکرٹری سے ملنے اندر چلا گیا۔ جب وہ ایک گھنٹے کے بعد واپس آیا تو رفاقت کی تصویر تھا اس کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھا جسے اس نے بڑے فخر سے میرے سامنے لہرایا۔ ڈپٹی سیکرٹری نے اسے اپنے دوست کے نام چھن دی تھی جو ایک ایسے شخص کو جانتا تھا جس کی



ڈاکٹر کمرات نثر کے دفتر کے ہیڈ کلرک سے گاڑھی چھٹی تھی۔ حیوانات کے دفتر سے ہم چرمیل کا فاصلہ طے کر کے حبشہ روڈ پر اس دوست کی کوٹھی پر پہنچے جس کے نام کی چھٹی تھی۔ کوٹھی کے پھوٹے ایک گٹھا ہوا شخص جاگیا اور بنیان پہنے اور لوہار کی دھونکی کی طرح ہانپتا ہوا، ایک ہیڈ پیپ کے دستے کو اس تندی اور آہنی عزم سے جھلکا رہا تھا جیسے دنیا کے مستقبل کا اس پر دار و مدار ہو۔ ہیڈ پیپ کے منہ سے ایک دہڑکا پائپ کی دوسری منزل پر جاتا تھا۔

”سات کرنا جائی“ چچا عبد الباقی نے اس سے پوچھا۔ کیا محمد احسن اشرفی صاحب اسی کوٹھی میں اقامت پذیر ہیں۔“

”بالکل“ اس آدمی نے ہیڈ پیپ پر اپنی مشقت کو روکتے اور اپنے ماتھے سے سینے کو پونچھتے ہوئے جواب دیا۔ قطعاً بلکہ محمد احسن اشرفی بننا چیز ہے۔“ — پھر اس نے اپنی ہیئت کفائی کی معذرت کرتے ہوئے کہا۔ ”بد بخت نوکر پھوڑا جگ گیا ہے۔ میں لوہر کی منزل پر رہتا ہوں۔ مجھے ہر صبح اور پرانی پہچانے کے لیے اس بد بخت پر سے دو گھنٹے دینا مشق کرنا پڑتی ہے۔“ — میرے سات بچے ہیں اور وہ سب بنانے کے عادی ہیں۔ میں خود مہینہ میں ایک دو دفتر بناتا ہوں۔“ — فرمائے کیسے تشریف لائے ہیں۔“

”کریم الدین صاحب آپ کے نام ایک خط دیا ہے۔“ عبد الباقی نے اسے بتایا۔

”حاجی کریم الدین صاحب نے دیا ہو گا۔ مہربانی کر کے ان سے کہہ دیں کہ میں یہ مکان ہرگز خالی نہیں کر سکتا۔ میں نے آپ سے عرض کیا ہے کہ میرے سات بچے ہیں۔“

”نہیں یہ سسر کریم الدین صاحب ڈپٹی سیکرٹری حیوانات کی چھٹی ہے۔“ چچا نے اسے تسلی دی۔

”مچھلیوں کے کمر بکٹ کے منفق تو نہیں؟“ اس آدمی نے اعتماد سے پوچھا۔

”ہاں اسی کے متعلق ہے۔ غالباً کویم الدین صاحب نے آپ سے اس سلسلے میں میرا ذکر مزد کیا ہو گا۔ میرا نام ایچ کے باقی ہے“

”نہیں آپ کا ذکر خیر نہیں آیا“ محمد احسن اشرفی نے کہا۔ ”مجھے پچھلے دو ماہ سے کویم الدین صاحب کے ملنے کا اتفاق نہیں ہو سکا۔ ہاں اس عرصے میں وہ مجھے سات آٹھ سفارشی خط بھیجا چکے ہیں کہ غلط لائے والے حضرات کو گورنمنٹ فٹرنری کی مجلسوں کا حلیہ دلوانے میں ان کی امداد کروں۔“

ہم اس جواب سے اتنے ہموں کارہ گئے کہ کچھ عرصے تک کوئی بات ہی سمجھ میں نہیں آئی۔ آخر چچا عبدالباقی نے پوچھا۔ ”تو گویا ان لوگوں کو ابھی کنٹریکٹ نہیں مل سکے؟“

”کنٹریکٹ ان میں سے ہر ایک کو کنٹریکٹ مل چکا ہے۔ وہ کچھ عرصے کے بعد چھوڑ کے چلے جاتے ہیں۔ ان میں سے دو اس وقت جیل میں ہیں۔۔۔“

”جیل میں؟ چچا عبدالباقی نے ہر دم اکر احتجاج کیا۔

”بالکل! مطلقاً! ان بد بختوں نے وقت پر گورنمنٹ کو ٹھیکے کی رقم ادا نہ کی تھی۔۔۔ اور پھر صاحب۔ انہوں نے میری مسز اور بچہ پر دن و رات سے اخشن سٹریٹ میں گندے ٹشے پھینکے۔۔۔ آپ حضرات تو اچھے خاصے معزز معلوم ہوتے ہیں؟“

”دیکھو سٹریٹ بجٹا رہی ہے“ چچا عبدالباقی نے اپنی آنکھ میں ٹشہ بیسے میری طرف منہ کر کے کہے۔ ”ہم لوگوں کی اخلاق حالت کس قدر پست ہو چکی ہے۔ برسرِ بازار لیڈیز پر گندے اندھے پھینکنا اور پھر چچا سے اشرفی صاحب نے انہیں ٹھیکے کر دیا تھا۔“

”ہاں ابھی لے ساقی صاحب۔ دو دن میں نے ان کو کنٹریکٹ دلوانے میں ضائع کیے۔“

”میرا نام ایچ کے باقی ہے“ چچا عبدالباقی نے مجھ و تار انگریزوں سے درست کیا۔

”ساجی عبدالباقی۔ میں علیگ ہوں۔“

”ادھر معائنہ کیجئے۔ آپ صاحبان تھوڑی دیر تک تشریف رکھیے۔“ — برآمدہ میں دو اسٹول رکھے ہیں۔ میں فوراً اس کام سے فارغ ہو لوں۔

وہ آدھ گھنٹے تک فارغ ہو کر آیا۔ اب وہ ایک میلی سفید چٹون اور ایک ٹوٹا ٹوک امریکن بوشرٹ پہنے ہوئے تھا جس کے انچے انچے پر خاخاروں کی نقل، اطلاق اور جادواز عشق کی سنسی غیر گنگنز چھپی ہوئی تھیں۔ خدا حسن اشرفی ان شخصوں میں سے تھا جو خیروں کو پڑھنے کی بجائے اور پڑھنے میں یقین رکھتے ہیں۔

چچا عبدالباقی نے اسے ڈپٹی سیکرٹری کا خط دیا۔ اشرفی نے اسے سرسری اٹلارے اور بے دلی سے پڑھا۔

”آپ کا ڈائریکٹ آف فشرز کے دفتر میں دسوخ ہے۔“ چچا نے پوچھا۔

”دسوخ؟ اشرفی بولا۔“ میرا ایک دوست ایک شخص کو جانتا ہے جو فشرز کے ہیڈ کلرک کو جانتا ہے۔ بلکہ وہ شخص اس ہیڈ کلرک کا سگاموں ہے۔ میں آپ کو اس دوست کے نام خط لکھ دیتا ہوں اسے گیارہ بجے سے پنے لے لیجئے۔ اس وقت تک وہ گھر پر ہوتا ہے۔ اس کے بعد وہ مچھلیاں پکڑنے چلا جاتا ہے۔“

”مچھلیاں پکڑنے؟ چچا نے جیس جیس ہو کر کہا۔

”ہاں۔ یہ اس کی بائی ہے۔ بائی۔ کچھ عرصہ پہلے اس کی بائی ٹکٹیں بیچ کر نکاتی۔ اس سے پہلے وہ ۱۹۳۰ کے بنے ہوئے مرتبان بیچ کرنے کا شوق کیا کرتا تھا۔ اس سے پہلے جب وہ محل میں میز پر جماعت تھا، اس کی بائی ایک صندوق میں میز پر پکڑ کر بند کرنا تھا۔۔۔ آپ جانتے ہیں، بعض لوگ بائی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے۔ آپ لوگ اب جانے کی کریں ورنہ وہ گھر پر نہیں ملے گا۔“

چچا عبدالباقی نے اسے بتایا کہ اس نے اس کے نام ایک خط دینے کا وعدہ کیا تھا۔  
”خط ضروری نہیں ہوگا“ اس نے کہا ”آپ اس سے کہ دیں کہ میں نے آپ کو

بھیجا ہے“

ہم نے اس کا شکریہ ادا کیا اور کوٹھی سے باہر آکر دکوٹہ میں بیٹھنے ہی لگے تھے کہ چچا کو یاد آگیا کہ اشرفی نے ہمیں دوست کا نام اور پتا تو بتایا ہی نہیں۔ ہم پھر واپس اس کے پاس گئے۔ اس نے کہا کہ اگر ہم تھوڑی دیر انتظار کر سکیں تو وہ خود ہمارے ساتھ چلے گا۔

ہم نے اس کرم فرمائی پر اس کا شکریہ ادا کیا۔ اس نے ہم سے درخواست کی کہ ہم اسے مزید شرمندہ نہ کریں اور یہ کہ ہماری امداد کرنا اس کا فرض ہے۔

اس کے بعد ہمیں اسٹوٹنوں پر بٹھا کر وہ اوپر چڑھ گیا۔

آدھ گھنٹے کے بعد جب وہ نیچے آیا تو اس کے ساتھ پانچ چھوٹے اشرفی اور تھے۔ اگر دنیا میں ان سے زیادہ بد نیز اور ناخوش گوار بچے اور کہیں ہیں تو میں نے انہیں نہیں دیکھا۔ وہ اپنے باپ کے ہمین کے مختلف مراحل کی ناسمجھی کرتے تھے۔ اور اشرفی چھاپ واضح طور پر ان کی چٹائیوں پر شبت تھی۔

”معاف کیجئے۔ میرا بھائی صاحب۔ مجھے قدرے دیر ہوگئی۔“ اس نے معذرت چاہی۔

”میرا نام عبدالباقی ہے“ چچا نے وقار سے کہا۔

”اؤہ عبدالباقی...“ ان تو صاحب بات یہ سوئی کہ بچے ابھی سکول کے لیے تیار نہ ہوئے تھے۔ آپ حضرات اگر براہ مامیں تو بچوں کو سکول چھوڑنے کے بعد عبدالحنان کے ہاں چلیں گے۔ سب ٹیکسی میں آئے ہیں۔“

”ڈکٹوریہ میں“! میں نے جواب دیا۔

”چلو ڈکٹوریہ بھی ٹھیک ہی ہے۔ اگرچہ بچوں کو دیر تو ہو جائے گی۔ میں اپنی کارے چندا، لیکن اس کا سٹیئرنگ ٹوٹ گیا ہے۔“

اشرفی کے بچوں کو ان کے سکولوں میں چھوڑنے میں میں کوئی ڈیڑھ گھنٹہ لگا۔ وہ دو مختلف سکولوں میں پڑھتے تھے جن میں ایک ایسی بیٹیاں لائسنس کی طرف تھا اور دوسرا میری ویدر کلاک ٹاور کے پاس۔ ویسے ان میں سے کوئی بھی اسکول جانے کا شائق نہ تھا وہ سب کلفٹن جانا چاہتے تھے اور جید بگڑے ہوئے بچے تھے اور اپنے باپ سے ضرورت سے زیادہ بے تکلف تھے۔

بچوں کو سکولوں میں پہنچانے کے بعد محمد حسن کو یاد آگیا کہ اس کو بیوی کے لیے ایک سویٹر اور بچوں کے لیے جرابیں، صابن، ہیرا آئل وغیرہ خریدنا ہیں۔  
”اگر آپ حضرات براہ مامنین“ اس نے بولسن مارکیٹ کے پاس ڈکٹوریہ بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”تو میں یہاں سے کچھ ضروریات کی چیزیں خرید کر لوں۔ بد بخت بچے صابون اور تیل دو روز میں ختم کر دیتے ہیں۔“ میں ابھی ایک منٹ میں آیا۔

وہ پورے ایک گھنٹے کے بعد آیا۔ اور معلوم ہوا تھا کہ اس نے مارکیٹ کے ارد گرد کی سب دوکانوں کو چھان مارا ہے۔ اس نے کئی سویٹر، کئی جرابوں کے جڑے اور صابن اور ہیرا آئل کی بوتلیں دوکانوں پر دیکھیں، لیکن وہ وہ سوٹر وہ جرابیں، صابون اور ہیرا آئل نہ تھا جو وہ خریدنا چاہتا تھا۔ اس لیے وہ صرف ایک ربڑ کا چھوٹا گیند خرید کر لایا۔ اور اس کے متعلق بھی اسے شکایت تھی کہ دوکاندار نے اسے ٹوٹ لیا ہے۔

”بد بخت دوکانداروں نے ہر چیز کے جھاڑ پڑھا رکھے ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”اگر آپ حضرات براہ مامنین تو میں ایک منٹ کے لیے جوتا بازار بھی ہواؤں۔“

مختصر یہ کہ جو بازار میں ڈیرہ گھنٹہ لگانے کے بعد جہاں سے اس نے ایک لہجے کا کھیر خریدا، اس نے ہمیں اطلاع دی کہ اب اس کے دوست کے ہاں جانا فضول ہے، کیونکہ اب وہ یقیناً پھلیاں پکھڑنے جا چکا ہو گا۔ اگر آپ حضرات براہ مہربانی اس نے کہا تو مجھے کوٹھی پر چھوڑ دیں۔ — معلوم کیجئے۔ آپ حضرات کو بے حد تکلیف ہوئی۔ کل تو مجھے آپ پھر میری کوٹھی پر تشریف لے آئیں تو بہتر ہو گا۔ بد بخت و کٹورہ بہت وقت لیتی ہے؟

ہم نے اسے اس کی کوٹھی پر چھوڑا۔

چچا عید الباقی نے اس سے پوچھا ”آپ ہمیں اپنے دوست کا چاقو بتا دیجئے۔ ہم ان سے خود ملنے کی کوشش کریں گے؟“

”نہیں صاحب۔ یہ بھی کوئی بات ہے۔ میں خود آپ کے ساتھ جاؤں گا؟“ اس نے کہا۔

”عبدالحنان ذرا بیڑھی کھیر ہے؟“

”اُن کا نام عبدالحنان ہے؟ چپانے پوچھا۔“

”وہ بالکل مطلقاً، محمد امین اشرفی نے کہا۔“

”غالباً وہی تو نہیں جو سوٹ سیٹ مرچنٹ ہیں؟“

”نہیں یہ اور ہیں۔ یہ سولوی عبدالحنان ہیں؟“

”کہاں رہتے ہیں؟“

اس نے ذرا تامل کے بعد ہمیں میرٹ روڈ پر ایک پتلا بتایا۔ مگر ساتھ ہی اس نے غلامان

مشورہ دیا کہ ہم اس کو ہمراہ لے بغیر عبدالحنان سے ملنے کی ہرگز کوشش نہ کریں۔

”نہیں صاحب یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ چچا نے اسے یقین دلایا۔“

دکٹوریہ میں وٹھے وقت چچا عید الباقی نے جو اس شخص کے خلاف جہرا بیٹھا تھا۔ جی ہرگز

اپنا غبار نکالا۔۔۔ اس اشرفی کے بچے کو دیکھو، یہ کوئی انسانیت ہے۔ یہ خرید کرنا ہے، وہ خرید کرنا ہے۔ یہاں چلو، وہاں چلو، جیسے وکٹوریہ اس کے باپ کی ہے۔ بختیار بھی... کل اس شخص کے یہاں آنے کی بیٹھائی سیدھے مولوی عبداللہان کے پاس چلیں گے تم نے دیکھا میں نے اس سے عبداللہان کا پتہ کسی حکمت عملی سے اگوا لیا۔ وہ اسے نہیں بتانا چاہتا تھا۔ جب ہم نے وکٹوریہ کو چچا کے مکان پر رخصت کیا تو وکٹوریہ والا سات روپے سے کم لینے پر رضامند ہو رہا میں نے ڈوبتے ہوئے دل سے کرایہ ادا کیا۔ چچا عبدالباقی پاس کھڑے تھے انداز میں دیکھتا رہا۔

(۳۰)

مولوی عبداللہان میریٹ روڈ پر ایک تنگ و تاریک ٹیلیٹ میں رہائش پذیر تھا اور ہم نے اس کا پتہ بڑی مشکل سے ڈھونڈا۔ وہ خود بھی ایک انتہائی تنگ و تاریک قسم کا آدمی تھا۔ بانس کی طرح لبا اور سارے کا سارا ہڈیوں کا ڈھانچہ۔ وہ ایک مشین آدمی معلوم ہوتا تھا۔ اس کے اعضا ناگمانی و چمکوں کے ساتھ حرکت میں آتے تھے۔ اس کی ٹھوڑی سے ایک چھوٹی سی کارڈنیل ریچلیو (CARDINAL RICHELIEU) ٹائپ ڈارجن معلق تھی۔ ایک نہایت ہی بوسیدہ اور ٹرسناک ڈارجن۔ جس وقت ہم اس کے چتا پر پہنچے، وہ ایک نہایت تیزی سے فوراً اور اینٹنگ کیپ پہنے اور ہاتھیں چھلی کا کاٹا کپڑے میز صوفیوں سے نیچے اتر رہا تھا۔ ہم نے اسے عین موقع پر پکڑا تھا۔ درز وہ گھر پر ہیں یقیناً نہ مل سکتا۔

ہم نے اسے بتایا کہ ہم کو محمد اسن اشرفی صاحب نے اس کے پاس بھیجا ہے اور اس نے فوراً ہم سے پوچھا کہ آیا ہمارا نشریہ آوری گورنمنٹ کی مجلسوں کے ٹیکے سے متعلق ہے۔ ہم نے اسے یقین دلایا کہ یہی ہمارے حاضر ہونے کا مقصد ہے۔ چچا عبدالباقی نے اس کی قیادہ شناسی کی مناسب الفاظ میں داد دی۔

اس نے کہا کہ وہ میں ضرور دیر ٹھیکہ و لوٹنے میں حتی الامکان لگ دو دو کوئے گا اور چونکہ میں اشرفی صاحب نے جیسا ہے اس لیے وہ ہم سے بالکل معمولی کمیشن چارج کر لیا۔ کمیشن کے ذکر نے میں حیران کر دیا۔ چچا عبدالباقی نے اسے بتایا کہ ہم دراصل ڈپٹی سیکرٹری کریم الدین صاحب کے اپنے آدمی ہیں اور یہ کہ ہمارا خیال نہ تھا کہ کمیشن دینے کا کوئی سوال بھی پیدا ہو گا۔

ایک اتھارٹی ٹکٹ کے اتھار اس کے چہرے پر نمودار ہوئے۔  
 ”کیا آپ کو معلوم نہیں“ اس نے کہا کہ ڈائریکٹر فٹرنری کے محلے کو دیئے دلائے بغیر یہ کام نہیں ہو سکتا۔ اپنے لیے تو مجھے ایک پائی ٹکٹ کی خواہش نہیں۔ ویسے آپ کو خود خیال کرنا چاہیے کہ یہ ٹھیکہ کیا سخت مشکل کام ہے۔ آئیے اوپر چل کر دفتر میں بیٹھیں؟  
 ہم بیٹھیں چلے گئے اور پراس کے دفتر میں داخل ہوئے۔ اس کا دفتر ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جس کے کونے میں ایک تل اور ایک بالٹی تھا ہر کونے تھے کہ غسل خانہ بھی یہی ہے۔ ایک میز کے آدھار دو کرسیاں پڑی تھیں۔ ایک کی نشست اوڑھ جانے کی وجہ سے غائب تھی۔۔۔  
 تل کے اوپر ایک رنگین تصویر ایک کیل سے لکھ رہی تھی، جس میں قائد اعظم اور بیات علی خاں چانڈ ستاروں والی ٹوپیاں اور ۱۸۹۰ء کی ترکی فوج کی وردیاں پہنے اور عبادتہ شمشیر سے لیں تعظیفانہ انداز میں سکڑا رہے تھے۔

اس نے جلدی سے اپنے آپ کو دفتر کی واحد قابل استعمال کرسی پر متمکن کرتے ہوئے بغیر نشست والی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔  
 ”تشریف رکھیے۔ معاف کیجئے۔ کرسی یہاں ایک ہی ہے۔ آپ میں سے ایک صاحب بیز پر بیٹھ سکتے ہیں؟“

چچا عبدالباقی نے بیز پر بیٹھنے کو ترجیح دی۔ میں بے نشست کرسی کے بیرونی چوٹی پر



کے سرے پر اُٹک کر بیٹھ گیا۔

”آپ اطمینان سے چوبیسٹینے“ اس نے میرے ساتھ خوش اخلاقی برقی اس نے اپنی پس فر کی جیب میں سے ایک پرائٹا پائپ اور کا قدمیں لٹی ہوئی تبا کو کی پڑیا کھائی اور تبا کو کو اپنی ہتھیلیوں میں سستے ہوتے اس نے اپنی ماتمی آنکھوں سے ہمارا جائزہ لیا۔

”مجھے سگریٹ پینے کی عادت نہیں“ اس نے کہا۔ اس لیے میں آپ کو سگریٹ پیش کرنے سے معذور ہوں۔ اگر آپ کی جیب میں پائپ ہو تو تبا کو حاضر ہے۔ اس نے پائپ کو منہ میں لگاتے اور سلگاتے ہوئے کاروباری باتوں کا آغاز کیا۔

”ہاں تو صاحبان“ اس نے کہا ”کچھ دیئے ولانے پیر ٹھیکے کا مل جاتا نا مکن ہے؟“ اس نے متعدد کمیشنوں اور تندرلوں کی فہرست گنائی جن کا دیا جانا ضروری تھا۔ ایک تو اس کو کرک کا کمیشن تھا جو ہم سے ٹنڈرے گا۔ ورنہ وہ اسے کم کر سکتا ہے۔ پھر اس شخص کا کمیشن ہو گا جو دوسرے ٹنڈرے دینے والوں کے سربہر ٹنڈروں کو کھول کر ہمیں ان کا آفر قبائے گا تا کہ ہم اپنے ٹنڈر میں سب سے زیادہ آفر سے ایک دو پیسے نائد کا آفر کریں۔ پھر میڈیکلرک تھا۔

اس نے اصرار کیا کہ ہم چائے پیں۔ بد قسمتی سے اس کی بیوی کہیں باہر تھی اور چائے گھر پر تیار نہ ہو سکتی تھی۔ اس لیے وہ ہمیں نیچے ”وی اسٹیٹ سپہان ہٹل“ میں لے گیا۔ چچا عبدالباقی اور میں نے چائے کی ایک ایک پیالی پی کیو کہ ہم ہاسٹہ کے کے آئے تھے۔ مولوی عبدالحنان نے چائے کی پیالی کے ساتھ چار ٹرسٹ اور دو آلیٹ بھی ختم کیے۔ اچھے ہوئے اس نے چچا عبدالباقی کو کاؤنٹر پر بل ادا کرنے کے لیے کہا۔ چچا نے مجھ سے چار روپے ادھار لے کر بل ادا کیا۔

مولوی عبدالمنان چاہتا تھا کہ کیشنوں کی رقم جو اس کے حساب کے مطابق ساڑھے تین سو سو بیس تھی، فوراً اس کو دے دی جائے۔ پھر جس جس سے نعتنا ہو گا وہ خود منٹ لے گا اور ہمارے لیے دوسری زد ہے گی۔ چچا عبدالباقی نے کاروباری ذہانت کا ثبوت دیتے ہوئے کہا کہ ہم ضروری کیشن وغیرہ خود دیں گے۔ اس سے مولوی عبدالمنان کو بڑا صدمہ پہنچا۔ اس نے کہا کہ اس کے دل کو دکھ پہنچا ہے کہ ہم اس پر اعتماد نہیں کر رہے۔ اس نے ہمیں کئی ایسی پارٹیوں کے نام گنوائے جنہوں نے اسے پچاس پچاس ہزار تک کی رقم بنیو سید کے سونپ دی تھی۔

ہوٹل سے ہم ٹیکسی لے کر ڈائریکٹ آفٹ مشنری کے دفتر میں گئے۔ مولوی عبدالمنان ہمیں باہر بنی پر بٹھا کر خود ایک کمرے میں پہلا گیا۔ آدھ گھنٹے کے بعد وہ باہر آیا اور اس نے ہمیں اندر آ جانے کا اشارہ کیا۔ اس کے چچے چچے ہم ایک بڑے کمرے میں تھے جس میں کئی تودو بیڑیاں چتے ہوئے کلرک میزوں پر ٹانگیں رکے ہوئے تھیں۔ ایک بڑی میز کے سرلی طرف ٹائلوں کے پارٹوں کے چھپے ایک پھیلے آنکھوں والے قد سے ترش رو شخص نے اٹھ کر ہم سے مصافحہ کیا۔ میں نے اس کی آنکھوں کو حیرت سے دیکھا۔ وہ سامنے ہماری طرف دیکھنے کی بجائے طرف کی دیواروں کو دیکھتی معلوم ہوتی تھیں۔ یہ ہیڈ کلرک تھا جس کے ہاتھ میں ہماری قسمت تھی۔

”اچھا تو آپ گورنمنٹ مشنری کے ٹیکے کے ٹنڈر دینا چاہتے ہیں۔“ اس نے منوں دیواروں کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اس ٹیکے کے لیے مجاز بردست کیشیشن ہے۔“ چچے دو دن میں ہمیں بڑی بڑی معتبر پارٹیوں سے پچاس کے لگ بھگ ٹنڈر موصول ہو چکے ہیں۔ آپ چونکہ بھائی عبدالمنان صاحب کے خاص آدمی ہیں۔ اس لیے آپ کی ہر طرح

امداد کرنا میرا اخلاقی فرض ہے۔۔۔ دیکھیے یہ سب ٹنڈر ہیں : اس نے ریک پر لمبی ہونٹ  
ایک مجسم ڈھیری کی سمت اشارہ کیا۔ اس نے اپنی آواز دھیمی کر دی : سب سے  
زیادہ آفر کھٹا والا کمپنی نے اپنے ٹنڈر میں دیا ہے۔ یعنی آٹھ ٹن کے کچے کا چار ہزار روپے ٹاپ  
چار ہزار ایک روپے کا ٹنڈر دے دیں ؟

اس نے ایک ٹنڈر تمام ہماری طرف بڑھا دیا۔ چچا عبدالباقی نے مولوی عبدالحنان کی  
ہدایت کے مطابق اسے چیک کیا۔ میڈیکلرک نے ہمیں ایک ہزار روپے بطور ضمانت کے  
اسی روز یا اس سے اگلے روز گورنمنٹ ٹرنزری میں داخل کر دینے کی ہدایت کی۔

ٹرنزری رسید آپ یا تو چچائی عبدالحنان کو دے دیں یا براہ راست مجھے پہنچا دیں۔  
میں خود اسے آپ کے ٹنڈر کے ساتھ منتقلی کرنے کے بعد ٹنڈر کو مر لگا دوں گا۔ لیجئے پان  
سے شوق کیجئے۔

اس کے بعد مولوی عبدالحنان چچا عبدالباقی کو ایک طرف لے گیا۔ ان کے درمیان  
کچھ دیر کھسر سپر ہوتی رہی پھر چچا عبدالباقی مجھے ایک طرف لے گیا اس نے مجھے بتایا کہ ٹنڈر  
قبول کرانے کے لیے دو سو روپے پر فیصلہ ہوا ہے۔

”تمہارے پاس دو سو روپے ہیں“ اس نے راز دارانہ انداز میں پوچھا۔  
مجھے اس روز ایک بزرگ کی معرفت بوڑھے آدمی نے تین سو روپے حیرانے تھے  
جو اس وقت میری حسیب میں تھے۔ مجھے خیال آیا کہ سات اٹھارہ کروڑ گرویر سے پاس  
روپے نہیں ہیں مگر چچا نے مجھے ٹھیکس کا کرایہ ادا کرتے دیکھ لیا تھا۔ ویسے بھی چچا کے  
اندروں دوسرے لوگوں کی میزبانی میں پڑے ہوئے نوٹوں کو سوٹھ لینے کی جس حیرت ناک  
طور پر تیز ہے۔

کاشپے ہوئے انھوں سے میں نے دو سو روپے کے نوٹ چچا عبدالباقی کے

اتنے میں دسے دیے۔ چچا عبدالحنان کو ایک طرف سے گیا اور نوٹوں کو اس کی جیب میں ڈال دیا۔ عبدالحنان نے ہینڈ کلرک کے پیچھے چلنے سے جا کر نوٹوں کے کچھ حصہ کو ہینڈ کلرک کی جیب میں منتقل کر دیا۔

اس رسم کے بعد ہینڈ کلرک پہلے سے زیادہ ترش اور گھبراہٹا ہوا میرے دماغ کرنے کے لیے اٹھا۔ آپ حضرات سے مل کر بڑی خوشی ہوئی، اور کوئی خدمت ہو تو بندہ ہر طرح سے حاضر ہے۔

دفتر کے باہر پہنچ کر چچا عبدالباقی نے مجھے سرزنش کی: ”دیکھو، بھتیجا! تمہیں دہاں ہینڈ کلرک کے سامنے رو پڑنے پکڑنے میں جھپکا ہٹ کا اظہار نہیں کرنا چاہیے تھا۔ تمہیں ایسے کاموں کا تجربہ نہیں اور پھر تم یہ سمجھو کہ یہ دوسو روپے تم نے نہیں دیے بلکہ میں نے دیے ہیں۔ میں نے گویا یہ دوسو روپے اس چار ہزار روپے کی رقم میں سے دیے ہیں جو تم مجھے بطور قرض دینے والے ہو۔“

گھلا اور کے پاس سے گزرتے ہوئے مولوی عبدالحنان نے مجھ سے پندرہ روپے اچھلا لیے۔ اس نے ایک پھیری والے سے کریم، پاؤڈر، سستی لپ شک ادا کیے یہی عطر کی شیشی خریدی۔ ہم نے اسے میری ریٹ روڈ پر اس کے فلیٹ پر چھوڑا۔ اس نے ہم سے کہا کہ اگلے روز ہم ڈائریکٹر آف نشریہ کے دفتر جاتے ہوئے اسے حوزہ ساتھ لے لیں۔ چچا عبدالباقی نے اس سے وعدہ کر لیا۔

یہ مولوی عبدالحنان بڑے کام کا آدمی معلوم ہوتا ہے۔ راستے میں چچا عبدالباقی نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا: ”اس کی ڈائریکٹر آف نشریہ کے دفتر میں بڑی جان پہچان ہے اور ہینڈ کلرک تو اس کا سر ہے۔ اس کنٹرول کے حوصلے کو مائل کرنا بڑا مشکل ہے۔ ذرا سوچو دو روز میں پچاس ہزار روپے بڑی بڑی کمپنیوں کے کپڑوں نہ ہر جتنی ایک

کچھ پانچ ہزار کا ساخ تودہ پڑا ہے۔ یہ تو بے چارہ کریم الدین علیگ نکلا اور اسے مولوی عبدالحق نے جاک و دوڑ کی کر ہمارا پانس اس قدر روشن ہو گیا، ورنہ سوخ کے بغیر کون پوچھتا ہے۔۔۔۔۔ اچھا! آج ہی چار ہزار روپے کا انتظام کر کے مجھے فوراً دے دو۔  
 محمد نیر تنویر سے ملنے کی کوشش کرو۔۔۔۔۔ ہاں یہ آج کا لکیشن اور کبھی وغیرہ کا فرج  
 اگر تم جاہو تو اس چار ہزار میں سے وضع کر سکتے ہو۔۔۔۔۔

”محمد نیر تنویر کے بارے میں مجھے یقین نہیں کہ وہ چار ہزار روپے دے دے گا، میں نے کہا۔

”وہ تمہارے باپ کی بیویوں کا اسپورٹ اینٹ ہے۔“ چچا عبدالحق نے مجھے ڈھارس دی۔ وہ بوڑھے آدمی کے حساب میں سے ہی تھیں یہ رقم دے سکتا ہے۔ بوڑھے آدمی کو اس کا چاہی نہیں چلے گا۔ ایک مہینے کے اندر ہی تم یہ رقم محمد نیر کو لوٹا سکتے ہو۔  
 دوسری صبح میں محمد نیر تنویر سے ملے ڈروڈ پاس کے دفتر میں ملنے کے لیے گیا۔ محمد نیر تنویر دوسرے تیسرے مہینے اپنے شاف کو تبدیل کرنا دیتا ہے۔ میں نے اس سینڈ ول چچا ایک نئی بیڈی ریسیٹنٹ کو ڈمک کیے پیٹے ہوئے پایا۔ جو میرے اور محمد نیر تنویر کے بے تکلفا تعلقات کو سنیں جانتی تھی۔ وہ ایک کافی حسین اور پیادہ چیز تھی اور اگرچہ ہم خطی طبعاً طبعاً ثابت سے دور رہنے کے قائل ہیں تاہم ہم شروع سے نسوانی حسن کے قد و اس رہے ہیں۔  
 محمد نیر تنویر کے پاس اس وقت کوئی علاقائی تھا اور لیڈی ریسیٹنٹ نے مجھے کچھ دیر انتظار کرایا۔ علاقائی کے جانے کے بعد ریسیٹنٹ نے میرا چٹ اندر بھجوا دیا اور تنویر نے فوراً مجھے اندر بھجوا دیا۔

محمد نیر تنویر مجھ سے اتنا کہ ملا اس نے ایک گرم جوش اور پراقتنا مصافحہ کیا۔

”آؤ جی چاہے۔ اتنا عرصہ تم نے ہی نہیں تنویر نے مل جلار دیا اور غیانی میں

کہا۔ کہاں رہتے ہو۔“

اس نے بھلی سے کام کرنے والی گھنٹی بجاتی اور پھر اس کو چائے لانے کے لیے کہا۔  
اس نے میز کی دراز میں چھپائے ہوئے پانچ سوپچن کا سگرٹوں کا ٹین نکال کر میری طرف  
بڑھایا۔

تجا چا۔ ہمدی نئی ریسیٹنٹ دیکھی ہے؟ اس نے گھونٹے وال گھسے دار کرسی پر  
تقریباً بیٹھتے ہوئے اور سگرٹ کا ایک پین چھت کی طرف پھرتے ہوئے کہا ہے ناٹ  
کلاس! داد دے پھر ہمارے چائس کی! واقفیت کرادوں تمہاری اس سے آج چوٹیروں!  
یہ بھی آ رہی ہے۔ ڈز سوٹ ہے نا تمہارے پاس؟

کلاس! تمہاری اس سے آج چوٹیروں!  
5-4-68

میرے پاس کہاں ہے ڈز سوٹ؟  
پھر تو مشکل ہے چا چا! تم نے ڈز سوٹ بھی نہیں خرابایا۔  
پھر اور سنا کیا رہتا ہے۔۔۔ ادیاں پیسے کہا۔ جیش کر۔۔۔ دیکھ میں چند  
سال پہلے کیا تھا۔ اب میری شان دیکھ۔۔۔ لاڈلوگی بڑی کل مجھے ٹکری سٹے مغلی، موٹر سائیکل  
کی سول اینجنی دے گیا ہے۔ میں ایک امریکن فرم کے اشتراک میں میر میں ایک بوٹ بنانے  
کی ٹیکری بھی بنوا رہا ہوں۔ یہ ہو گیا تو میں پھر تو میں واقعی بزنس مین بن جاؤں گا۔  
وی بوٹ گلک آف پاکستان۔ جیش کر! کے دکھا دوں گا تمہیں میاں بھر۔۔۔ چائے پی؟  
میز پر فون کی گھنٹی بجی اور محمد زینر تو میرا پانی گھونٹنے والی کرسی پر اس قدر مضافی اور  
مستندی سے رسیورڈ اٹھانے کے لیے گھوما کر میں سسٹنڈر رہ گیا۔

”جی اس ایک مینے کے اندر اندر مال آجائے گا۔ شپ ہو چکا ہے۔ ایک تھانہ ٹیگی  
اداکرنا ہو گا۔“

”چھٹس گیا۔“ محمد زینر تو میرے رسیورڈ رکھتے ہوئے مجھے اطلاع دی۔ ”چا چا۔ میری  
کتاب دیکھی ہے تم نے۔“ ”تو نہ تنویر۔“ اور اس نے گھنٹی بجاتی اپنے دفتر کے ایک

کلرک کو مایا۔ اس نے اسے حکم دیا کہ مجھے ”تراژڈی تنویر“ کی ایک جلد پیش کرے۔  
 محمد مزین تنویر اسکول کے ایام میں غزلیں اور نظمیں لکھتا تھا اور کسی قدر ادیب مشہور تھا۔  
 ”تراژڈی تنویر“ بھی انہی دنوں کی غزلیات کا مجموعہ تھا۔ ویسے اس میں سے بعض غزلیں قاضی مجیب  
 اننگز جلد ساز کی جدوت طبع کا نتیجہ تھیں جو اسکول کے طالب علموں اور دوسرے لکھنؤ سے مل  
 غزل موزوں کر دینے کے چار آنے چار ج کیا کرتے تھے۔

کلرک نے کتاب کی ایک کاپی مجھے لاکر دی۔ محمد مزین تنویر نے ”تراژڈی تنویر“ کو جدید صورت  
 انداز میں طبع کرایا تھا۔ جلد نیلے ماکو چڑے کی تھی۔ اور اس پر سنہری الفاظ میں کتاب اور مصنف  
 کا نام کندہ تھا۔ اندر کا لاکھڑا سیل سب سے بہتر آرٹ پیپر تھا، اور کتاب اس اہتمام سے چھاپی گئی  
 تھی جیسے تاج اور پیکو کے عکسی قرآن شریف۔ قیمت پانچ روپے تھی۔

”دیجہ پیر جاچا“ کتاب چھپائی ہے ناچھڑ پورے تین ہزار روپے اس پر لاگت آئی ہے۔  
 میرے خیال میں سارے پاکستان میں یہ واحد ڈسٹریبیوٹ ہوں جس کو شعر و ادب میں کافی  
 دسترس ہے۔ میں نے ”تراژڈی تنویر“ کی جلدیں گورنر جنرل اور سب فسطح کو بھجوائی ہیں۔  
 اس نے کلرک کو گفٹی بجا کر لایا۔

”بھئی وہ تراژڈی تنویر“ کی ایک جلد تم نے مولوی قیصر الدین خاں صاحب کو بھجوا دی  
 ہے نا؟

”ابھی نہیں جناب عالی“ کلرک نے جواب دیا۔  
 ”یہ آج ہی بھجوا دیجئے“ محمد مزین تنویر اپنے شائستہ خوش اخلاق پرستار ہے اور  
 ایک کاپی ڈپٹی کمشنر اور ایڈیٹر کو بھی بھجوانی ہے۔  
 ”لاچاچا“ اس نے کہا۔ ”تیری جلد کو آؤ لگات کر دیں“ اور اس نے کتاب کے سرورق پر  
 ”بختیار علی کی قدر۔ محمد مزین تنویر لکھ دیا۔

”اوسے مولانا۔ میں نے عرصہ ہوا شعر و شاعری چھوڑ رکھی ہے اور نہ لکھتا رہتا تو اس وقت تمہارے جوش و فراق وغیرہ جتنا مشہور ہوتا۔ اصل میں ادیب بننے کا جی ایک دقت شوق ہوتا ہے۔ اچھا چاہا اکل میں نے لارڈ بولگی بولگی کی آنریس ڈنرویا ہے۔ تم جی آؤ گے بڈز سوٹ ہے نا تمہارے پاس؟“

میں نے اس سے کہا کہ تھوڑی دیر پہلے جی میں اسے بتا چکا ہوں کہ میرے پاس ڈنر سوٹ نہیں ہے۔

”ایک ڈنر سوٹ تو نہ چھوڑ۔ چاہا“ اس نے مجھے ترسم آمیز نظروں سے دیکھا تو جی اس طرح حاجی نبول کا حاجی نبول دیا۔۔۔۔“

”مونیئر تنویر“ میں نے آخر کہا ”ہم اسکول میں اکٹھے تھے؟“

”ہاں چاہتے تھے۔ بالکل تھے ا“

”ہم ملکر میسے درست تھے۔ میں نے کہا۔“

”چاہا۔ بات کر“

”کیا تم مجھے آج چار ہزار روپے فی الفو ماہوار دے سکتے ہو۔ صرف ایک مہینے کے لیے“

”مونیئر تنویر کی پڑا عتاو خوش مزاجی اس کے چہرے سے ایک چھلکے کی طرح اتر گئی۔“

وہ غلین ہو گیا۔

”ج“

”بالکل سچی بات ہے؟ اور میں نے پھیلیوں کا ٹھیکہ حاصل کرنے کے بارے میں اپنی کوششوں کا اس سے ذکر کیا۔ مجھے یہ نہیں معلوم کہ اس نے اس حکم کے بارے میں کیا رائے قائم کی مگر اس نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔ ”کل تم میرے پاس آتے تو میں تمہیں چھ ہزار روپے تک دے سکتا تھا۔ آج۔۔۔۔“





کبھی کو معلوم نہ تھا کہ سب ٹرینز دی کہاں ہے۔ آخر ایک شخص نے بتایا کہ وہ بیونس ایلس کا پوریشن کے بازو میں ہے۔ ہم فوراً بیگلرک سب ٹرینز دی میں پہنچے۔ آدھ گھنٹے کے بعد فارموں والی کھڑکی کے پاس پہنچے پر پتا چلا کہ چھپے ہوئے فارم ختم ہو چکے ہیں۔ ایک پان چبائے ہوئے کلرک نے سڑک کے پار ایک ٹائپ کرنے والے کی دوکان کی طرف اشارہ کیا اور کہا "وہاں سے آپ کو ٹائپ شدہ فارم، آٹھ آنے فی فارم کے حساب سے دستیاب ہو جائیں گے۔"

ٹائپ والے کی دوکان کا نام "دی رائل سوٹر ٹائپنگ اسکول" تھا۔ پورا ٹرینز جو ایک سفید تیلون پر پانی خاکی مٹی کا فری کوٹ پہنے ہوئے تھا، شایانہ خوش اخلاق شخص ثابت ہوا۔ اس نے ہمیں کرسیوں پر بٹھایا۔ ہمیں دو فارم دیے اور کہا کہ ہم انہیں بھر سکتے ہیں۔ اس نے ہم سے ایک دو پیرنی فارم چار ج کید فارموں کو بھر کر ہم پیر فارم لینے والے کلرک کے پاس پہنچے۔ وہ اس وقت چائے پی رہا تھا۔ چائے پی کر اس نے اعلیٰان سے بیڑی سلگائی۔ بیڑی ختم کرنے کے بعد اس نے ہم سے فارم لے لیے اور چالان بنا کر ہمارے حوالے کیا کہ اسے دو پیر پیج کرتے ہوئے ٹرینز دی میں دے دیں۔ چالان لے کر ہم واپس ٹرینز دی کو جا گئے۔ وہ بند ہو چکی تھی۔ اس سے اگلے روز ہم صبح چار بجے ٹرینز دی کے باہر جا کھڑے ہوئے۔ اس دفعہ ہم کیڑیوں سے بچے پیش تھے۔ آٹھ بجے کلرک کے آنے پر ہمارا دوسرا واقعہ جمع ہو گیا اور ہم نے ٹرینز دی رسید لے کر اعلیٰان کا لیا سانس لیا۔

ٹرینز دی رسید ہم نے مولوی عبداللہان کو جا کر دی کہ اسے ہیڈ کلرک کو پہنچا دے۔ مولوی عبداللہان سے اب ہماری کافی گاڑھی چھیننے لگی تھی۔ اس مدت تک کہ ایک دو دفعہ اس نے مجھے اپنا قدیمی پائپ بھی چھیننے کے لیے دیا۔ چچا عبد الباقی نے اس کو زیادہ دوست بنانے کی خاطر گھر کے دو پرانے مرتبان جو ۱۹۱۲ء سے بھی سیت پسلے کے زیرِ شہ تھے،

اس کو تحفہ تندرستی کے دہانے مرتبان جمع کرنا مولوی عبدالنمان کی بابیوں میں سے ایک تھی۔  
 فخر پر عبدالنمان خاص طور پر مہربان ہو گیا۔ ہمارے اس سے ملاقات کر چار روز ہی ہو  
 تھے کہ اس نے مجھے اپنے دفتر میں ایک طرف سے جا کر پوچھا کہ آیا میں اس کی لڑکی سے شادی  
 کرنا چاہوں گا، جس نے اسی سال میٹرک پاس کیا تھا اور ابھی ابھی شادی کے قابل ہوئی تھی۔  
 میں نے شائستہ انداز میں ایسا کرنے سے اپنی معذوری ظاہر کی۔ میرے اٹھارہ سال سے اسے  
 پہنچا۔

یہ مجھے بعد میں پتہ چلا کہ اس کی لڑکی، کم از کم چالیس برس کی تھی اور قطعی طور پر بھری ہو  
 کی وجہ سے اب تک کنواری تھی۔۔۔۔۔

(۶)

کوئی سات روز کے بعد مولوی عبدالنمان سے ملنے ہمارے میں یہ خوش خبری ملی  
 کہ ہمارا ڈیڑھ منظر ہو گیا ہے۔ چچا عبدالباقی نے عبدالنمان کی بیٹی کو لڑکی کی کوششوں  
 کا نتیجہ ہے۔ عبدالنمان نے اس سے اتفاق کرتے ہوئے اپنے کمیشن کا مطالبہ کیا۔

ہم نے یہ ظاہر کیا کہ ہم اس کا مطلب نہیں سمجھے۔ اسے ساتھ لے کر ہم فوراً ڈائریکٹر آف  
 فشریز کے دفتر میں پہنچے۔ ہیڈ کلرک نے ہم سے شرائط کے فارموں پر دستخط کرائے اور ہمیں  
 ہدایت کی کہ ہم سر دوست دو ہزار روپے کی رقم ڈائریکٹر فشریز کے نام کریڈٹ  
 کرا دیں۔ اس نے ہمیں یہ بھی اطلاع دی کہ ہمارا سپلائیمنٹ ٹرانسپورٹیشن کے نام کو کیا جی  
 گودی میں لگ جائے گا۔ اور یہ کہ ہم ڈائریکٹر کاسٹریٹیوٹ ٹرانسپورٹ کے قریب کو دکھا کر مال کی  
 ڈائریکٹری لینے کے لیے تیار ہیں، ورنہ نقصان کی صورت میں فشریز ڈیپارٹمنٹ پر کوئی ذمہ داری  
 عائد نہ ہوگی۔

”میری رائے میں عبدالباقی خاں“ مولوی عبدالنمان چچا کو ہمیشہ عبدالباقی خاں کہہ کر پکارتا

تھا۔ آپ ٹرا کر کو ان لوڈ (UN LOAD) کراتے کے بجائے ڈاکس (DOCKS) پر ہی مانی کو بندہ کرادیں۔ اس سے آپ لکھو مارکیٹ میں فروخت کرنے کی بجائے بک سے بچ جائیں گے۔

میں یہ مشورہ بڑا اچھا لگا۔ اسی روز کراچی کے توپ و تفلک میں ایک اشتہار دیدیا گیا کہ بھیلیوں سے ڈپٹی رکھنے والے حضرات جمعہ یا سہوار کو بولی دینے کے لیے کیا ڈی ڈاکس پر جہاں چار ٹن بھیلی کا نیلام ہوگا تشریف لے آئیں۔

”جمعہ کی شام کو“ چچا عبدالباقی نے کہا۔ ”پانچ ہزار روپیہ جہادی جیب میں ہوگا۔ بھتیجے بنیاد! میں ابھی سے اپنی جیب میں اسے چھپکتے ہوئے محسوس کر رہا ہوں۔“

جمعہ کے روز ہم دوپہر کے دو بجے ہی کیا ڈی ڈاکس پر جا پہنچے۔ ہمارا تفلک ٹرا رہا کبھی دکھائی نہ دیتا تھا۔ مولوی عبداللہ خان نے جو ہم سے ہمراہ تھا، کہیں سے چٹا کر کے ہمیں بتایا کہ ٹرا رغابت شاہ کے پانچ بیگے چھ نمبر گودی میں برتہ ہوگا۔ ہم نے ایک دو گھنٹے حاجیوں کے ایک جہاز کو دیکھنے میں صرف کیے۔ چار بیگے کے قریب تین چار کاروباری قسم کے لوگ نمبر گودی پر منتظر تھے ہوئے ہمیں نظر پڑے۔ مولوی عبداللہ خان انھیں پہچانتا تھا، اس نے کہا کہ یہ بولی دینے والی پارٹیاں ہیں۔ بقول اس کے ان میں سے ایک کراچی خشک مارکیٹ کی جسکے زبردست پارٹی تھیں۔ کم از کم پانچ بیگے لاکھ کی مالیت کی۔

چچا عبدالباقی اپنے بہترین چڑھتا ہوا انداز میں مسکراتا ہوا ان کی طرف گیا۔

”آپ صاحبان بخور ہی دیر انتظار کیجئے“ اس نے کہا۔ ”تفلک ٹرا ایک آدھ گھنٹے تک

گودی میں لگ جائے گا۔ اسی وقت ہم نیلام کا آغاز کر دیں گے۔“

”کیجئے کنسلہ اندازاً“ ایک لال ڈاڑھی والے شخص نے پوچھا۔

”چار ٹن کے قریب“ بچانے اسے بتایا۔

”بولی دینا ہے تو ابھی دو، ایک میلے کوٹ اور گول ٹوپی واسے میمن نے کہا۔ ہم کو اور بھی کام ہے نا، سالہ۔ اور حوصلی کا دھندلاسی تو نہیں ہے۔“ مولوی عبداللہ نے چچا عبدالباقی اور محمد کو ایک طرف لاکر صحابیہ کو پاؤں تھپتھپاتی ہوئی بڑی بڑی ہیں اور ان کو اس طرح جاتے دینا غلطی ہوگی۔ اس نے کہا کہ نیلام کے لیے ضروری نہیں کہ ٹرالو کے آنے پر ہی کی جائے۔ اس کا آغاز ابھی سے کیا جاسکتا ہے۔

چچا کی خواہش تھی کہ میں نیلام کروں، لیکن میں نے اس کام میں بالکل تجربہ نہ ہونے کی بنا پر صاف انکار کر دیا۔ آخر چار دنوں کا چار چھانے اپنے آپ کو گودی پر پڑے ہوئے ایک کھڑکی کے کریٹ پر کھڑا کر لیا۔ چار پانچ بولی دینے واسے حضرات، ٹاکس کے کچھ مزدوروں کے ساتھ آٹھ بجے اس کے گرد جمع ہو گئے۔

”ناموش صاحبان“ چچا عبدالباقی نے ایک بہترین پیشہ ور نیلام کرنے واسے کے بچے میں کہا: گورنمنٹ فائرنگ کی چارٹن پھیل جو ٹرالو ابھی لا رہا ہے، نیلام کی جاتی ہے۔ بڑے صاحبان۔ چارٹن فٹ کلاس کو اس کو اسٹی اور ہر قسم کی تازہ پھیل کے بچے۔ پامیٹ، جھیلکا اور رنگارنگ کی پھیل کے بچے، بریسے صاحبان۔“

”پانچ روپے کا کسے کوٹ اور گول ٹوپی واسے میمن نے بولی دی دو تین آدمی پہننے۔“ دیکھا پانچ ہزار کے مال کے بچے پانچ روپے“ عبدالباقی نے کہا۔ ”پانچ روپے بارہ آنے“ ایک ہزار ڈالیں واسے شخص نے جس کا چہرہ مجھے بے حد آشاں لگا، آواز دی۔

”چھ روپے“ کالے کوٹ واسے نے کہا۔ ”آپ لوگ مذاق کر رہے ہیں“ چچا عبدالباقی نے انہیں سرزنش کی۔ ”اگر آپ ہی طرح بولی دیں گے تو ہمیں عبور نیلام کو بند کرنا پڑیگا۔“

”دوسروں پر؟“ مولوی عبدالننان نے جبریل دینے والوں میں جا شامل ہوا تھا۔ آواز

دی۔

”دوسروں پر؟ صاحب! دوسروں پر؟ آئیے۔ کم از کم پانچ ہزار کے مال کا دوسروں پر۔“

چھانے چھانے کی مصلحت افزائی کی۔

”دوسروں پر؟ بارہ آنے۔ کالے کوٹ والا بولا۔“

”دوسو ایک“ سبز ڈاڑھی تھی۔

”چار سو روپے“ مولوی عبدالننان نے پھر بولی کو اوپر چڑھایا۔ ہمارے چہروں پر پھر سے رنگ آگیا۔

”چار سو روپے، آئیے۔ چار سو روپے صاحبان۔ چار سو نوٹ کو الٹی، تازہ بہترین نوٹ کے بیسے۔۔۔۔۔ یہ سمندر کی پھیل ہے۔ دریا کے لیا دی میں کچڑی ہوئی پھیل نہیں چھا پھلتی کالج صاحب پراسید اور چڑھا تھا۔“

”چار سو ایک“ پھر کالے کوٹ والے نے کہا۔

”چار سو بیس“ سبز ڈاڑھی نے اچھلتے ہوئے چھا عبدالباقی کی سمت بازو سے

اشارہ کیا۔

”چار سو بیس روپے صاحبان۔ چار سو بیس۔ بحیرہ عرب کی خوبصورت۔ ستھری چار

سو پھیل کے بے صوف چار سو روپے۔ آئیے صاحبان۔ دھیل پھیل جتنی بڑی بڑی پھیل۔“ چھا اب سر پر غلام کرنے والا تھا۔

”ایک ہزار روپے“ مولوی عبدالننان بولا۔

یہ سلسلہ کچھ دیر تک چلتا رہا۔ آخر بولی گیارہ سو روپے تک آکر رک گئی اور چھا عبدالباقی

کی ساری منتوں کے باوجود کوئی بھی عبدالننان کی آغزی بولی کو بڑھانے پر تیار نہ ہوا۔ ہماری

چڑھتی ہوئی امیدوں پر اس پر گئی۔ میں یعنی چچا عبد الباقی کو پر رالیقین تھا کہ بولی چاہتا ہوں  
روپے سے اوپر جائے گی۔

”آپ حضرات، تشریف لے جائیے چچانے خطیں ہو کر کہا: ”آپ نے ہمارا وقت ضائع  
کیا ہے۔“

کاروباری آدمی آپس میں مشورہ کرنے لگے۔ آخر سبز ڈاڑھی والا آدمی چچا کے  
پاس آیا: ”دیکھو بارہ سو روپے میں بات چکی کرو۔ مارکیٹ میں تم کو اس سے آدمی رقم بھی  
نہیں ملے گی۔ پھل بہت آنے کی وجہ سے نرخ بڑے گرے ہوئے ہیں۔ یہ میرا آخری تجویز ہے۔“  
”جسم میں جاؤ“ چچا عبد الباقی نے اس سے کہا۔ وہ چڑ گیا تھا۔

”حاجی صاحب۔ گرمی ہو، سبز ڈاڑھی نے عقل سے کہا: ”میں نے تمہارے فائدے  
کی بات کی ہے۔“ میں سوچنے لگا کہ میں نے اس شخص کو کہاں دیکھا ہے؟  
”جائیے صاحب چچانے کہا: ”میں نے کہہ دیا ہے کہ میں پھل فروخت نہیں کرنا چاہتا۔  
میں ایک پھل بھی فروخت نہیں کروں گا۔“

میں سے دور ہٹ کر ایک سبوری موٹھروں والا چھوٹا سا آدمی مولوی عبدالحق سے کہہ  
رہا تھا: ”اس فنک ٹرال کا ڈوب جانا۔ بڑی ٹریجڈی ہے۔ ہار ہا سٹرکتا ہے کہ اس  
کے پیسے میں سودا خ تھا۔“

میں بدحواس ہو کر چچا عبد الباقی کی طرف بھاگا اور اسے ٹرال کے ڈوبنے کی خبر سے  
مطلع کیا۔ اس نے بڑی دلیری سے اس خبر پر یقین کرنے سے انکار کر دیا۔ اتنے میں مولوی  
عبدالحق اپنی قمیض میں ایک تاقی چال پھتا ہوا آیا۔ اس نے کہا کہ ٹرال کے ڈوب جانے  
سے اسے بے صدا فوس ہے۔

”یہ کوئی اور ٹرال ہو گا، بھتیجی! چچا نے مردانگی سے کہا: یہ ٹرال ہمارا نہیں ہو سکتا۔“

مولوی عبدالغمان کو یقین تھا کہ یہ وہی ٹرالر تھا۔

چچا عبدالباقی نے کسٹم ہاؤس کے دفتر سے بار برہما سٹر کو رنگ کر کے دریافت کیا کہ آیا کسی خشک ٹرالر کے ڈوبنے کی اطلاع آئی ہے۔ بار برہما سٹر نے جواب دیا کہ اسے کوئی علم نہیں لیکن اگر یہ فشر ڈیپارٹمنٹ کے ٹرالروں میں سے ایک ہے تو اسے اس کے ڈوبنے کی بے حد غرضی ہوگی کیونکہ ان ٹرالروں نے باربر کو خواہ مخواہ جاک کر رکھا ہے۔ ہم نے آٹھ بجے رات تک ٹرالر کا انتظار کیا۔ حسیب یہ نہ آیا تو ہمیں یقین ہو گیا کہ یہ ضرور ڈوب گیا ہوگا۔

”اس کا مطلب یہ ہے“ میں نے کہا۔ ”اب ہمیں اگلے ہفتے تک دوسرے ٹرالر کیج کا انتظار کرنا پڑے گا۔“

عبدالغمان نے ہمیں بتایا کہ گورنمنٹ نے اس ٹرالر کی پھل آپ کو شرائط کے مطابق فروخت کر دی ہے۔ اگر خدا نخواستہ یہ ٹرالر ڈوب گیا ہے، تو نقصان آپ کو برداشت کرنا پڑے گا۔ اگلے کچ کے لیے آپ کو مزید رقم جمع کرنا ہوگی۔ جب ہم واکس سے واپس ہوئے تو بچا اور میں دنیا کے دو غلین ترین آدمی تھے۔

( ۷ )

رات کو ۹ بجے مولوی عبدالغمان میرے فلیٹ پر مجھ سے ملنے کے لیے آیا اس کے ہمراہ ایک چوڑے منار اور چھٹی ناک والی ایک چالیس سالہ عورت تھی۔ اس نے اپنی ایئر یوٹائی گرگیاں اور فریک سپن رکھا تھا اس کی ایک ٹانگ جراب کے بغیر تھی۔ میرے دروازہ کو نہنے پر عبدالغمان نے کہا ”میں اپنی بیٹی سے تمہارا اتفاق کرانے آیا ہوں تم اسے نہایت کم سخن اور غلط پاؤ گے۔“

میں نے محض اخلاقیات اس خاتون کو بیٹھنے کی دعوت دی۔ اس نے مجھے کوئی اکتانہ نظروں



سے دیکھا۔

”اس سے کچھ کہنا فضول ہے“ عبدالغمان بولا ”وہ بالکل بھری ہے“  
بڑے انصاف کی بات ہے، میں نے ہمدردی بتائی۔

”اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا“ عبدالغمان نے مجھے ایک حرف سے جا کر سرگوشی میں  
کہا۔

”مولوی عبدالغمان! تمہارا اس سے کیا مطلب ہو سکتا ہے؟ میں نے معصومیت سے

پوچھا۔

”کچھ نہیں۔ کچھ نہیں۔“ عبدالغمان کے سپرد بدل کر کہہ ”اچھا مسٹر بھتیجا مجھے کل شام کے  
یہ ڈنر سوٹ درکار ہے۔ عموامین صاحب اشرفی نے مجھے اور چند اور دوستوں کو کل  
رات ڈنر پر بیچ بکھری میں مدعو کیا ہے۔ مدعو تو انہوں نے دواصل میری بیٹی شریضین  
کو کیا ہے، لیکن چونکہ اس کو میکورٹ کرنے کے لیے ضرور کوئی ہمارا ہونا چاہیے اس لیے  
میرا جانا ضروری ہے۔ چاہو تو تم میں اس کے ساتھ جا سکتے ہو؟“

”میرے پاس ڈنر سوٹ نہیں ہے“ میں نے کہا۔

”عبدالغمان! تمہارے پاس ہے“ اس نے پوچھا ”پچھلے سال اس کے پاس غلاما ڈنر سوٹ  
تھا وہ آج کل اس کے ڈرائنگ روم میں ٹیبل کلائڈ کا کام دے رہا ہے؟“

”تمہارے کسی اور دوست کے پاس ہے۔ مسٹر بھتیجا۔ مجھے ڈنر سوٹ کہیں نہ کہیں سے  
ضرور ملے گا۔“

میں نے اسے جلد ماننے کے لیے لڑنے کی تحریک کے نام ایک تعارفی خط لکھ دیا کہ اگر ممکن ہو  
تو وہ اپنا ڈنر سوٹ ایک رات کے لیے مولوی عبدالغمان کو دے دے۔ ”مولوی عبدالغمان“  
میں نے لکھا۔ ”بڑے شریف اور مہربان مہربان بزرگ ہیں اور ان کی لڑکی شریضین کا ایک

عیب نکال رہا ہے۔ ورنہ وہ بڑی پرکشش اور صلیقہ شمار خاتون ہیں۔  
عبدالحنان اور اس کی بیٹی تھوڑی دیر اور ٹھیرے۔ عبدالحنان اور اصرار کی باتیں کرنا رہا۔  
جانے سے پہلے اس نے مجھ سے پانچ روپے لگے جو میں نے اسے دے دیے۔

(۸)

اگلے دن ہم نشتر بنے دفتر میں گئے۔ وہاں ٹرار کے ڈوبنے کی اطلاع نہیں پہنچی تھی بہت  
لکڑی لے کر ڈیپارٹمنٹ کے پاس لے دے کہے ہیں ایک کام کا ٹرار تھا۔ باقی پانچ ٹرار پڑیل  
میں سو رانوں کی وجہ سے ایک مدت سے بے کار پڑے تھے۔ نشتر ڈیپارٹمنٹ نے انھیں  
سے چار ہزار روپے ماہوار پر ایک ٹیکنیکل اسپرٹ کی خدمات حاصل کی تھیں جو ڈیپارٹمنٹ کو  
سورنوں کے بند کرنے کے متعلق مشورہ دے گا۔

ہیڈ لکڑ سے سننے کے بعد مولوی عبدالحنان اور ہم مزید گفتیش کی خاطر کمپاؤس ڈاکس پر  
جائے۔ غیرہ گودی پر ایک رنگ آؤڈیو (FUNNEL) فنل والی چیز کھڑی تھی  
چھوڑ دی تھی۔ اس سے پھیلنے کی تیز لہر آرہی تھی۔ یہ ہمارا ٹرار تھا۔ اس کے ڈوبنے کی خبر کی  
پرخی اڑا دی تھی۔

ہم نے اب فیصلہ کر لیا تھا کہ پھیل کو نیلام کرنے کی بجائے ہم اسے خود مارکیٹ کر کے  
فروخت کریں گے۔ تین ہزار روپیہ تو ہم کو ٹھیکے کی شرائط کے مطابق حکومت کو ادا کرنا تھا اور  
یہ ظاہر تھا کہ جب تک ہم اس کو کم از کم چار ہزار میں فروخت نہ کریں گے یہ ہمارے لیے  
ٹھکانے کا سودا تھا۔ نیلام میں بولی بارہ سو سے اوپر نہ گئی تھی۔ اس قیمت کو قبول کر لینے کا  
سوال ہی نہ پیدا ہوتا تھا۔

ہم نے ٹرار کے قد میں کوئلہ کرکٹ نشتر کا خط دکھایا اور اس نے کہا کہ ہم پھیل کی ڈیپوری  
کے سکتے ہیں۔ ہم نے فوراً پھیلوں کو گودی پر ان لوڈ کرنا شروع کر دیا۔ چچا عبد الباقی نے لہجے

شہر میں ایک سو خالی بڑیاں لانے کے لیے بھیجا۔ جب میں بڑی مشکل سے خالی بڑیاں لے کر آیا تو پھیلپوں کو ان میں بھرنے کا کام شروع ہوا جو کہیں شام کے پانچ بجے جا کر ختم ہوا۔

پھیلپوں کو چھاونٹ گاڑیوں میں لے کر ہم روانہ ہوئے۔ کل دسے بولی دنیے والوں میں سے ایک ملاج بھی سوجھ دتھے۔ ان میں سبز ڈارمیں والا شخص بھی تھا۔ اب وہ چپ عبدالباقی کے پاس آیا۔

”بادہ سوروپے میں دسے دو—باقی خرچہ میں ادا کروں گا۔ تمہارے خاندے کے لیے کہہ رہا ہوں۔ اس نے پھر عیسیٰ کش کی۔

”میں تم سے کئی بار کہہ چکا ہوں“ چچا عبدالباقی نے چڑکرا سے بتلایا ”لو کہیں یہ پھیلپیں فروخت نہیں کروں گا۔“

”فروخت آپ کیسے نہیں کریں گے۔ آخر اتنی چارٹن پھیلپ کا آپ کیا کریں گے؟

”یہ ہماری مرضی ہے کہ ہم اس سے جو بھی کریں تم کو کیا؟—بتاؤں تمہیں ہم کیا کریں گے۔

ہم ان کو غربا میں تقسیم کریں گے۔ ہم ان کو کھالیں گے۔ ہم ان کو واپس سمندر میں چھینک دیں گے، لیکن تمہیں ہرگز نہ پیچیں گے۔“ چچا عبدالباقی ہفتے میں تھا۔

”آپ کو اسے سمندر ہی میں غابا داپس چھینکنا پڑے گا۔ مارکیٹ میں اسے کوئی دیکھے گا

بھی نہیں؟

”جہنم میں جاؤ“ چچا گرجا۔

”میں تمہارے خاندے کی بات کر رہا ہوں“ سبز ڈارمیں نے کہا ”تم چھپتاؤ گے؟“

”میرا چچا چھوڑو۔ میں نے کہہ دیا ہے کہ یہ پھیلپ فروخت نہ ہوگی۔ کیا میں پولیس کو جاؤں۔

بختیار پولیس کو جاؤں؟“

”جہنم میں جاؤ“ سبز ڈارمیں نے بھی جلتے ہوئے وار کیا۔

”میں تمہیں پہلے وہاں پہنچا کر رہوں گا۔ چھاننے اسے اطمینان دلایا۔

چنا کر ایک دو CHINNA CREEK والی کسٹم کی چوکی پر کسٹم والوں نے ہمارا  
برادرت ضائع کیا۔ ایک دیوبے گارڈ کی سی ٹوپی واسے شخص نے ہم سے دو درجن بوریاں  
کھلا کر اندر سے جھانکا۔ غالباً اس کے نزدیک اس امر کا قوی امکان تھا کہ ہم پھلیوں میں  
سونا چھپا کرے جا رہے ہیں۔ پورے تین گھنٹے ان لوگوں نے ہمیں غراب کیا اور آخر میں انہوں  
نے ایک دو درجن بوریاں اٹھا کر اپنے یہاں رکھ لیں جن کی وہ فرصت کے وقت اعلیٰ طرح  
جانیچ پڑتال کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ اس میں مجھے سبز ڈارٹھی واسے کا ہاتھ معلوم ہوا۔  
اس نے شاید کسٹم والوں کو ہمارے خلاف کر دیا تھا۔ میں نے اسے اس طرح میں کئی دفعہ کسٹم  
کے ایک انپیکٹر کے ساتھ ہم نوالہ وہم یا لدا غار میں سرگوشی کرتے ہوئے دیکھا۔ اس نے ہمیں  
مزدور بتایا ہو گا کہ ہم مسلک بین اور فی الواقع چچا عبدالباقی گودسی پر کام کرنے کے بعد اپنی  
چڑھسی ہوئی آستینوں کے ساتھ کویت یا بحرین کی طرف کا کوئی مشکوک قزاق یا مسلک ہونے کا  
تاثر دیتا تھا۔

کسٹم سے گزرنے کے بعد میں نے سبز ڈارٹھی دلے کو نگاہ میں رکھوہ اب بھی ہمارے  
ہاتھ پیچھے آ رہا تھا۔ ایک لمٹ اس نے ایک حرکت کی جو مجھے بڑی عجیب لگی۔ اس کی ڈارٹھی  
ایک طرف سے اتر گئی تھی اور وہ اسے ہاتھ سے جمانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے اس کو  
چھاننے کے لیے صحیح قسم کی گود استعمال نہیں کی تھی۔ فوراً مجھے پتا لگ گیا کہ اس کا چہرہ  
بکھڑا ہوا تھا۔ یہ شخص محمد حسن اشرفی تھا۔ مصنوعی ڈارٹھی کے ساتھ۔  
میں نے چچا عبدالباقی کو جاکر بتایا کہ میری دلتے میں سبز ڈارٹھی والا شخص محمد حسن اشرفی  
تھا۔

”نہایت اہم میں چہروں کے ڈیڑھ گھنٹے کا مکمل مطلق نہیں ہے“ اس نے کہا۔ محمد حسن اشرفی کی

ڈاڑھی نہیں تھی ؟

جب میں نے اسے ڈاڑھی کو جھانے کا واقعہ سنایا تو اس نے اس پر ہلکا سا ہنسا دیا۔

”اں میں بھی سوچ رہا تھا کہ اسے میں نے کیوں دیکھا ہے اس کے نقوش عوامن اشرفی

سے بہت ملتے جلتے ہیں۔“ اچھا ڈاڑھی پر۔

چچا عبدالباقی سبز ڈاڑھی والے شخص کی طرف گیا۔

”اں تو بارہ سو آپ نے کسے تھے؟ اس نے کہا۔

”اور ان لوڈنگ وغیرہ کا خرچہ بھی روں گا۔“ سبز ڈاڑھی نے خوش ہوتے ہوئے

کہا۔

”بارہ سو روپے“ چچا عبدالباقی نے سوچا۔ ”نوا قبلہ صحت کیجئے۔ آپ کی ڈاڑھی میں دو

تکے اچھے ہوئے ہیں۔“ ایک پھر تیل حرکت سے چچا نے سبز ڈاڑھی کو ہاتھ سے جھٹک دیا۔ ڈاڑھی

بالکل صاف ایک لال اور ٹھوڑی سے اشرفی اور عوامن اشرفی کے آشنا نقوش نمایاں ہو گئے

اشرفی نے ڈاڑھی کو پھر صاف کی جانے کی کوشش کی۔

”تم عوامن اشرفی ہو“ چچا عبدالباقی نے فاتحانہ انداز سے اسے چیلنج کیا۔

”تم نے میری ڈاڑھی پر کیوں ہاتھ ڈالا“ اشرفی بولا۔ ”بوسہ انا تم نے میری جھک کی ہے۔

بیت سے لوگ دیکھ رہے تھے۔“

”تمہاری ڈاڑھی جلی ہے اور تم یقیناً اشرفی ہو۔“

”ڈاڑھی میری اپنی ہے۔ کمال میں چند حیاتیات کی کمی کی وجہ سے یہ کبھی کبھی جھڑنے لگتی

ہے۔“ اشرفی نے کہا۔ ”تھیں اسے جلی کسے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔“

”کیا تم عوامن اشرفی نہیں ہو؟“

”عوامن جانے جسٹم میں۔ میرا نام حاجد جہاں دیں ہے۔“

اب رہنے بھی دو۔ مٹرا شرفی "چپانے سکراتے ہوئے کہا: ہم نے بھیلیاں پہچان لیا۔  
دیے یہ بتاؤ کہ اس طرح کرنے سے مقدار آئیڈیا کیا ہے؟

"محمد احسن کی ایسی تلمیہ میں حاجی چراغ دین، خدرا بھنجن بھلی فروشاں کراچی ہوں؟  
اشرفی نے اصرار کیا: "بولو تو تم بارہ سو روپے میں بھلی فروخت کرتے ہو یا نہیں؟  
"تم ایک کینے رزائل شخص ہو" چپانے کہا۔

(۹)

فشریز کا ہیڈ کلرک جہیں آگے چلے پر رکشا میں آتا ہوا ملا۔ اس نے دیر سے سنبھلنے کی معذرت  
کی اور چچا عبدالباقی کو ایک طرف لے جا کر کہا: "تین من بھلی ابی سینیا لائٹریز کو اور ٹراٹھارہ  
میں پہنچا دیں میری لڑکی کی کل شادی ہے۔ عبدالحنان آپ کو جگہ دکھا دے گا۔  
ہیڈ کلرک رکشا میں واپس چلا گیا۔

نش مارکیٹ میں بایوسی ہمارے منتظر تھے۔ جیسا کہ محمد احسن اشرفی عرف حاجی چراغ دین  
نے پیش گوئی کی تھی۔ وہاں کوئی بھی ہماری بھلی کو خریدنے پر تیار نہ ہوا۔ بیشتر مارکیٹ والوں  
کا سلوک ہمارے ساتھ تمسخرانہ اور ترحم آمیز تھا۔ وہ انہوں نے فوراً بھلیاں پیا تھا کہ ہم بھلی  
کے بر پار کی بجائے بھی نا بھدیوں وہ لوگ دو یا تین بار کھلم کھلا ہنسنے اور عبدالباقی اور میرے  
بارے میں ایسی باتیں کہنے لگے جو کھلی نہیں جاسکتیں۔ آخر ایک بوڑھے دوکاندار نے ہمیں سمجھایا  
"میاں جہاں کا سارا بھلی کا بزنس بڑے بڑے ٹیکے داروں کے ہاتھ میں ہے جنہوں نے آپس  
میں ایک کر دیکھا ہے۔ اگر تم اس بھلی کو یہاں مفت بھی دو تو کوئی نہیں لے گا؟

محمد احسن اشرفی عرف حاجی چراغ دین حیا کے پاس آیا "میں نے آپ کو بتایا تھا کہ بھلی  
ایسے نہیں بک سکتی۔ بارہ سو روپے میں اب بھی سارا لاث لینے کے لیے تیار ہوں۔ خرچہ"  
"اشرفی تم ایک دھوکہ باز ہو، چچا عبدالباقی نے کہا۔ "تم لوگوں نے ہمیں ناکام بنانے

کے لیے سازش کی ہے میرا نام عبدالباقی نہیں ہوگا اگر میں نے تمہیں ایک بھی پھل فروخت کی؟

اشرفی اشرافی کیا کہتے ہو۔ میں حاجی چراغ دین ہوں ۵  
 آٹھ بجے جب ہم پھل کو مارکیٹ کرنے میں کامیاب نہ ہوئے تو عبدالباقی نے فیصلہ کر لیا کہ اسے فی الحال چپا کے مکان واقع میل روڈ کے احاطہ میں ٹھیک کرا دیا جائے۔ چچا کو اس امر کا یقین تھا کہ ایک دو روز میں پھل کے ٹھوک فروش اسے چار ہزار تک دینے پر رضامند ہو جائیں گے۔

ہم نے ابھی ساری امیدیں کھوئی تھیں مگر حالات ناموافقیت اختیار کر رہے تھے۔ پچھلے تجربوں کی بنا پر میں نے اندازہ لگایا کہ چچا کی ایک اور سکیم سرمایہ لگانے والے حصہ دار اختیار نہیں کر چار ہزار کے زیاں میں متلا کر کے اپنے ناگزیر ادھرت نام خاتمہ پر پہنچ چکی ہے۔

(۱۰)

ہم نے پھل کے بورڈ کو چپا کے مکان کے پچھلے احاطہ میں ڈھیر کر دیا۔ یہ احاطہ پہلے ہی کئی بار مختلف اور عجیب و غریب اشیاء کے اسٹور کا کام دے چکا تھا۔ پاس کے کئی ہمسائے دیوار پر سے ہیں بورڈ کو ڈھیر لگاتے دیکھنے لگے اور جو اجرت ہمیں اونٹ گاڑی والوں کو دینا پڑی اس ڈر سے یہاں نہیں دی جاتی کہ کوئی اس پر یقین نہیں کرے گا۔

دو تین دن مارکیٹ میں سرور ڈکوشنوں کے باوجود ہمیں پھلیں کا کوئی خریدار نہ ملا۔ چچا عبدالباقی نے آخر تجربہ پیش کی کہ ہم پھلیوں کو ٹھوک فروخت کرنے کی بجائے پرجن میں بیچیں۔ ایک بورڈ "باقی نش پلائی کپنی" چچا عبدالباقی کے مکان کے چانگ ہر لگا دیا گیا۔ اس کے نیچے ہی گاہکوں کے لیے مختلف قسم کی پھلیوں کی فرس ان کی تھمیں

کے ساتھ چپاں کر دی گئی۔ چچا عبدالباقی اور میں نے ہر ایک دن مختلف پھیلیوں کی منتیت مقرر کرنے پر مصروف کیا۔ پہلے دن کوئی بھی گاہک پھیل خرید کرنے نہ آیا۔ چپ عبدالباقی لوگوں کی پھیلیوں سے اس قدر بے اعتنائی سے متبر اور خفا تھا۔

مولوی عبداللہ خان شام کو اپنے پوسیدہ پس فرور میں آیا۔ ہم نے اس دن سے جب ہم ٹرانس پھیلیاں لائے تھے، اس کی شکل نہیں دیکھی تھی اور چچا عبدالباقی کو یقین تھا کہ وہ بھی محمد احسن اشرفی اور دوسرے لوگوں کی طرح ہمیں تباہ کرنے کی سازش میں شریک ہے۔ آتے ہی اس نے مجھے اپنا پائپ پینے کے لیے پیش کیا۔ جسے میں نے غرور داری کے جذبہ کے تحت قبول نہ کیا۔ اس نے ہمارا حوصلہ بڑھایا پھر اس نے ہمیں اطلاع دی کہ میٹا در کے راحت جان ہرٹل کے منبر حاجی حسین بخش نے اس کا داماد بننا منظور کر لیا ہے۔ شرائط پر دستخط وغیرہ ہونگے ہیں اور ڈھائی سو روپے پر فیصلہ ہو گیا ہے۔ اس نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے میں نے ایک نادر موقع ہاتھ سے کھو دیا۔

عبداللہ خان نے وعدہ کیا کہ آئندہ سے وہ ہمارے نام کمیشن پر باقی فٹ کمپنی کے سیزم کی حیثیت سے کام کرے گا۔ اور ایک دو روز تک اپنے ہونے والے داماد حاجی حسین بخش سے کم از کم پندرہ سیر پھیل کا آرڈر لے آئیگا۔ ہم نے شکردہ بختی کی بنا پر اور اس کے دو غلے پن کو جانتے ہوئے اس سے زیادہ کھل کر باتیں نہ کیں۔ جاتے ہوئے مولوی عبداللہ خان اپنی واسٹ اور میں فور کی جیبوں میں پانچ چھ مختلف قسم کی پھیلیاں ڈال کر لے گیا۔ انہیں وہ باقی فٹ سلائی کمپنی کی پھیلیوں کے لونوں کے طور پر اپنے داماد کو دکھانے کا ارادہ مند تھا۔ یہ مولوی عبداللہ خان کام کا آدمی ہے چچا عبدالباقی نے کہا "مکمل ہے یہ محمد احسن اشرفی وغیرہ سے نہ ملا ہوا ہو۔ اب ہرٹل کے آرڈر شروع ہو جائیں گے۔ ہم بازار سے کیس کم منتیت پر سلائی کر رہے ہیں۔ تم ایک کام کرو۔ کل اپنی جیب میں ایک نوٹ ایک لے



کر کرچی کے بڑے بڑے ہڈوں، ٹلا میٹر، پول، پیس وغیرہ کے میٹروں سے ملقات کروا  
ادمان سے پھلی کے آڈریک کر لو۔ اس سے تمہیں یلہ میں کے کام کا بھی تجربہ ہو جائے گا۔

(۱۱)

چار دن کے بعد پھلی مرنے اور بڑھوڑنے لگی۔ یہ اس قدر تیز اور بے پناہ تھی کہ آدمی  
اسے دو فرلانگ دور سے سوگھوکتا تھا، مسٹر عبد الباقی نے چچا کو الٹی میٹم دیا کہ اگر یہ پھلی فوراً  
یہاں سے اٹھوانے دے گئی تو وہ اپنے بیکے چلی جائے گی۔ چچا عبد الباقی نے مجھ سے عورتوں  
کی خود غرضی اور لنگ لکی شکایت کی۔

اسی دن ساتھ کی کڑیوں اور مکانوں کے ہمارے ایک وفد کی صورت میں چچا کے  
پاس آئے۔ انہوں نے شکایت کی کہ پھلی کی شہزادی دجہ سے ان کی زندگی ناقابل برداشت  
ہو گئی ہے، اور اسے فوراً یہاں سے اٹھا دیا جائے۔  
چچا نے اس پر تعجب کا اظہار کیا۔

”یہ میرا مکان ہے۔ یہاں میں چاہوں تو گھوڑے باندھ سکتا ہوں۔ مجھے فوج کرا  
سکتا ہوں۔ آؤ کاشت کرا سکتا ہوں۔ یہ شہیت مالک مکان یہ حقوق مجھے حکومت کی طرف سے  
حاصل ہیں۔ آپ لوگوں کو پھلی کی بوتال پسند ہے تو آپ کیسے اور جا کر رہ سکتے ہیں مجھے تو  
یہ بوسائیت خوش گوار لگتی ہے۔“

وفد سخت غصے میں رخصت ہوا۔ اس کے بعد وہ چچا کو دھکی دے دی کہ وہ سہیتا نسر  
کو رپورٹ کریں گے۔

مولوی عبداللہ خان اس عرصے میں تین چار دفعہ آیا۔ اس نے ہمیں بتایا کہ وہ آڈریک کھنے  
کے لیے پوزی جان مار رہا ہے۔ آخری دفعہ وہ چار لڑکے وہاں سے اٹھا کر اپنے داماد  
کے لیے لے گیا۔

”میرے داماد کی مالی حالت آجکل اتنی اچھی نہیں“ اس نے کہا، ”اسے میرے آخریں مل  
بجھا دو۔ اس وقت وہ اسے ادا کرنے کے قابل ہو گا۔“

دوسری وقت ایک اور پیشکش لایا جس سے اس پوری سازش کا حال جو ہمیں تباہ کرنے  
کے لیے کی گئی تھی ہم پر کھل گیا۔ تب ہمیں پتا چلا کہ ہمدانی بربادی ایک منظم منصوبہ بازی کے تحت  
پلین کی گئی ہے اور یہ کہ خنڈوں کا ایک پورا منڈیکٹ ہمارے خلاف کام کرتا رہا ہے۔  
مولوی عبدالغمان کراچی کے ایک فنش کنگ کی پیشکش لایا۔

”عبدالباق خاں۔ وہ سارے لاکھ کے لیے چار سو روپے دینے کو تیار ہے۔ میرے خیال  
میں اب تم سے بچھ دو۔ مال سُٹ رہا ہے۔“

”چار سو“ چھانٹنے لگا۔ اس فنش کنگ کا نام کیا ہے۔“

”واجبی چراغ دیں۔ جس نے اس دن ڈاک پوچھ لی تھی۔“

”تمہارا مطلب محمد احسن اشرفی سے ہے؟“

مولوی عبدالغمان کا منہ کھلا رہ گیا۔

”نکل جاؤ“ چچا عبدالباقی گر جاؤ تم سب لوگ ہمیں تباہ کرنے کی سازش میں شریک ہو۔

میں تمہاری شکل نہیں دیکھنا چاہتا۔ براہ مہربانی میرے دہرے تباہی جو میں نے تمہیں دیے تھے  
واپس کر دو۔“

عبدالغمان کو ان الفاظ نے صدمہ پہنچایا۔

”عبدالباق خاں! میں نے آپ کی خاطر اتنی دوڑ دھوپ کی۔ دن رات ایک کیا، ایک بٹھے

سے میں فشنگ کے لیے نہیں جا سکا۔ اس سے میری صحت پر اثر پڑا ہے۔“

”مولوی عبدالغمان“ چچا عبدالباقی نے پوچھا۔ ”اب کچھ کچھ جاؤ۔ تم لوگوں نے کتنے خنڈ

دینے والوں کو اس طرح خراب کیا ہے؟“

”عبدالباقی خاص۔ مجھے فی الواقع تمھاری اس بظمنی سے دل صدمہ پہنچا ہے“

”دراچھا۔ اب دور ہو جاؤ۔ میں تمھاری شکل نہیں دیکھنا چاہتا“

دور ہو جانے سے پہلے عبداللہان نے مجھے ایک طرف سے جا کر یقین دلایا کہ اگر میں نے اس کی بیٹی شریضین کے متعلق اپنی رائے تبدیل کر دی ہو تو وہ مجھے اپنی دامادی میں لینے کے لیے تیار ہے کیونکہ شریضین کو راحت جان مہرل کا میجر پسند نہیں آیا، چار جز“ اس نے کہا۔ ”صرف ڈیڑھ سو روپے ہوں گے“

عبداللہان کے چلے جانے کے بعد چچا عبدالباقی نے فقوڈی دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔ ”جیتے بختیار! ان سب لوگوں نے چھیلوں کے ٹھیکے داروں کو تباہ کرنے کی منظم سازش کی ہے۔ میں اب اس منڈ کیٹ کے طریقہ کار کو سمجھ گیا ہوں۔ پہلے نئے ٹھیکاروں سے منڈر دلویا جاتا ہے اور ان کو خوب لوتا جاتا ہے۔ پھر منڈر کو ایک غریب زمین کے مطابق قبول کر لیا جاتا ہے۔ ٹرالر کے کچھ کی نیلام پر ایک ہزار سے زیادہ بولی میں دی جاتی اور بے چارہ ٹھیکیدار یہ جانتے ہوئے کہ وہ مارکیٹ میں مال کو کھپا نہیں سکتا، آخر مال کو اس قیمت پر ہی فروخت کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اس طرح ٹھیکیدار بھجارسے کا بالکل پیسہ ہر جاتا ہے اور یہ لوگ سانا فائدہ اٹھاتے ہیں۔۔۔ یہ محمد حسن اشرفی، مولوی عبداللہان اور نشریہ کاہید کلک سب اس انجن کے ممبر ہیں۔ حقیقتاً یہ لوگ اس مارکیٹ کو ایک باقاعدہ بزنس فرم کی فائز پر چلا رہے ہیں۔۔۔ تم اخباروں کے دو تین ایڈیٹروں کو جانتے ہو۔ اس مارکیٹ کے خلاف ان میں کھلوان کو ایکسپوز کرو“

”مگر ڈپٹی میگزینی تسلیم و تربیت حیوانات“

”وہ بھی ان لوگوں کے ساتھ شامل ہے۔ وہ شکار چانتا ہے۔ دیکھو بھتیجا رکتا پڑا مارکیٹ ہے“

چچا عبدالباقی اور میں بیٹھے اس سٹیج کیٹ کے میروں کی کیٹلی اور ذالمت پر گرم بحث کر رہے تھے کہ نیچے سے کچھ شور ماسنائی دیا۔ تھوڑی دیر بعد چچا کے ڈکے عبدالرحمن نے آکر ہمیں بتایا کہ دو پولیس میں اور سب سے آدمی نیچے ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔  
 "ان سے کہو میں گھر چلتی ہوں" عبدالباقی نے غسل خانے کا رخ کرتے ہوئے کہا۔  
 میں نے ان سے کہہ دیا ہے کہ آپ گھر پر ہیں۔

"کتنی دفعہ عبدالرحمن میں نے تم کو سمجھایا ہے۔ اچھا ان کو اوپر بلاؤ۔  
 "میں نیچے نہیں جاؤں گا۔" عبدالباقی اس نازک موقع پر بھی وقار اور سوجرات کا ممبر تھا۔  
 ایک دھاریدار ریشی سوٹ میں ایک ہونٹا سا آدمی اپنے ساتھ پولیس میں لیے اوپر آیا۔  
 "آئے۔ صاحبان تشریف رکھیے" چچا عبدالباقی نے کہا۔ "سنائیے۔ کیسے آنا ہوا۔ بخیر یا نہیں سگریٹ پیش کرو۔"

"نہیں میں سیڑیوں کا نہیں" فردا رونے لگا "میں سہیقا انسرجوں آپ کے محلے والوں نے مجھ سے درخواست کی ہے کہ آپ نے یہاں پھیل اٹاک کی ہے۔ جس کی ٹرانڈ کی وجہ سے ان کی صحت خطرہ میں ہے۔ بڑی سڑاندی پھیل رہی ہے"۔  
 مجھے تو نہیں آدھی، چچا نے کہا "کیوں بخیر یا، ہمیں آدھی ہے"۔

"آپ یہاں میونسپل قراحد کے مطابق پھیل اٹاک نہیں کر سکتے۔ یہ کوئی مارکیٹ نہیں۔ مجھے انوس ہے کہ مجھے یہ گھنی سڑق پھیل فورامیاں سے اٹھو کہ دور پھیلانا پڑے گی۔ یہ اب انسانی خوراک کے لیے ٹھیک نہیں رہی۔ پھیلکا نے وغیرہ کا خرچہ آپ کو دینا ہو گا۔ اور میونسپل کمیٹی شہریوں کی صحت کو خطرے میں ڈالنے کی بنا پر آپ کے خلاف مقدمہ دائر کرے گی۔"

"سنو۔" چچا عبدالباقی نے مجھے غائب کرتے ہوئے کہا۔ یہ ڈیوکر ایسی ہے کہ ایک

شخص اپنے گھر میں پھیل جس اشاک نہیں کر سکتا۔

(۱۲)

بچا اور میں بالکونی سے سونپل کیٹی کے آدمیوں کو ہچکڑوں میں پھیل کے بورے لادتے ہوئے دیکھتے رہے۔ ہمارے دل خون کے انورور رہے تھے مگر بے ہمتی۔  
 بانجھ چھ پولیس میں بھی ڈیوٹی پر موجود تھے۔ ظاہر یہ پھیل پھینکوانے کے لیے جا رہی تھی۔  
 بعد میں ہمیں بتایا کہ کئی بورے مارکیٹ میں فروخت ہوئے۔  
 یہ اس پھیلوں کے قصہ کا خاتمہ تھا۔ لیکن یہاں ایک چھوٹے سے واقعہ کا ذکر کر دینا مناسب نہ ہوگا۔

اس کے چند دن بعد چچا عبدالباقی اور میں اعلیٰ سٹریٹ پر مشرگت کر رہے تھے۔  
 اچانک ہم نے سامنے سے محمد حسن اشرفی، اس کی بیوی اور اشرفی بچوں کی پوری فرج کی فرج کو آتے دیکھا۔ وہ ابھی کچھ دور تھے۔ چچا نے میری باندھ ٹوہ کر کہا۔ "سختیار، ادھر آبلو" ہم ایک چھٹی گلی میں ہوئے۔ چچا نے یہاں ایک اشال سے دو دو درجن کچے انڈے خریدے۔ اس نے ایک درجن انڈے مجھے دے دیے۔

جب اشرفی کنٹینٹ سامنے رشک سے گزری تو ہم نے ان پر نشانہ باندھ باندھ کر انڈے مارے۔ — یقین ہے کہ وہ سب اپنے نشانوں پر گئے۔ دوسرے لمحے میں اور چچا عبدالباقی گلی میں جا گئے ہوتے ہیرا ڈانڈ کے جھوم میں مل جل گئے۔ پکڑا کام تو ہی ڈک تھا اور یہ ایک اچھی پکڑ تھی!

# فتارِ ادب

تبصرے کے لیے چار جلدوں کا بیٹھا ضروری ہے۔ دوسری اور تبصرہ نگار کے لیے اور  
 ودان کے احباب میں تقسیم کرنے کے لیے تبصرے کے بعد دوسری اور تبصرہ نگار کی جلدوں کو مکتبہ کی  
 طرف سے آدھی قیمت پر فروخت کیا جاتا ہے۔ چار سے کم جلدیں بھیجنے پر تبصرہ نہیں کیا جائیگا۔  
 ادارہ کے قاعدہ کے مطابق جلدیں واپس نہیں ہوں گی۔ ۱۰

## ۱۔ اندھے بٹیرے و دیگر پرندے

مصنف — بہادر علی خاں

ناشر — حاجی رب نواز اینڈ سنز۔ سوداگراں کتب خانہ، مارکیٹ کراچی۔

صفحات — ۲۲۵ دس پیاس صفحے کا دیباچہ اور پچیس صفحے کے اشتہارات اس میں شامل

ہیں۔

قیمت — پانچ روپے فی جلد (عام خریداروں سے) ایک روپیہ آٹھ آنے

فنا جہاں کتب سے )

اندھے بٹیرے و دیگر پرندے اردو زبان میں اپنے اچھوتے موضوع پر پہلی کتاب  
 ہے۔ نکل صاحب ٹوبہ ٹیک سنگھ کے مشہور بٹیراؤں اور شکارچیوں میں سے ہیں اور ادب میں  
 نئے نئے جلوہ نما ہوئے ہیں۔ ہم اسے ادب کے لیے ٹیک قال سمجھتے ہیں اور نو برسر  
 سے ان کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ نکل صاحب قلم کے بھی اتنے دھنی ثابت

ہوئے ہیں، جتنے حال اور غیل کے۔ ان کے قلم نے رنگینی بیان میں کھل کر طرار سے بھرے ہیں۔  
 نکل صاحب نے کتاب کے شروع کی تقریظ میں اپنے بچپن اور جوانی کے سیر حاصل  
 حالات زندگی بکھو دیے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ طائر نوازی اور میاوی ان کی گھٹن  
 میں دو بیت ہوتی تھی۔ ان کے والد خان کے نامی بکھو تر بازوں میں تھے۔ نکل صاحب  
 لکھتے ہیں کہ بچپن ہی سے مجھے بیڑ بازی، بکھو تر بازی اور تیروں کی لڑائی کا خبط تھا۔ میرے  
 والد مجھے اس سے منع کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ بیٹا تم میری دیکھا دیکھی کیوں عاقبت  
 خراب کرتے ہو، آج کل اسے مغزو پیشہ نہیں سمجھا جاتا۔ نکل صاحب سبیلہ خاندانی پیشے کو کیسے  
 چھوڑ دیتے۔ ایک دو بار والد نے انہیں چٹا بھی لیکر اس کا ان پرانا اثر ہوا۔ ایک دن بکھو تر  
 اڑاتے اڑاتے کھٹے سے نیچے اگر سے اور ٹانگ ٹوٹ گئی۔ دوسرے ہسپتال میں رہے۔

بعض باتیں نکل صاحب نے کتاب میں ایسی لکھ دی ہیں جن کی قطعاً ضرورت تھی۔  
 مثلاً وہ اقرا کرتے ہیں کہ وہ ایک مدت تک یاروں کے بکھو تر چڑا چڑا کر اپنا کباب بھرتے  
 رہے۔ آخر کپڑے گئے اور یاروں کو انہوں نے ان کی مرمت کی اور ان سے صفت نامہ لکھوایا کہ چر  
 ایسا نہیں کروں گا۔ ایک دفعہ گوشت کی مارکیٹ سے بیڑوں کا ایک ٹوکرا دوکاندار کی نظر جا کر  
 اٹھا لائے۔ ہماری نظر میں ایسی باتیں لکھنا ان کے لیے واجب تھا۔ ایس صاف گوئی سے تمام  
 طبع طاثر نواز غیر صحت مند اثر قبول کریں گے۔ نکل صاحب کو چلیے کہ اگلے ایڈیشن میں سے  
 یہ قابل اعتراض حصے حذف کر دیں۔ ایک نفس اور بھی کشمکش ہے۔ نکل صاحب پر بندوں  
 کے شوقی ذکر کرتے کرتے یہ سمجھنے لگے ہیں کہ گویا وہ خود بھی پرندہ ہیں اور ان کے ساتھ پرواز  
 کر رہے ہیں۔ اس سے مضمون کی سنجیدگی پر حوت آتا ہے۔

نام کتاب "اند سے بیڑے" کی موزونیت کا جواز پیش کرتے ہوئے نکل صاحب نے  
 دانے ظاہر کی ہے کہ بیڑے جب پکڑے جاتے ہیں تو دانے کے لالچ میں اندھے ہو جاتے

ہیں اور ان کو پس و پیش سبھانی نہیں دیتا۔۔۔ فلک صاحب یہ کہتے ہیں تو ایسا ہی ہو گا جہاں عالم اس میدان پر صفر ہے۔ بہر حال نام کے موزوں ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ ادبی جہد کے اس دور میں یہ جدت قابلِ تائش ہے اور فرح بخش بھی۔

دوسرے پرندے جو اس ناورد کتاب میں فلک صاحب کے ہمراہ کلکاریاں بھرتے ہیں کبوتر، مینا، کراہیل اور بیل ہیں۔ لقمے کبوتر، چنگ کبوتر اور قندر کبوتر پر الگ الگ باب ہیں۔ جن میں کام کی باتیں ہیں، اور کبوتروں کی نجی زندگی کی حیرت خیز حکایاں فلک صاحب نے نہایت خوش اسلوبی سے بیان کی ہیں اور کمال یہ ہے کہ ایسا کرتے ہوئے انہوں نے عربیانی سے دامن بچا لیا ہے اور کہیں بھی قافوں کی زد میں نہیں آتے۔ چیل کے متعلق ان کا خیال ہے کہ یہ بات کہ چیل دھوپ میں انڈہ چھوڑ دیتی ہے غلط ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ چھپاتی دھوپ میں کئی کئی گھنٹے اس امر کی تحقیق اور مشاہدے کی خاطر سرگرداں پھرے ہیں لیکن ایک بار بھی کسی چیل کو انڈہ چھوڑتے نہیں دیکھا۔ ہمیں ان سے اختلاف ہے۔ دیکھا تو ہم نے بھی نہیں مگر محاورہ غلط نہیں ہر سکتہ بہر حال اس موضوع پر دلچسپ بحث ہو سکتی ہے جس کے لیے اس پرچے کے صفحات ہمیشہ حاضر ہیں۔

عبادت سلیس اور عام فہم ہے۔ کبوتر فلک صاحب نے آٹھویں کے بعد ہی اسکول کو خیر باد کہہ دیا تھا۔ کتابت کی غلطیاں البتہ جا بجا ہیں۔ کاتب اچھا نہیں ملا اور فلک صاحب خود دنگر مصروفیتوں کی وجہ سے نظر ثانی نہیں کر سکے۔ پہلے ہی صفحے پر فلک صاحب کا نام فلک کے بجائے فلکی پڑھا جاتا ہے۔ اسی طرح کاتب نے ہر جگہ چیل کو چیل لکھا ہے۔ دو تین مقام پر بیل فلکی ہو گیا ہے۔ ممکن ہے کاتب اندھا ہو۔

ہم فلکی صاحب کو ان غرضوں سے بری الذمہ قرار دیتے ہیں۔ کتاب کے شروع میں فلکی صاحب کے ایک دوست کا دیباچہ بھی شامل ہے۔ یہ صاحب



ہاں نواز کا لقب استعمال کرتے ہیں اور جلد ساز ہیں۔ چنانچہ اس کتاب کی جلد جو انہی نے  
باندھی ہے۔ جلد مضبوط ہے۔ سر رنگے سرورق پر ایک ٹیل کی تصویر ہے جو چمیل سے زیادہ مثلاً  
ہے۔ کسی جدید آرٹسٹ کا اہواز ہے۔ مجموعی طور پر کتاب خوب ہے۔ ہمارے احباب نے  
بھی اسے پسند کیا ہے۔ ناشرین سے گزارش ہے کہ ہر کے تو دو جلدیں اور بھجوا دیں۔  
کیونکہ کتب کے لیے اب کوئی جلد اس کتاب کی ہمارے پاس موجود نہیں۔

## ۲۔ دوشیزہ کا فان عرف کاہلی مجاہد

اسلامی تاریخ کے ناول

مصنف ——— ٹکین خلد آبادی

ناشر ——— اسلام بک ڈپو ٹنڈو آدم

صفحات — ۸۹۵

قیمت ——— آٹھ روپے پندرہ آنے

ایک سال کے قبل عرصے میں یہ ٹکین خلد آبادی صاحب کا ساقاں اسلامی تاریخی ناول  
ہے۔ ٹکین خلد آبادی کو اس ڈھنگ کے کہنے والوں میں متعلق تمام حاصل ہے۔ ہم نے اس  
ناول کو کہیں کہیں سے دیکھا ہے لیکن ہمارے احباب میں سے کوئی ایک سے بڑھ چکے ہیں، اور  
اب ٹکین صاحب کے ساتھیوں ناول کے لیے کتب میں آئے بیٹھے ہیں۔ ہم نے انہیں یقین دلایا ہے  
کہ ان کی مراد جلد پوری ہوگی، تھوڑا صبر کریں۔

ناول بے حد دلچسپ ہے۔ مکالموں کی روانی اور واقعات نگاری کی لطافت کے لیے  
ٹکین صاحب سچے ہی نابالو مہر چکے ہیں۔ کہنی ایک مکالمے تین تین صفحات تک چلے گئے  
ہیں اور بولنے والے کو خشک نہیں ہوتی۔ ایک جگہ کاہلی مجاہد بالاکوٹ میں پر دے کی آرٹ

سے ہر دینی اور عیسائی سے ملاقات کرتا ہے، تو بے تکان بڑی فصیح اور مرصع اردو میں کئی کئی صفحے تک بڑے چلا جاتا ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ اس زمانے کے کاہلی کتنے فصیح البیان سچے تھے۔ آج کل کے نوجوان کاہلی مجاہدان کی جگہ پر ہوتے تو بے نقاب جھانکنے لگتے اور چند ٹوٹے پھوٹے نعروں سے زائد کچھ نہ کہہ سکتے۔

اسلامی تاریخی ناول نگاروں کو عمر ناکرداروں کے نام تلاش کرنے میں وقت پیش آتی ہے۔ ملکین صاحب نے اس وقت پر یوں قابو پایا ہے کہ کوئی سے دو نام لے کر بیچ میں 'بن' یا 'ابن' جوڑ دیتے ہیں۔ کاہلی مجاہد کا نام احمد بن اکرم ہے، آج کل کتنے کاہلی خان ہمسلاتے پھرتے ہیں۔

ملکین صاحب کا تاریخی مطالعہ وسیع ہے۔ اس ناول سے ہمیں پتا لگا کہ حضرت اوزنگ زیب عالمگیر کے زمانے میں بھی تاریخی کارواج ہو چکا تھا اور مکاناتوں میں گیس بھی بجلائے جاتے تھے۔

ملکین خلد آبادی کی یہ تازہ ترین کوشش ہر پڑھنے والے کو ان کی تاریخی معلومات اور قدرت بیان کا قائل کر دے گی۔ کیا ہم ان سے درخواست کر سکتے ہیں کہ ہمیں بتائیں کہ آپ نے یہ معلومات کون سی کتب سے فراہم کی ہیں؟ ہم بھی اپنے تاریخی علم کو آپ ٹوڈیٹ کرنا چاہتے ہیں، جو بے حد کشش ہے۔ مزید ان سے اتنا س ہے کہ آپ نے اپنے پہلے ناولوں کے چند مکالموں کو حسینہ انٹرنیٹ الفاظ میں اس ناول میں استعمال کیا ہے۔ اس سے احتیاب کریں کہیں تو بہتر ہے۔ اسی سے یہ ناول پڑھتے ہوئے ہیں۔ شب گذرا کہ ہم نے اسے پہلے کہیں پڑھا ہے۔ ٹائٹل دوبارہ دیکھا تو اطمینان ہوا۔

ناول کی قیمت موجودہ منگائی کو دیکھتے ہوئے نہایت مناسب ہے، بلکہ کم ہے۔ کتابت طباعت نفیس ہے۔ کاغذ ناشر نے نہایت کچھا اور دیزنگایا ہے۔ خدا جانے اسے کہاں

سے دستیاب ہوا۔ ہمیں تو چکا وڑکے سے عام کرنا غلطی ہی شکل سے ہاتھ آتا ہے۔ ناول کے سرورق پر کاہلی عباد کے چہرے پر ڈاڑھی دکھائی گئی ہے۔ حالانکہ ناول میں اس کا کوئی تذکرہ نہیں۔ سرورق کے دوسری طرف نادر شاہی خضاب کا اعلان بھی خوب ہے۔ ناشر سے گزارش ہے کہ چار جلدیں خریدیں پھر دس پہلی جلدوں کا کچھ تپائیں کہ کہاں ہوئیں۔

## تسخیرِ جنات

حصہ اول و دوم

بمبئی تصنیف و تصنیف

مصنف — خاکپائے اولیاء فقیر حلال شاہ صاحب

ناشر — جنات پبلیکیشنز

صفحات — دوسو

ہدیہ — دو روپے رعام خریدلوں سے، تین روپے راشن و

امراء سے،

مذکورہ بالا کتاب اردو ادب میں اپنی نوعیت کی منفرد تصنیف ہے اور ہمیں امید ہے کہ یہ ہمارے روحانی اور جاتی ادب میں ایک بڑے خلاء کو بطریق احسن پُر کرے گی۔ پہلی ذوق اور جنات کے ستائے ہوئے تیرہ مجلوں کے لائحہ عمل ایک مدت سے ایسی ہی کتاب کی ضرورت محسوس کر رہے تھے۔ چنانچہ ہم نے ماہنامہ ”چمکا وڑکے“ میں ایسے حضرات کے متعدد خطوط بھی شائع کئے ہیں جن میں انہوں نے ہم سے یہ درخواست کی تھی کہ جنات کے رامن کرنے کی کوئی میاری کتاب ہماری نگاہ میں ہو تو انہیں مطلع کریں۔ ہم عدیم الغرضی کی وجہ سے ان خطوط کا جواب مذکورے سے۔ سچ یہ ہے کہ کوئی میاری تصنیف اس

موضوع پر ہماری نظر میں بھی نہ تھی۔ حالانکہ چمکا ڈرنے کے ڈیکلریشن داخل کرنے کے وقت ہی سے ہم خود ایسی کتاب کی تلاش میں تھے۔ تاربین کے خطوط میں سے ایک خط ایک جن کا بھی تھا۔ اس نے اپنا پتہ نہیں لکھا تھا۔ بعض باتیں جو اس نے ہمارے متعلق لکھی تھیں، غالباً غلط فہمی کی بنا پر تھیں ورنہ ہمیں اہل جنات سے کسی قسم کی ذاتی پر غاش نہیں۔

عمر صہ ہوا کہ درگاہ بک ڈپو کی مطبوعہ ایک کتاب جنات کے پوشیدہ اور پراسرار حالات پر ایک کرمز کے پاس دیکھی تھی، لیکن وہ تصنیف کچھ اس لحاظ سے ادھوری اور تشہیقی کرکشی ایک مشہور جنوں کے نام اور سوانح عمری ایک اس میں درج نہیں اس کے علاوہ اس میں ایک خامی یہ تھی کہ جنات کی تفسیر کے جو طریقے اور فہمے بتائے گئے تھے وہ بے حد مشکل اور پرانے تھے۔ مصنف یا خود جنات ہی ان پر عمل کر سکتے تھے۔ وہ کسی انسان کے بس کا لوگ نہیں تھے۔ جلال شاہ صاحب کی تصنیف جامع توہنیں کہی جا سکتی پھر بھی بڑی حد تک ان غلیروں سے مبرا ہے۔ اس میں تقریباً سب اہم جنات کی مکمل سوانح عمریاں موجود ہیں اور کتاب کے اخیر میں اشاریہ بھی ہے جس سے فوراً پتا چل سکتا ہے کہ کس جن کے حالات یا ذکر کتاب کے کس صفحہ پر ہے۔ البتہ جنات کے نام سچے معلوم ہونا ضروری ہیں۔ سب سے بڑی خوبی کتاب کی یہ ہے کہ جنات کی تفسیر کے طریقے سہل ماڈرن اور سائنٹیفک ہیں۔ مصنف کا طرز نگارش بھی کھلے۔ ان کا اصلی نام بتانے کی ہمیں اجازت نہیں، لیکن وہ اردو کے ایک مشہور و معروف تنقید نگار ہیں۔ ادنیٰ جہود کے بعد تنقید نگاروں کے لیے کوئی کام نہیں رہا۔ اس لیے وہ ادب کی دوسری اصناف کی طرف توجہ دے رہے ہیں۔ یہی سبب کے لیے نیک نال ہے۔

شاہ صاحب کو جنات اور جہوت پریت کا خاصا علم ہے جو ہماری رائے میں محدود ہے چنداں وہ ان ادبا کو ہی نصیب ہوگا۔ چنانچہ صفحہ پچتر پر خود رقم طراز ہیں "جنات کا بادشاہ ڈخواب والد صاحب قبلہ سے درس لینے آیا کرتا تھا، اور ان سے سمیت تھا۔ اس فقیر کا بھی

دخلا اور دوست ہے۔

ان کے جنات کو تسخیر کرنے کے نسخے خود ان کے اپنے آزمودہ ہیں۔ شاہ صاحب کے مسل اور تیرہ بیعت فنون کو پرانے مشکل اور ناقابل عمل فنون سے وہی نسبت ہے جو غالباً ہومیو پتھی کو ایلمینٹس سے ہے، گویا وہ جنات امراض کے ہومیو پتھی ہیں جو ایک چار آنے کی خرداک سے برسوں کی بیماری کو پنج و بن سے اکھاڑ دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر صفو از نالیس پر ہری نلگہ جن کو دور کرنے کا نسخہ لکھا ہے۔ مسولا ہیٹ سر پر رکھو اور مصلے پر ہلیہ کو چار دس گوب دیکلے کے یا کس اور بڑھیا بانٹ کے ہوں تو بہتر ہے، ایک وقت میں بے کر سلاڈ۔ دھوئیں کو تھنوں کی داہ سے چھوڑو۔ انشاء اللہ ہری نلگہ تھنوں سے دھوئیں میں تحلیل ہو کر فارج ہو جائیگا۔ میرا پانا آزمودہ ہے۔

اس مسل نسخے کے برعکس ہری نلگہ جن کو دور کرنے کا نسخہ پرانے عاملوں اور کھائے روحانی کی بیاضوں میں درج ہے اس میں باقی دیاقتیں اور روزشیں تو ایک طرف صرف میں روز کا چلہ (بجری کے دودھ پر) ہی خود عمل کرنے والے کو جن بنانے کے لیے کافی ہے۔ اس نسخے سے کتب کی افادیت کا اندازہ ہو جانا چاہیے۔ شاہ صاحب کے نزدیک کئی انسانی امراض کا سبب جنات ہیں۔ دق کی بیماری کا ذمہ دار انہوں نے ایک جن ہو چاموچی کو بتایا ہے۔ ایسا ہی ہو گا۔ ہم نے تو ہو چاموچی کا نام بھی پہلے نہ سنا تھا۔ اسی طرح انہوں نے ہماری کئی معاشی خرابیوں کو بھی جناب سے منسوب کیا ہے اور فرمایا ہے کہ رشوت خوری، ذخیرہ اندوزی، خود غنائی، غزل گوئی، یہ سب امراض جنات کی پیدا کردہ ہیں۔ انہوں نے ایک دوست کا ذکر کیا ہے، جو پہلے بھلا چنگا تھا ایک طفت غزل گوئی کرنے لگ گیا پانچ پانچ غزلیں روزانہ نظم معر میں لکھتا تھا اور انہیں ڈاک میں بھیج کر ٹھنڈی آپیں بھرتا تھا۔ شاہ صاحب تار گئے مگر اس پر سلطانہ نامی کوئی جن سوار ہے اس

شخص کے والدین سخت پریشان تھے۔ شاہ صاحب نے اس کا علاج کیا اور سلطانہ سجن کو نکالا۔ آج کل بقول مصنف وہ شخص بالکل صحت یاب ہے اور ہر روز کھڑے ہے۔ افسوس! اثرِ شے کے ایک ہٹل میں ہیڈ ہر سچے سلطانہ کے جانے کے بعد اس نے معرا چھوڑ دیا۔ غزل تک نہیں لکھی۔ حقیقتاً شاہ صاحب نے یہ کتاب لکھ کر جنات کی دُشمنہ دوانیوں اور فتنہ پردازوں کو بے نقاب کر کے ملک و قوم کی ایک خدمت سرانجام دی ہے۔ ادارہ ”چنگا ڈھ“ نے اس تصنیف گراں پایہ کو اول درجے کا انعام دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ چنانچہ اس ماہ سے ”چنگا ڈھ“ جلال شاہ صاحب کے نام ایک سال کے لیے بالکل مفت جاری کر دیا گیا ہے۔

کتاب صوری و معنوی کا جس سے بھی آراستہ ہے، نامہ جنات کی دس تصاویر اور خاکے شامل ہیں۔ مصنف کی اپنی تصویر بھی انہی تصاویر میں آگئی ہے۔ جس سے بعض اصحاب کو غلط فہمی ہو جانے کا احتمال ہے۔ ہرچیز تو کوئی نہیں لیکن ان کی تصویر کتاب کے شروع میں ہوتی تو زیادہ موزوں تھا۔ گرد و پیش پر ہری شگن کی سرنگی تصویر سے حالانکہ نام نیچے مصنف کا لکھا ہے۔

ہمیں مہلدا اینڈ سنز کی دس جلدیں برائے تبصرہ موصول ہوئی ہیں۔ دوسرے ناشرین کو بھی چاہیے کہ اس مسئلے میں سخت سے کام نہ لیا کریں۔

یہ کتاب مصنف سے پوری قیمت پر یا کتبہ چنگا ڈھ سے نصف قیمت پر حاصل کی جاسکتی ہے۔ مندرجہ ذیل موصول شدہ کتب پر تبصرہ آئندہ کے ”چنگا ڈھ“ میں ہوگا۔

۱۔ در نامہ یک جرس کا درواں دطویل ترین تشیل نظروں کا مجموعہ، از حضرت اور میں اسلامی۔  
۲۔ نور الدین پاشا عرف ترکی حرم کے دار۔ اسلامی تاریخی ناول، از ملکین خلد آبادی (۳)  
۳۔ آسمانی سفر نامہ از مولانا عبد القدیر خانوس، تمہیم التقید (بہت ٹھوس تنقیدی مقالے)، از پروفیسر ڈاکٹر کرم الہی نقاد۔

نوٹ :- مقالاتِ عالی پر تبصرہ نہیں کیا جائے گا۔ ناشرین نے ہمیں صرف  
تین جلدیں کتاب کی بھیجی ہیں۔

# ایک باتصویر سوسائٹی میگزین

سال ہی میں میں ایک انگریزی کے سوسائٹی میگزین سے کچھ کچھ وابستہ ہوا ہوں۔ حاجت ان معنوں میں کہ گواہ کی اداوت اور اشاعت کا مجھ سے مطلقاً کوئی تعلق نہیں لیکن اس کی ہرے والی مدیرہ مس نیک پر دین میری مزہ لوبی خالہ میں میں نے انہیں پچھلے مہینے ہی دریافت کیا ہے۔ کیونکہ جب سے میری دو حقیقی خالائیں ایک کے پیچھے دوسری آتے کو پیاری ہوتی ہیں میں نہی خالائوں کی ٹوہ میں رہتا ہوں۔ ان دنوں ایک ہمدرد سنگھڑ خالہ کے بغیر زندگی گزارنا محنت ہے۔

مس نیک پر دین جو سوسائٹی میگزین نکال رہی ہیں۔ اس کا نام دی ویلورٹر (THE VIEWER) ہوگا۔ پہلے شمارے کی ترتیب تقریباً مکمل ہو چکی ہے ”مٹکری چہر“ تھان چہر“ دلا ہوہر کا خاک“ کراچی ڈیزائنڈ ٹائٹل“ کے مستقل فیچر لکھوائے جا چکے ہیں۔ ڈیٹیکٹریشن کے صفحہ میں ناگزیر تاخیر کی وجہ سے میگزین ابھی چھپ کر مارکیٹ میں نہیں آ سکا، جو بڑی آفسنگ بات ہے۔ ایک مہینہ اور دیر ہو گئی تو خالہ کو ب فیچر دوبارہ لکھوانے پڑیں گے۔ اور فوٹو بلاکوں پر جو محنت لگی ہے وہ الگ اکارت جائے گی۔ مس نیک پر دین جب سے میری خالہ بنی ہیں مجھ پر خاصی مہربان ہیں اور میگزین کے بارے میں مجھ سے ہمیشہ مشورے لیتی ہیں چند دن ہوتے جب میں انہیں منے گیا تو انہوں نے مجھے ”کراچی ڈیزائنڈ ٹائٹل“ کا فیچر لکھنے کو دیا۔ اور کہا کہ اسے برش اپ کرنے کے بعد واپس لوٹا دوں۔ یہ فیچر مس نیک پر دین کی ایک عزیزہ کا لکھا ہوا ہے جو کراچی میں کسی کالج میں اکتاپ علم کر رہی ہیں۔



افسوس کہ میں اپنی خالہ کی شفقت کے لائق ثابت نہیں ہوا۔ فیچر کو پڑھتے ہی میری باہیں کھل گئیں۔ میں جانتا ہوں کہ اس فیچر کے اردو ترجمہ کو قبل از وقت اشاعت کے لیے دیکھیں نہ صرف ایک ناقابل معافی جرم کا ارتکاب کر رہا ہوں بلکہ مجھے ایک ایسی خالہ سے بھی ہاتھ دھونے پڑیں گے جو شکل سے دستیاب ہوئی تھیں۔ میں سب سوچ بچار کے بعد یہ پرخطر قدم اٹھا رہا ہوں۔ آخر اردو پڑھنے والوں کو ایسے منفرب فیچر سے کیوں محروم رکھا جائے اور یہ میں کراچی کے شب و روز میں نیک پر دین کی بھانجی کی نگاہوں سے۔

## کراچی کے شب و روز

کراچی میں ان دنوں بڑا سناٹا موسم ہے۔ سمندر کی ٹھنڈی ہوا دونوں کو لہراتی ہے۔ گھاس بنزقن ہے اور درخت ہرے جیسے۔ قدرتا ایسے موسم میں پارٹیاں دینے اور پارٹیوں پر لانے میں حلف آتا ہے۔ ہوٹل میٹروپولیٹن بیچ مگنڈی اور کراچی کلب ان خوش پوشاں گھومتے ہوئے لوگوں کی آماجگاہ ہیں جو کراچی کو جیت بنانے پر گریاتے ہوئے ہیں۔

## یوم آزادی

طوابع کی جمہوریہ کا یوم آزادی منانے کے لیے طرمانوی سفیر کا ڈنٹ ڈرا کر لانے اس بار اپنے گھر میں ڈنڈیا کا ڈنٹس ڈرا کر لایا جو اپنے پالتو ایرانی بے 'چنوا' کا علاج کرانے سوئے ہوئے گئی ہوئی ہیں اس لیے یہ استقبال سردوں کے لیے مخصوص تھا۔ عورتوں کو قدرتا بڑی مایوسی ہوئی اور کئی سردوں کو بھی — سرد ہونے اور میزوں کی جھاڑ کا انتظام ان سلیقہ شنار اور خنک خواتین عجم گلابی ہنسر ہزار قرابین انصاری بھوانی کی تحویل میں تھا اور انہوں نے اسے بہ حسن و خوبی سرانجام دیا۔ وہ پورا دن اپنے گھروں سے غائب رہیں۔ طرمانیہ کا جھنڈا لہرا رہا تھا۔

کاغذی پھولوں سے سجے ہوئے گلے جا بجا محرابوں اور دیواروں سے آویزاں تھے۔ اولین سے اصل پھولوں کی سی جھلک آتی تھی۔ قرابین انفرادی البجرائی کاغذی چولوں کو مضر کرنے میں بڑا کمال رکھتی ہیں۔ چونکہ یہ بڑا ہی خاص فنکشن تھا اس لیے برفے میں سالم بریان ہرن، پھل کے قسطے، مرغ پلاؤ، سلاوا، چکن سلاوا، پھل سلاوا، سوڈا منٹ وغیرہ چنے گئے تھے۔

بلکم گلانی نے جن کے ذمے یہ کام تھا، ہر چیز پر ہی خوبی سے میز پر سجائی تھی۔ قرابین انفرادی البجرائی سٹرکلب علی وہیں اور کاؤنٹ ڈرا کر لاکا بل ٹیریر کتا نیچے پر ساتی میں بٹھرتے مگر اگر کوئی خواتین غلطی سے آجائیں تو انہیں روک لیں۔ خواتین تو نہیں آئیں البتہ بچے چھ بن بلائے مہمان ڈز چیکٹ پہنے ایک ٹیکسی میں سے اتارے لیکن کلب علی وہی نے جو ایسی صورتوں کو فوراً جانپ جاتے ہیں، انہیں خوش اخلاق اور خندہ پیشانی سے تباہ کر کے وہ غلط جگہ پر آگئے ہیں۔ بل ٹیریر کو دیکھ کر وہ فوراً ٹیکسی میں بیٹھ کر چلے گئے۔ ان کے جانے کے پانچ منٹ بعد ہی ایک اور شخص ایک مصنوعی ڈاڑھی لٹکائے آیا۔ اس نے خود کو غریب کا قنصل بتایا۔ اس کے پاس طرہ یا یہ نشان سے مزین دعوتی دتہ بھی تھا۔ بل ٹیریر اس قدر غرضی قنصل کو شریک کبھوڑ آیا۔ کیونکہ ہر ایک جانتا ہے کہ غریب کا کوئی قنصل خاندان پاکستان میں نہیں۔ ایسے شہر لوگ اب اس شہر میں بہت ہو گئے ہیں، جن کا شغل مانگنے کے ایوانگ سوٹ پہن کر پارٹیوں میں جا گھٹنا ہے، اور حکومت کمان کے بارے میں جلد کوئی موثر قدم اٹھانا چاہیے۔

سو کے لگ جھگ معزز اور میز مہمان اس فنکشن میں شریک ہوئے۔ شریک ہونے والوں میں پر جہد اختراعات جمال گوٹھ، شیخ بازید اور، سٹرکلیڈس آف رائل ٹیکال، کینیڈا، ڈاکٹر نعمان، صدر شعبہ منطق اور اے پی مولانا آف گوب ٹراٹر ٹریڈ سوسائٹی شامل تھے۔

## ایک عزیزی ڈنر

دیو دی تانیا کے کرٹ اور کرٹ کے وزیر موسیو ایم فائنات ان دونوں اپنے ملک کی کرٹ ٹیم کے ہمراہ کراچی آتے ہوئے ہیں۔ دیو دی تانیا کے نائب کنصل اور میڈم تاپورا نے ان کے اعزاز میں اپنے خوشنما محل میں ایک چمکناک استقبال کیا جس میں حکومت کے سیکرٹریوں، سفارتی اراکان، معزز تجار اور دونوں ملکوں کی کرٹ ٹیموں کے کھلاڑی شامل ہوئے۔ موقع کی مناسبت کے لحاظ سے کھلاڑی اپنے ہیٹ ساتھ لائے تھے۔

گھروں پر استقبال دینے کا دلچسپ حکم ہر چلا ہے۔ دراصل ہوٹل میں اس خاصیت کا احساس مفقود ہوتا ہے جو گھروں میں ہوتا ہے۔ پھر ہوٹل والے بل بھی بڑھا چڑھا کر بناتے ہیں۔ شکریہ کہ اس استقبال میں ٹور میں بھی مدعو تھیں۔ جب میں وہاں پہنچی تو میں نے دیکھا کہ بچاری میڈم تاپورا پورچ میں اکیلے کھڑی ممانوں کا استقبال کر رہی ہیں۔ موسیو تاپورا پورا دو گھنٹہ پہلے فارغ کا محفل ہوا تھا اور ان کا شو فرامین کار میں ڈاکو دی حالت میں سول ہسپتال لے گیا تھا۔ ہم سب کو یہ سن کر بڑا افسوس ہوا اور ہم نے میڈم تاپورا پر اس کا نظریہ ہمدردی کیا۔

میڈم تاپورا شرابی رنگ کا ریشمی قرعہ پہنے تھیں، گردن اور سینے سے کھلا۔ گلے میں دو دریا چندن باد تھا جس کے نقل موتی جگمگ کرتے تھے۔ اٹھارہ سال کا سن اور اٹھتی ہوئی جوانی بڑی پیاری لگ رہی تھی۔ پچھلے سال ہی ان کا موسیو تاپورا سے بیاہ ہوا تھا۔ آس کریم بڑی عزیز تھی۔ میں نے صدی عمر میں ایسی فریڈا آس کریم نہیں کھائی۔ سمانوں نے ہر ایک چیز سے پورا احسان کیا۔ موسیو تاپورا کی عدم موجودگی محسوس نہ ہوئی۔

میں نے دیکھا کہ بہت سے شوہر اپنی بیویوں کے بغیر تھے۔ دو تین بیگناہ بھی اپنے

شوہروں کے بغیر چلی آئی تھیں۔ مسٹر پوکراو مسز دہی جو آجکل اکلے دیکھے جاتے ہیں ایک گونے میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ وہ درہونے کی وجہ سے میں ان کی باتیں نہ سن سکی۔

پارٹی دوبرات تک ہوتی رہی۔ موصیو ایس فائنٹ اپنی چیلوں اور دل گیوں سے خواتین کو ہنساتے وہے۔ بڑے دلچسپ آدمی ہیں۔ خوب پُر لطف، انتہائی تھاکو ہمیشہ یاد رہے گا۔

## ایک عشاۓ

مسٹر اور مسز جیمز حسین نے اپنے اجاب کو ایک عشاۓ پر بلایا۔ مہمان باہر لان میں بیٹھے۔ پھول بڑے شاندار تھے۔ کیونکہ مسز جیمز کی اپنی باغبانی ہے، چاتے اور آتش کریم کے تانے تک جو حسین اپنی باغبانی کے قصے سناتے رہے۔

مسز جیمز چار جٹ کی سرخ ساڑی پہنے تھیں جس کا نینتہ ذری کا تھانہ غائبان کی شادی سے پہلے کا ہوگا کیونکہ آجکل تو چار جٹ دیکھے کو نہیں مٹی۔ بیگم کا بوس پٹی غرارہ قیصر میں بڑی سربٹ دکھائی دے رہی تھیں۔ مینا عزیز شفق رنگ کا ریشمی دوپٹہ اوڑھے، جس کے پتے سنہری تھے، مسٹر رکت آفا سے باتیں کر رہی تھیں۔ بیگم عام تخت بھی جڑی بیٹھتی ہوئی ایک گروپ سے دوسرے گروپ میں جاتی تھیں اور ایسے فترے کتنی قیصر کر سب ہنسی سے لوٹ جوتا تھے۔ ستر سال کی عمر میں بھی ہر ماٹھی میں دندان قی ہوئی پہنچتی ہیں اور بنا و چناؤ جوانوں سے کم نہیں کرتیں۔ زعفرانی ساڑھی میں حسین زہمت میرا نے شوہر کی ہاپیز کے منتقلی سار ہی تھیں۔ مسز نہت نیر کی ہاپیز میں ایک جنگلی پھول کو سدھانا بھی ہے۔ ان کی دوسری خوشگوار رانی ہوئی بندھن سے لوگوں کی ٹوہریاں اٹاتا ہے۔ مسز آئی جیڈا اپنے گات کے تجربات سنا رہے تھے۔ سیاست سے فارغ ہوئے کے بعد مسز جیڈا نے اپنی کلن ٹو جگات کو دے دی ہے۔ مسز جیمز جی آف ایک میلز لیڈ جی حال ہی میں دھاتی آفس سے لوٹے ہیں۔ دھاتی آفس میں رہنے کے فوائد پر دو شنی ڈال رہے تھے۔ ان کی کٹنے

میں کراچی اور دہلی آنکلی زندگی میں بہت فرق تھا۔ وہ اگلے ہفتے چھوڑی آنا جا رہے ہیں۔  
 آسم سب نے خوب لطف سے کھاتے۔ مسٹر عبدالرحمن کے ایک دوست ہر سال  
 انہیں مندر سے آسموں کے ٹوکے سے بھجواتے ہیں۔

## ایک کاک ٹیل پارٹی

قاضی اور یگم جادو علی نے پچھلے دنوں میاں اور یگم آتی فوج کے فرزند اور بیویاں  
 اور یگم تربوز کے اعزاء میں ایک کاک ٹیل اور ڈنر پارٹی دی۔ میاں اور یگم تربوز کی شادی حال ہی  
 میں خٹان میں ہوئی تھی۔ پہلی یگم تربوز جواب یگم جادو علی ہیں چچی تامل کے غراسے قیاس میں لڑکے  
 بھرتی ہوتی پارٹی کی جان تھیں۔ یگم تربوز کو کراچی میں پہلی بار اپنے سوشل سٹیٹس کے لوگوں سے  
 ملنے کا موقع ملا۔ درختان میں تو وہ اپنے سٹیٹس کے لوگوں کی صورت دیکھنے کو ترس گئی تھیں۔  
 معزز مسلمانوں میں مسٹر اور یگم بھیرا، پرنس اور پرنس فخر الملک، مولوی لطف علی ڈائریکٹر لطف  
 جونی پر دو کٹنی اور مسٹر پٹوٹا ملے تھے۔ فیئر ایملکٹ نے یجر ڈومر کے فرائض بڑی خوش اسلوبی  
 سے نبھاتے۔ مسٹر پٹوٹے جو کاک ٹیل میں کھاتے ہیں اپنا جواب نہیں دیکھتے، اپنی پوری فارم میں تھے۔  
 کاک ٹیل پارٹی کے دوران میں قاضی جادو علی جو صنعت قلب کے مرغن ہیں۔ کو پیس، ہو گئے۔  
 فیئر ایملکٹ اور مسٹر پٹوٹا انہیں اٹھا کر اوپر باقہ روم میں شادی کے چنگے رکھاتے۔ تاہم  
 جادو علی پانی سے مشابہ اور ایملکٹ سوٹ میں ہاتھیں ٹھٹھرتے ہوتے ایک گھنٹے کے بعد  
 چمچے آگئے۔ انہیں دیکھتے ہی سب نے گانا شروع کیا۔

۔ اور ہی اڑے جالی گھنٹوں۔

بیشتر اجماع رات کو درمیں میزوں کے چمچے سو گئے صبح ان کو گلیسیوں میں لاد کر  
 ان کے گھروں تک پہنچا یا گیا۔

## شادی

پچھلے دنوں ایک کشیدہ فحاشت خبر بر دھڑلٹ کی شادی ایچکے ہیں، آہو چشم لڑکی سے ہوئی۔ یہ جو قسمت روزنامہ شاد کے مترجمیرا ہیں جو اپنے کالم میں ہمارے فائدہ خصوصی مقیم بان، واشنگٹن یا ماسکو کے روپ میں جلوہ گر ہوتے ہیں لیکن اکثر کراچی میں پائے جاتے ہیں۔ آپ اس ہر و لغز نے جوڑے ڈاکٹر اور یکم گجیرا کے فرزند و بلند ہیں جن کی خوب صورتی اور دود اندیشی سے ترتیب دی ہوئی یادیاں کئی ہونے والی شادیوں کی حاشیہ پل فاشتی ہیں۔ وہاں جو یہ جوہری اور یکم لال دین کی دختر صالح اختر ہیں، فاشتی اعلیٰ کاغذ پر اپنے خنیں تہا کئی کا پیش کیا دو پڑھیں کے سنہری پتے دو دو باشت لک ہے تھے، عروسہ طریق پر اوڑھے خنیں سر پر طلائی جڑاؤ چھپکا، گینے جوڑے ہونے کی جھارنگاں میں بناوٹی سونے کی تختا، کاتوں میں آویزے غالباً بناوٹی سونے کے۔ گلے میں تین ڈا چندن ہار جس کے بناوٹی موتی آنکلیں خیرہ کرتے تھے سب زیورات چاند سے کھرے پر خوب پچھتے تھے۔

ومن جسم چراتے، آنکلیں جھکاتے، صمٹی مساتی میٹھی تھیں جیسا کہ ولنوں کو ٹینا چاہیے۔ دولا بالکل دولا لگ رہے تھے۔ ہماروں نے فروا فروا ان کو شاباش دی اور ان کی چھیٹو ٹھٹھی۔

ہماروں میں حکومت کے ڈپٹی سیکرٹری، سفارت خانوں کے سرٹو سیکرٹری، اخبارات کے فائدہ گون خصوصی، سٹر عباس علی آت عباس سائیکلو، سٹر مستہرا یکم افغانی، انجرائی حال ہی میں اپنے بچے میز کے ساتھ سو سٹر میٹ سے لوٹی ہیں۔ وہ تیار ہی تھیں کہ وہ وہاں میز کے علاج کے سیکھیں تھیں جو بیا رہے۔ میز کو بھی پوری طرح افاد نہیں ہوا مگر پچھلے سے بہت بہتر ہے۔ پیر حمال گوٹہ اور سٹرافریٹ اپنی بیویوں کے میز آتے تھے جو دماغی ہسپتال میں ہیں۔ سٹر عباس علی ابھنے مائوکل اور قمر میز بریں بڑے پٹنگٹ اور سنجیدہ تھے۔ سٹر چمنپری شفق ساڈی میں سٹر نیچر سے باتیں کر رہی تھیں جو جو گو شیر ٹوٹی اور بیاہ پھر دلا را پن میں بڑے بالکے دکھائی دیتے تھے۔

شیخ شیریازی اپنے نیلے سوٹ میں ہر کسی سے لطف کی باتیں کر رہے تھے اور ان خواتین سے جن کے چہرے ان کو نئے سلوم ہوتے تھے بڑھ بڑھ کر اپنا تعارف کرا رہے تھے۔ مٹانے جوڑے کو ہمیشہ شاد کام اور خوش و غرم رکھے۔

ایساں تک تو س نیک پروین کی عزیزہ کا کھٹا ہوا فچر ہے لیکن کراچی میں ان دنوں ہی ایک اور فکشن بھی ہوا جسے ”کراچی کے شب و روز“ کو راؤ ڈنڈا آت کر نے کی خاطر درج کیا جاتا ہے۔ اس کا افسانہ چاندنگ لوگوں کن گوار نہیں مگر رے گا۔

## ایک چائے کی دعوت

حال ہی میں مجرات کے روز پنا کپڑاڑہ میں ڈبل روٹیاں بنانے والوں کی انجمن کے صدر بھلے ڈینو نے اپنے منجھلے بیٹے عمر ڈینو کے ملازم ہو لے کی خوشی میں غریب السنواں ہونٹل پر اپنے احباب اور انجمن کے ممبروں کو چائے کی دعوت دی۔ سٹر بھلے ڈینو کے دست ایک مدت سے اس دعوت کا تھانسا کر رہے تھے۔ عمر ڈینو کف دار سبز حملے اور چار گرسے کی نیل شلوار میں بڑے چارنگ اور دو صندوق دار لگ رہے تھے۔ سب مہمانوں نے اسے یادی ہی سروس میں کٹ کڑ کی جگر پر تعینات ہونے پر مبارکباد دی۔

غریب السنواں میں صرف مرد مدعو تھے۔ پنا کپڑاڑہ میں ابھی تک مخلوط پادریوں کا رواج نہیں چنپا۔ معزز مہمانوں میں سائیں اللہ لوک سنیا سی عامل، کامل دطیبہ روحانی نیرہ ڈاکٹر فریبہ روم، حکیم صادق محمد دین اسپتالیں فلی کامیڈین ایم۔ غازی اور نور علی مامک و پر و پنا میر شاہانہ بوٹا دوس شریک تھے۔ رٹ کے کے ماموں سکے ڈینو جن کی دختر نیک اختر کے ساتھ سٹر عمر ڈینو کی شادی طے ہو چکی ہے۔ خاص پارٹی میں شمولیت کی خاطر نواب شاہ سے آئے تھے۔ آپ کا دل ان ایفون کا ٹیکہ ہے۔ سائیں اللہ لوک سنیا سی اپنی ذات تک لمبی سفید ریش اور

ایک باتصویر سوسائٹی سیکڑیں ۔

برسے کی فرغل میں بڑے چار رنگ۔ کھائی دیتے تھے۔ آپ نے دیر تک اپنی نئی روحانی ایماں کے گوشوں سے حاضرین کو دم بخود رکھا اور سڑ سڑ کر نیر کے بازو پر اپنا تیار کردہ ایک خاص کرانی تعویذ یا ندھا۔ محمد دین اسپ نے ایک قطعہ پڑھا جس سے عمر ڈنیو کے ملازمت کے روز کی تاریخ نکلتی تھی۔ پارٹی ہنسی خوشی میں ختم ہوئی ۔

نوٹ :- یہ ایک معصوم پیر وڈی ہے سوسائٹی سیکڑیوں کی۔ سب نام اور واقعات بالکل فرضی ہیں اور فرد یا طبقے کو خفیت کرنا مطلوب نہیں اس مضمون کو ایک پیر وڈی کی حیثیت میں پڑھا اور پکھا جائے ۔



شیخ شیرازی اپنے نیلے سوٹ میں ہر کسی سے لطف کی باتیں کر رہے تھے اور ان خواتین سے جن کے چہرے ان کو نئے معلوم ہوتے تھے بڑھ بڑھ کر اپنا تعارف کوا رہے تھے۔ مٹانے جوڑے کو ہمیشہ شاد کام اور خوش و خرم رکھے۔

یہاں تک تو سب نیک پرورین کی حزیہ کا مکھا ہوا فیچر ہے لیکن کراچی میں ان دنوں ہی ایک اور رنگی جی ہو رہی ہے کراچی کے شب و روز کو راؤنڈ آف کوٹنے کی خاطر درج کیا جاتا ہے۔ اس کا اتنا فائدہ چاہنگ لوگوں کو نالوار نہیں گزرے گا۔

## ایک چائے کی دعوت

حال ہی میں جمہور کے روز چاکیراڑہ میں ٹبل روٹیاں بنانے والوں کی انجمن کے صدر بھلے ڈونولے اپنے پھلے بیٹے عمر ڈونولے کے طالع ہونے کی خوشی میں غریب انوار سہولت پہا اپنے احباب اور انجمن کے ممبروں کو چائے کی دعوت دی۔ مسٹر بھلے ڈونولے کے دست و پک دست سے اس دعوت کا اتمام کر رہے تھے۔ عمر ڈونولے دار بزرگ علی اور چاکیراڑہ کے کیل شوار میں بڑے چار رنگ اور دھندار لگد ہے تھے۔ سب مہمانوں نے اسے پیاری میسر دس میں کٹ کٹ کر بکھیر کر تعینات ہونے پر مبارکباد دی۔

غریب انوار میں صرف مرد مدعو تھے۔ چاکیراڑہ میں ابھی تک مخلوط پارٹیوں کا رواج نہیں چلا۔ معزز مہمانوں میں سائیں اللہ لوک سنیا سی، عالی، کامل و طیبہ مد خان، نمبرہ ڈاکٹر غریب علی، حرم حکیم حافظ محمد دین، سب۔ ایس فلی کامیٹین ایم غزالی اور نور علی مالک و پو پائیز شاہا اللہ بوٹا دوسٹر یک تھے۔ ڈاکٹر کے ماموں بکھے ڈونولے کی دختر نیک اختر کے ساتھ مسٹر عمر ڈونولے کی شادی ہے ہر چکی ہے۔ خاص پارٹی میں شمولیت کی خاطر نواب شاہ سے آئے تھے۔ آپ کا دواں ایفون کا تھیکہ ہے۔ سائیں اللہ لوک سنیا سی اپنی نائیک لمبی سفید ریش اور

ایک باتصویر سوسائٹی میگزین۔

بورسے کی فرخندگی میں بڑے چار منگ دکھائی دیتے تھے۔ آپ نے دیر تک اپنی نئی روحانی ایجابات کے کوششوں سے حاضرین کو دم بخود رکھا اور مسٹر عمر ڈنیر کے بازو پر اپنا تیار کردہ ایک خاص کرانہ تصویر دیا تھا۔ محمد دین اسپ نے ایک قلم پڑھا جس سے عمر ڈنیر کے ملازمت کے روز کی تاریخ نکلتی تھی۔ پارٹی ہنسی خوشی میں ختم ہوئی۔

نوٹ:۔ یہ ایک معصوم بیروٹی ہے سوسائٹی میگزینوں کی۔ سب نام اور واقعات بالکل فرضی ہیں اور فرد یا طبقہ کو ضیعت کرنا مطلوب نہیں اس مضمون کو ایک بیروٹی کی حیثیت میں پڑھا اور پکھا جائے۔

# مستر گھامڑ کا ادبی کیریئر

## دوئے سخن کسی کی طرف ہو تو رو سیاہ

اپنی دلی دونوں کی طرف سے قدم سے مطمئن ہونے کے بعد مسٹر گھامڑ کو نام پیدا کرنے کا سودا سہا۔ اس نے سیاست کے میدان کی طرف نظر کی۔ یہاں بڑی مشکلات دکھائی دیں۔ سیاست میں کامیاب ہونے کے لیے جس چرچ زبانی اور چال کی ضرورت ہوتی ہے وہ قدرت نے مسٹر گھامڑ کو رویت نہ کی تھی۔ پھر ایک دن اس نے اپنے دوست فقیر وکشا دالے کے ماتھے میں اردو کے ایک ماہنامے کا خاص نمبر دیکھا۔ اس نے ہر نمبر اپنے دوست سے مانگ لیا اور گھر آکر اس کی ورق گردانی شروع کی۔ اس ماہنامے کے چھ تین چار صفحات ایسوں کی تصویروں کے تھے جن میں سے بیشتر کچھ اور محکم پرندے لگتے تھے۔ اس کے بعد دو صفحے ان ایسوں کے تعارف کے لیے وقف تھے جن کے بعد مقالوں، افسانوں اور نظموں کا ایک طومار تھا۔ گھامڑ نے سب معنائیں کراہے بے تک پڑھا۔ بیشتر مقالے اور نظمیں اس کی سمجھ سے بالاتر تھیں لیکن وہ ان کی علیحدت اور گہرائی سے بے حد مرعوب ہوا۔ اس نے قلمی سے مقالہ نویسوں کی تصویروں کو رسالے میں سے کاٹ کر دیوار پر چسپاں کر دیا۔ اس کا انہیں فریم کرانے کا ارادہ تھا۔ مگر اس کے لیے اس کے پاس پیسے نہ تھے۔ اس کے بعد گھامڑ اور دو ادیب ایک بڑا سنجیدہ پڑھنے والا بن گیا اور جیسا کہ تقدق امر ہے، اسے بھی اپنے نام کو چسپا ہوا دیکھنے کی خواہش متانے لگی۔ ادبی شہرت اسے ایک ایسی چیز محسوس ہوتی جس کے

حصول کے لیے نروہچہ کی ضرورت تھی اور نہ چرب زبانی کی اور جس کا حاصل کر لینا اسے بہت آسان نظر آیا۔

لیکن ادنیٰ شہرت حاصل کرنا اتنا آسان نہ تھا جتنا اس نے سمجھا تھا۔ اس نے پہلے پہل ایک دکنشاہ کے بارے میں ایک کہانی لکھی۔ اس نے اسے رسالہ ”قدریں“ میں چھپنے کے لیے بھیجا اور اس پرچے کے اگلے شمارے کا انتظار کرنے لگا۔ اس نے اگلا شمارہ غریب اور دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ فہرست مضامین کو اوپر نیچے تک پڑھا۔ اس کی کہانی اس میں نہیں تھی یہ اس سے اگلے شمارے میں بھی نہیں تھی۔ اس نے ایڈیٹر کو خط لکھا جس میں اس نے کہانی کی داہمی کا مطالبہ کیا۔ کسی نے اسے جواب نہ دیا۔ گھماٹے بہت نہ ہادی۔ اب کے اس نے ایک جدید طریقہ معرۂ نظم ”زمناء میں شام“ لکھی اس کا بھی وہی حشر ہوا جو کہانی کا ہوا تھا۔ اس کے بعد اس نے خاص نمبر کے سب سے علائقہ مقالہ کے نوٹوں کو سامنے رکھ کر ”ادب میں بحران کا بہتر منظر“ کے عنوان سے ایک مقالہ لکھا۔ یہ بھی نہ چھپا اور نہ ہی ”قدریں“ کے ایڈیٹر نے اس کی رسید دی۔

مالیہ اس ہو کر اس نے سوچا کہ یوں تو کام نہ بنے گا، کوئی اور ترکیب لڑائی چاہیے۔ چنانچہ یہ تجویز اس کے ذہن میں آئی کہ کسی طرح ”قدریں“ کے ایڈیٹر سے دوستی گانٹھنا چاہیے۔ اس نے خاص نمبر میں ایڈیٹر کا فریو دیکھا تھا۔ ایک نوٹا سا پلا ہوا آدمی جو ایڈیٹر سے زیادہ چل فریو لگتا تھا ایک دفعہ کافی ہاؤس کے پاس سے گزرتے ہوئے اس نے ایڈیٹر کو کافی ہاؤس کی میز پر پرادہ چڑھتے دیکھا۔ گھماٹے فریو اس کے چھپے اوپر چڑھا آیا۔ اس نے ایڈیٹر کو ایک کونے کی غلام میز کے پاس بیٹھتے ہوئے دیکھا۔ گھماٹے بھی وہاں جا کر بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد اس نے ایڈیٹر سے کہا ”صاف کیجئے! آپ ہندو پاکستان کے عظیم ادیب کا قتل فرمادی تو نہیں؟“

”بندہ ہی غافل فرمادی ہے۔“ ایڈیٹر نے خوشی سے ایک بی کی طرح غرغراتے ہوئے جواب دیا۔

”میں نے آپ کا فٹ نوڈ دیکھا تھا اور اسی سے آپ کو پہچانا ہے۔“ گھاسٹر نے کہا ”میں آپ کے فن کا بڑا حاح ہوں۔ آپ کے کہنا سے کہنا عہہ بڑھتا ہوں۔ آپ کی نظم ”سرگوشی“ مجھے بڑی پسند آتی۔ بکجے کافی بات پیجئے گویا کوئلہ — اومین پیرا —“

گھاسٹر نے ایڈیٹر کے بیسے کافی کے ساتھ کلپ بھی منگوائے اور کافی کے بعد انہوں نے اُس کیریم بھی کھائی۔ گھاسٹر نے اس شام ایڈیٹر کی مہمان نوازی میں بڑی دریا دل کا ثبوت دیا۔ اس نے اپنی سارے دن کی کمائی مسٹر عاتل فریادی پر خرچ کر دی لیکن اسے اس کا ذرہ بھرا بھی انفس نہ ہوا وہ جانتا تھا کہ یہ رقم جو وہ خرچ کر رہا ہے یہ ادبی شہرت اور مقبولیت کے حاصل کرنے کے لیے انڈسٹمنٹ (INVESTMENT) ہے جس کے لگانے سے اسے فدیہ نہ کرنا چاہیے۔ کافی کے بعد دو گھنٹے جبریداد اور گھسنے والوں پر باتیں ہوتی رہیں۔ جن سے گھاسٹر نے قہر نکالا کہ مسٹر عاتل فریادی کی اپنی رائے میں اس وقت اردو کا بہترین نقاد، افسانہ نگار اور شاعر — صرف عاتل فریادی تھا۔

گھاسٹر نے ادب کے بارے چند مبہم اور محتاط خیالات کا اظہار کیا۔ کئی ایک اچھے کھسنے والوں کے نام بیسے اور ادبی بحران پر تشریض ظاہر کی۔ اس سلسلے میں اس نے ایک التنا قہر لیسے میں اس کا ذکر بھی کر دیا کہ وہ موجودہ ادب کے انحطاطی رجحانات کو ایک متناسے میں زیر بحث لا رہا ہے۔ ”گھسنے کے بعد مجھے دسے دیجئے“ ایڈیٹر نے کہا ”ایسے مقالوں کی میں بڑی ضرورت ہے۔ آپ کا ادب کے بارے میں مطیع نظر بے حد ویسا ہے۔“

”شکریہ“ گھاسٹر کی باپھیں کھل گئیں۔

گھاسٹر اور ایڈیٹر دن بھر مذاکرے کے بعد دست بن گئے۔ گھاسٹر اکثر ایڈیٹر کو کافی ہاؤس میں ملتا۔ گھاسٹر نے آخر پہنچا انحطاطی رجحانات والے متناسے پر کام شروع کر دیا۔ اس نے اس پر بعد محنت کی۔ پہلے تو اس نے خاص نمبر کے سبب طویل متناسے میں سے شکل اور بار بار استعمال ہونے والے

انسان چن کر ایک کا قدم پر کھلے۔ مثلاً غیر طبقاتی شعور، سرمایہ دارانہ رحمت پسندی، جدیدیاتی تہذیب، استحصال نظام، سماج، البرڈروائی ذہنیت وغیرہ وغیرہ۔ پھر اس نے ایسے فقرے بنائے کی کوشش کی جن میں ان نقطوں اور ترکیبوں میں سے کم از کم ایک آدھ ضرور استعمال ہو۔ گھٹا کر خود واقعی طرح معلوم نہ تھا کہ وہ کیا لکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ دس دن کی شبانہ روز محنت کے بعد وہ اپنے متناسے کو ختم کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ مقالہ جس صفات پر مشتمل تھا، اس کا عنوان تھا: ادب کے انحطاطی رجحانات۔ شعوری نیم شعوری اور لاشعوری اس کے پسے ابتدائے دو صفحے پر ہیں۔

## ادب کے انحطاطی رجحانات۔ شعوری نیم شعوری اور لاشعوری

از: ل۔ گھٹا

۱۰ اس موضوع پر مجھ و بحث ممکن نہیں لیکن چونکہ مسئلہ کی اہمیت مسئلہ ہے اس لیے کم از کم یہ جاننے کی کوشش کرنا لازم ہو جاتا ہے کہ حوامی ادب اور انحطاطی ادب میں کیا فرق ہے؟ کیونکہ ہم اپنی نا عاقبت اندیشیاء روش کی وجہ سے اس منزل پر پہنچ گئے ہیں جہاں حوامی ادب اور انحطاطی ادب میں تمیز کرنا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہو گیا ہے۔ یہ افسوس سے تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اس دور کے انحطاطی ادب کو دواج دینے والے بھی زیادہ تر ہمارے حوامی اور برتر و غلط ترقی پسند قلم کار ہی ہیں اور وہ ان قدروں کو اپنا دے ہیں — بکرا پانچھے میں جو ادب کو زندگی سے دور سے جاتی ہیں چنانچہ شیل، اقبال، جوش اور حالی کی روایات میں بے شک کچھ سوچے سمجھے کھاجا رہا ہے۔ ہمارے ادیبوں کا یہ انحطاطی رجحان حوامی اور ترقی پسند ادب کے لیے جو خطرہ پیش کرتا ہے وہ ظاہر ہے۔ وہ آٹھائیکہ ہر تاریخ کا طالب علم اس سے آگاہ ہے کہ تاریخ کے دھارے کو بدلا نہیں جاسکتا۔ ایک سمت چلنے والے نیز کام دریا کو لے کر

نہیں بسایا جاسکتا چنانچہ شبلی اقبال، جوش کی نظروں میں جو محنت و سرمایہ کاتنا دھنا ہے وہ جدیدیاتی ہے اور ان بزرگوں کا تاریخی شعور قبول اور جھڑپا ہے۔ اگرچہ ان کے حق میں یہ دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ انہوں نے کم از کم پورٹو دا طے کو مرد و رطبے سے آگاہ کیا، پھر بھی ان کے تاریخی ارتکاب کے پس منظر میں سرمایہ و محنت کی جدیدیاتی کے علم و حورہ کی وجہ سے ان کی تخلیقات کو انعطافی دور کی پیداوار کہا جاسکے گا کیونکہ جس ان کی نیت سے کچھ غرض نہیں وہ سیدھے سادے مسلمان تھے جن میں سے ماسوا غالباً اقبال کے باقی سب کی طویل سفید داڑھیاں ان کے گھٹنوں تک آتی تھیں۔ دیکھنا تو یہ ہے کہ ان کی شاعری سے کیا نتائج برآمد ہوئے اور آیا یہ کہ شاعری جاگیر دارانہ اور سرمایہ پرستانہ صورت اور معنی کی حامل ہے کہ نہیں لیکن ممکن ہے بعض لوگ یہ سمجھیں کہ صورت اور معنی ایک ہی شے ہے۔ یہی تو ایک بڑی غلطی ہے۔ کون صحیح انھم اور باہر ش آدمی یہ کہے گا کہ دم کٹے کٹے اور شیر پر جس کوئی فرق نہیں اس شے کی خاطر خواہ وضاحت کے بعد ہی علانی اور کئی اقدار کو زیر بحث لایا جاسکتا ہے کیونکہ اس سائنٹفک و دریں ادب کے صورت و معنی کو ادبی تفسیرات سے الگ نہیں کیا جاسکتا اور اس کی ہنر بردار لازمی ہے۔ چنانچہ ہمارے ادیبوں اور قلم کاروں نے یہی غلطی کی ہے کہ وہ ابھی تک اپنے اذہان میں ادب ہمارے ادب کے انعطافی نظریہ کے قائل ہیں ورنہ عوامی اور جامدا ادب میں صورت پرستی و استقلالات اور لفظوں کے حسن کو اس قدر اہمیت کیوں دی جاتی، حبیب کہ عوامی ادب کو عام بول چال کی زبان میں ہونا چاہیے اور جذباتیت اور رومانی قراریت سے پرہیز کرنی چاہیے۔

خیبر اس کوئی لحال چھوڑیے۔ ہمارے ادیب ابھی تک بورژوائی طبقے کا دم چھلانے ہوتے ہیں اور اس کی وجہ سے ان کے خیالات میں گنبدک اور بوکلاسٹ کا عنصر نمایاں ہے۔ چنانچہ اقبال کو یہ سمجھے جسے ہم نے پورٹو دا آئیڈیا لوجی کا شکار ہو کر باجم فلک پر پہنچا دیا۔ وہ آں حالکہ وہ ایک انعطافی دور کے شاعر ہیں اور ان کے کلام کو کلاسی جدید سے کوئی ناٹ نہیں رہا۔ ان کی شاعری ایک

غیر سائنٹفک شعور کی پیداوار ہے۔ خیر اقبال کو چھوڑیے۔ غالب کو ایسے۔ غالب کی شاعری صورت پرستی کی شاعری ہے۔ یہی حال مترحوں صدی کے انھماطی دور کے انگریزی شعرا کیسے، ایسے اور باتوں کا ہے۔ چنانچہ ان کی شاعری کی علت اب ہمارے نزدیک محض ایک تاثر یعنی رہ گئی ہے۔ اکتائیے نہیں۔ ہم جب تک تحقیقات کی بنیاد اس سائنٹفک اور مادی نظریہ معیشت اور فہم اور شعور پر نہ رکھیں گے جو جبلت انسانی اور رجعت پسنداد معیشت کے تقاضوں پر قابو پا کر انھیں کا عدم کر کے ایک نئی حیات کی تخلیق کرے جو فطرت اولیٰ کا اقتاد ہو۔ جبلت ثانیہ کی نفی ہر نوعاً معاف کیجئے صالح اور صحیح غیر طبقاتی ادب پیش نہیں کیا جاسکتا۔

سورسٹ ماہام۔ جہز حواس کھلے۔ آندہ سے ڈرید اور پیرا دست کی تخلیقات کو اگر تیار اور ساتس کی ارتقائی قدروں پر جانچا جاسکے تو ان کی اتنی قدر و قیمت بھی نہیں رہتی جتنی بازار میں بکتی چرتی رہی کی۔ الٹی شعور پر مبنی نظریات کا پرچار کرنے والے ادیبوں نے تاریخ کو پیچھے سے جانے کا ناقابل معافی گناہ کیا ہے اور ان کے کتبیک، غیر سائنٹفک اور رجعت پسندانہ اذہان کی مریضیاد جنہیں خرافات نے موجودہ پوپر ایسا دھڑلہ اثر چھوڑا ہے کہ ہمیں اس کو ذائقہ کرنے کے لیے شاید عظیم اور مسلسل جدوجہد کرنا پڑے۔ ان بورژوائی علمبرداروں کا طریقہ فکر سب مظاہر کو محنت تسلیم کرنا ہے۔ مثلاً ان کے نزدیک محبت محبت ہے۔ نفرت، نفرت ہے۔ خود غرضی خود غرضی ہے۔ لگتا ہے اور گھوڑا گھوڑا۔ ان کا طبقاتی شعور اس قدر غیر نچتر اور انھماطی طریقہ پر ہے کہ وہ یہ نہیں دیکھ پاتے کہ ان مظاہر میں ایک گمراہ شدہ ہے اور ان کا ظاہر اقتدا و اصلاً تضاد نہیں بلکہ محبت، نفرت، خود غرضی، گناہ اور گھوڑا معیشت کے قوانین کے لازمہ مظاہر ہیں جو اس کے بدستے ہی نیا قالب اختیار کریں گے۔ اسی منطق پر کار بند رہنے والا ہمارے ہاں منتر ہے۔ جیڑا اس مصنف کو فی الحال چھوڑیے مجھے ابھی اور ضروری باتیں کہنی ہیں، وہ کہہ کر میں غصہ کی مریضیاد نہایت کا تمیز کروں گا۔



اسی طرز میں اس مقالے کے پندرہ سو ر صفات اور تھے۔ اسے کچھ کچھ شک ضرور تھا کہ جو کچھ اس نے لکھا ہے ناقابل فہم کہاں ہے مگر جب اس نے اس مقالے کو اپنے دوست ایڈیٹر عاتق فریادی کو دکھایا تو وہ اس کے ساتھ شک حرق تنقید سے بے حد متاثر ہوا۔ اس نے مضمون کو شابہ کا کہا اور گھاسٹر کو یقین دلایا کہ یہ مقالہ تنقید نگاری کی سب سے اچھلی روایات کو بدل ڈالے گا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ اردو میں پہلا مقالہ ہے جس میں رجعت پسندی اور ترقی پسندی کے اختلاف کا اس گہرائی اور ساتھ ساتھ نقطہ نظر سے تجزیہ کیا گیا ہے۔ گھاسٹر یہ سب تعریفیں سن کر بھولانہ سمایا۔ عاتق فریادی بھی اپنی ہلکے ایک نئی ادبی دریافت کرنے پر مغرور تھا۔

”قدریں“ کے اگلے شمارے میں اس مقالے کے ساتھ گھاسٹر کی تصویر اور اس کا تعارف بھی چھپا۔ تصویر میں گھاسٹر کو سرسٹ پتے ہوئے اور اس کے دھڑکنے والی آنکھوں کی نظروں سے غور و فکر کرتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ اس مقالے کے چھپتے ہی ادبی حلقوں میں گھاسٹر کی حاکم میڈ گئی۔ اسے ادبی حلقوں کے کئی ایڈیٹروں کے خط آئے جن میں اس سے تنقیدی مقالوں کی فرمائشیں کی گئی تھیں۔ بین پار میسنے میں گھاسٹر کا شمار ملک کے چرچے کے نقادوں میں ہونے لگا۔ ایک صحیح حجامت کرتے ہوئے گھاسٹر کو خیال آیا کہ ادب کے ایک ہی شعبہ میں ہم پیدا کرنا کافی نہیں چنانچہ اس نے افسانہ لکھ کر اپنے ماحول کو اپنی قابلیت سے آواز دیا وہ متحیر اور شہرہ کرنے کا منیلا گیا۔ انہوں نے قدریں کے خاص نمبر کے افسانوں کو ایک بار پھر شہرچا اور پھر ایک مشہور افسانہ نگار کے افسانے کے نمونے کو سامنے رکھ کر ایک گھنٹے میں ایک افسانہ لکھ دیا۔ جس کا عنوان تھا ”مکڑی کا درخت“ اسے لکھنے کے بعد ہی خود اس کے دل نے اس سے کہا ”گھاسٹر کم محنت! تو نے تو شابہ کا افسانہ لکھ دیا ہے اور پہلے ہی ہے میں!“

وہ افسانہ یہ تھا۔

## کڑی کا درخت

انزال گھاٹ

شام کو سا فروپ پود کے نئے پہاڑی گاؤں میں پہنچا تو وہ سارا دن چلتے رہنے سے بے حد تھکا ہوا تھا۔ مغرب میں سورج ڈوب رہا تھا اور شفق کے قرمزی رنگ مجھے سست خرام ندی کے پانی میں گھل رہے تھے اور اسے ایسا معلوم ہوا جیسے پانی میں لارڈز کھل رہا ہے۔

مسافر دن بھر چتا رہا تھا۔ اپنے ویس سے وہ ریل پر پریم ٹرک کے اسٹیشن پر کیا تھا۔ اسٹیشن سے چاند آباد تک بس میں اور وہاں سے وہ پیدل چلتا ہوا یہاں پہنچا تھا اسے خود بھی معلوم نہ تھا کہ وہ یہاں کیوں آیا ہے۔ وہ کہیں اور کیوں نہیں چلا گیا۔ وہ کونسی کشش تھی جو اسے سوپ پور میں کھینچ لاتی تھی۔ اس نے ایک ننھے بے باک چرواہے سے پوچھا جو چیتروں کو نہکا ہوا اس کے پاس سے گزرا۔

بچے میں بیاں کیوں آیا ہوں ؟  
چرواہے نے اسے مسکراتے اور تعجب بھری نظروں سے دیکھا۔  
مجھے کیا معلوم ؟ اس نے کہا۔

کتنا ذہین بچہ ہے۔ مسافر سوچنے لگا۔ اور اسے کبھی معلوم ہوگا کہ شکر کا سن کیا ہے ؟  
داغ کے کیغز قوسیں کیا نکالے گا۔ یہ ساری عمر بھڑکی ہی چراتا رہے گا۔ اور اس کا قیام بھی اس کے بد بھڑکی ہی چراتے گا۔

ناگناں مسافر نے در چند دیہاتی دو شیرازوں کو سر جھکائے، انہیں بھڑکائے، انگلیوں کے پوروں سے لارڈز کی ندی کے پانی سے کھیلنے دیکھا۔ وہ تیز تیز چلتا ہوا وہاں پہنچا۔

اسے یہ دیکھ کر بایں ہنسی کر یہ دو شیرازیں درحقیقت دیدہ نمونوں کے کئے اخبار تھے جن کی بانی خدیجہ  
ڈالیاں نائی انگلیوں سے اس قدر مشابہت رکھتی ہیں۔  
وہ وہاں لٹا اور ننھے چرواہے کے پاس گیا۔

میرزا کو یہاں ٹھہرنا پاتا تھا ہوں۔

میرزا ساتھ آؤ۔ چرواہے نے کہا۔ اور وہ اس کے مکان میں لے گیا جس کی چھت  
سرخ کچیریل کی تھی۔ اس مکان کے ارد گرد دھان کی بالیاں رنگین خوبڑی کی طرح سرسرا  
رہی تھیں۔

بچے نے کہا، میری بہن اور میں یہاں اکیلے رہتے ہیں۔ ہمارے اس باپ و دوسل چوتھے  
گزر گئے۔ ہم بھیڑ بکریاں چرا کر اپنی گزاران کرتے ہیں۔

مسافر نے سوچا لوگ کیوں مرتے ہیں۔ آٹا فانا موت انھیں کیوں دبوچ لیتی ہے۔  
قدوت کتنی بے رحم اور سنگ دل ہے۔

میری بہن ابھی یہاں نہیں ہے۔ بچہ بولا۔ وہ اس وقت زمیندار کے ہاں چلی جاتی  
ہے۔ وہ سامنے تین منزلہ مکان ہے نا۔ وہ زمیندار کا ہے۔ وہ بڑا اچھا آدمی ہے۔ میری  
بہن کو بڑی اچھی اچھی چیزیں دیتا ہے۔

دونوں مکان کے اندر داخل ہوئے۔ مسافر چارپائی پر بیٹھ کر اپنے بوٹوں کے تسمکھنے  
لگا۔ پھر اس کے پیچے بکری کے تازہ دودھ کا کٹورا بھر کر لے آیا۔ اسے پینے کے بعد مسافر کی مادی  
کسل دور ہو گئی۔

اتنے میں بچے کی بہن بھی آگئی۔ وہ ایک سترہ سالہ دو شیرازہ تھی۔ اس کی زلفیں کجوری  
ہوئی تھیں۔ اور اس کی آنکھیں وحشی ہرنی کی طرح بے باک تھیں۔  
تم کون ہو؟ آخر مسافر نے پوچھا۔

لڑکی بننے لگی۔ اس کے دانت بچے آبدار موتیوں کی ٹہنی کی طرح سفید اور چمکیے تھے۔  
مسافر کو ایسا معلوم ہوا جیسے ایک بادلوں میں سے مہتاب کا نور بنے نکلا۔ جھوپڑی میں جیسے  
اجالا ہو گیا۔

میرا نام موٹا ہے — لڑکی نے کہا۔  
مسافر نے آٹھوڑھی دیر کے بعد کہا۔ موٹا، لکڑی لاکر کچھ آگ جلاؤ۔ میں سردی سے جم  
رہا ہوں۔

موٹا نے حسرت سے مسافر کو دیکھ کر اپنے سر کو فنی میں جھنسن دی۔ اس کی آنکھوں  
میں آنسو ڈھبڑ پڑے۔

مسافر سیاں لکڑی کی آگ نہیں جلاتی جاسکتی۔ لکڑی زمیندار کی ہے۔  
اور پھر مسافر کو پتا لگا کہ دادی کے سب درخت، جیل، دیو دار، بید بھنڈ زمیندار کی  
ملکیت تھے، اور کوئی اس کی اجازت کے بغیر ان درختوں کی ایک ٹہنی تک نہ کاٹ سکتا تھا۔  
اس نے سوچا کہ یہ کتنا ظلم ہے — اس کے دل میں اس دیر صفت زمیندار کے خلاف قصہ  
اور نفرت کی آگ بھڑک اٹھی۔

موٹا۔ اس نے یک لخت اٹھتے ہوئے کہا۔ مجھے کھانا ڈی دو۔ میں لکڑی کا توں گا اور ہم اس  
کمرے میں لکڑی کی آگ جلاتے گے۔ چٹنی ہوئی، لگاتی ہوئی آگ — اور تم اور تمہارا بھائی  
اور میں ساری رات اس آگ کے گرد بیٹھ کر کھانا کھیں گے۔

سچ — موٹا نے ماتھے پر پائی ہوئی لٹ کو جھٹکتے ہوئے کہا۔ مسافر! مجھے کھانا  
بہت پسند ہیں۔

اس رات کھانا کافی سکے کی وجہ سے مسافر لکڑیاں کاٹ کے نہ لاسکا۔ دوسرے دن وہ  
صحیح سویرے گاؤں میں چلا گیا۔ اس نے گاؤں والوں میں پوچھا کہ اس دادی کے درخت

تھارے ہیں اور انھیں ان کو کاٹنا چاہیے۔ مگر گاؤں کے لوگ زمیندار کے ہر کاروں سے خوف زدہ تھے۔ مسافر نے ان میں سے چند جیائے نوجوانوں کو اکٹھا کیا۔ وہ کلنڈرے کے کراس کے ساتھ جانے کو تیار ہو گئے۔ موصول جہانے غورے نکلتے اور کھڑیاں لہراتے وہ جنگل کی طرف چلے۔ اب انھیں زمیندار اداس کے ہر کاروں کا کوئی ڈر نہ تھا۔ ان میں سوا انسان جاگ چکا تھا۔ زمیندار نے اپنے سر منزل مکان کی چھت سے انھیں دیکھا۔ اسے نیچے آنے کی ہمت نہ ہوئی۔ اس کا رنگ اس جہم کو دیکھ کر زرد ہو گیا۔

یہ درخت ہمارے ہیں۔ گاؤں والوں نے زمیندار کو دیکھ کر غورے نکلائے۔

زمیندار چلایا۔ یہ میرے ہیں۔ میرے دادا نے انھیں پھاڑوں پر لگایا تھا۔

وہ آگے بڑھتے گئے اور پھاڑ کے داسی میں جا کر انھوں نے دھنک کاٹے۔ اب ان کے گھروں میں کڑی کی آگ جلنے لگی اور اب رات کو دن کے کام کاج کے بعد محسوس ہونے لگا جیائے نوجوانی اور ان کی سیاہ زلفوں اور تپلی کمرؤں والی مہربانیوں کے گرد مہیہ کر پھیلیاں پوجتیں، ہنستیں اور ایک دوسرے سے چیخیں کرتیں۔

لیکن زمیندار نے پریم نگر کے جاگیردار کو سچی ٹکسی اور اس نے وہاں سے فوج مسجدی اور فوج نئے کر گاؤں والوں پر ظلم ڈھائے۔ ان کی خورتوں اور بہنوں کو کپڑے گئے اور پیر وادی پر اداسی چھا گئی۔

یہ سارا قصہ صاف لکھا ہے۔ گاؤں کے بڑے بڑے کتے یہ ہیں زمیندار کے خلاف زلزلہ تو ہمارے گھر باریوں تباہ نہ ہوتے۔ آخر ایلوں کی آگ تو ہم بیکے ہی تھے۔  
دن گزر گئے۔ جتنے گزر گئے۔ میں نے گزر گئے۔ بارہ برس گزر گئے اور مسافر اب تک گاؤں میں تھا۔

اداس عرصے میں زمیندار کا ظلم اور تشدد بڑھتا گیا۔ اب گاؤں والے اپنے جلاتے تھے۔

کڑی کی جھڑکتی ہوئی آگ کیسی ہوتی ہے شاعری کیا چیز ہے زبان کی لطافت کیا شے ہے پہاڑوں پر نرینر طام کمال واسے خوبصورت شیر کیسے چپکے سے دبے پتھروں چلتے ہیں یہ سب باتیں گاؤں واسے بھول گئے تھے اب مسافر کے سوا جو ایک ٹہانگ سے لنگڑا تھا باقی سب کو پریم نگر کے جاگیردار نے اپنی فرج میں زبردستی بھرتی کر لیا تھا۔ کمزاریاں اب بات بات پر سنہتی نہ تھیں بچے مسکرتے اور کھینچتے نہ تھے۔ گاؤں پر ادا سی گہری ہوتی گئی۔ چیلوں اور دیواروں سے پتے جھڑ گئے۔ طام کھالوں واسے شیر اور سنہری جسم پر رنگا رنگ کی دھاریوں اور دھبوں کے کوٹ پہننے واسے جیسے بخل کے نہ ہونے سے دادی کو چھوڑ کر پرست کی تڑائیوں میں اتر گئے چست کبری ریشی کچھنیوں واسے سانپ جو ذریں دادی میں جانندی داتوں میں مہارالپتے تھے خاموش ہو گئے۔ لوگ محبت کو بھول گئے اور بال بڑھاکو وحشیوں کی طرح پہاڑوں پر پھرنے لگے۔

مسافر کا دل یہ دیکھ کر خون کے آنسو روٹا تھا مگر وہ جاگیردار اور زمیندار کی فرجوں اور تروپوں کے سامنے بے بس تھا اور اس کی ٹانگ ٹوٹ چکی تھی۔ مسافر جانتا تھا کہ زمیندار بھی خوش نہیں تھا اس کے پاس دولت تھی، خوب صورت فرنیچر تھا، محل تھا، پھر بھی وہ خوش نہ تھا اس کے پاس دو پائتو فلکور تھے اور تین گڑ بگڑ، پھر بھی وہ خوش نہ تھا۔ اس کے باپ نے کوئی کام نہیں کیا تھا۔ اس کے دادا نے بھی کوئی کام نہیں کیا تھا۔ اس کے پردادا نے بھی پہاڑوں پر بخل گانے کے سوا کوئی کام نہ کیا تھا۔ پھر بھی زمیندار خوش نہ تھا۔

ایک دن سوچتے سوچتے مسافر کے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔ اس نے گاؤں والوں

سے کہا۔

تم گاؤں میں ایک چیل کا درخت لٹکاؤ، پھر اس پر زمیندار کا کوئی حق نہ ہوگا۔  
مند کے پاس چیل کا ایک درخت لٹایا گیا۔ پانچ سال، دس سال، پندرہ سال بیت گئے اور وہ درخت بہت بڑا ہو گیا۔ گرمیوں میں لوگ اسی کے گھنیرے چھتر وار سائے کے

نیچے آرام کرتے اور سر ہاں جب وادی میں برقیل ہواؤں کے جھکڑ چلتے تو وہ اس کی خاٹوں کو کاٹ کر اپنے گھروں میں آگ جلاتے۔ زیندار یہ دیکھتا تو اس کے سینے پر سانپ لٹتے لیکن وہ کچھ نہ کر سکتا تھا کیونکہ یہ چیل اس کی حکیت زخما سے اس کے باپ نے لگایا تھا تو اس کے ذواتے اور اس کے پر وادائے۔

اب ہر آدمی سے غرور تھا گئی چیل اور دیو دار پر اپنے پتے نکالنے لگے۔ حسین بادشاہوں کی طرح اگر کر چلتے والے شیر پھر سے اپنی وادی میں وہے چنوں سے گھومنے لگے۔ ایک دن جب سردار واد پر کے جنگل میں شکار کھیلنے گیا ہوا تھا تو ایک شیر نے اس پر حسرت کی اور اسے ہڑپ کر گیا۔ ریشمی کپڑوں والے سانپ پھلوں کے کجوں میں بدست ہو کر لڑنے لگے۔ رات کو ان کی ملار ساری وادی میں گونجتی۔ ایک دن ان میں سے ایک نے سافر کو ڈس لیا۔ سافر کا ایک ایک نیل پڑ گیا۔ اور زندگی کی کو دھیمی اور دھیمی ہوئی گئی۔ اور وہ مر گیا لیکن وہ مر نہیں، وہ زندہ ہے، وہ اس نیلے خوابیدہ دھوئیں کی طرح زندہ ہے جو شام ہوتے ہی دھڑپ کے پتھر پے گھروں سے اوپر چل کھاتا ہوا اٹھتا ہے۔

یہ کڑی کے درخت کی کافی ہے۔ اب میں آپ سے یہ بھی سنیں کہنا کہ آپ ہمیشہ غور و فکر اس میں سفر کریں۔ میں آپ کو اچھے اور صاف کپڑے پہننے سے بھی نہیں روکتا۔ میں آپ سے بھی نہیں کہنا کہ آپ صوفے سیٹ کی بجائے موٹروں پر بیٹھا کریں۔ میں آپ سے صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ پھتر وار چیل کے حامی ہیں یا دیو دار وار چیل کے؟ وہ کیسے سوچ کر جواب دیے۔ آپ کے اس جواب پر اس ملک کے کوڑوں محنت کش عوام کے مستقبل کا دار و مدار ہے اور دار واداب کا بھی۔

گھامرا نے اس افشاہ کو ملک کے سب مشہور ادبی رسالہ کے افشاہ نمبر کے لیے بھیجا۔ اس کی اشاعت پر گھامرا نے فریاد کیا کہ ہند کے اردو افشاہ نگاروں کی پہلی صف میں جگہ حاصل کی۔

جب جبر میں اس کا طوطی بولنے لگا۔ اس کے دل اس کے اس کمالِ فن پر حیران اندہ خوش ہوتے۔  
گھامڑ کئی ماہ تک اپنے نئے افسانوں سے اردو ادب کے دامن کو لالہ مال کرتا رہا۔ پھر اس  
نے تنوع کی خاطر سوچا کہ اب غزل گوئی میں کیوں نہ طبع آزمائی کی جائے تاکہ ادب کی یہ صنف بھی  
باقی نہ رہے لیکن غزل کہنا ذرا ٹیسرے ہی کھیر تھا۔ گھامڑ بچا رہا آزاد منش انسان — قافیہ اور دلیف  
کی بندشیں اس کے بس کا روگ نہ تھیں۔

اس نے غزل لکھنے کا خیال ترک کر دیا، اور کئی ایک جدید نظمیں پڑھنے کے بعد پورے پانچ  
منٹ میں آزاد نظم ”نویدر سحر“ لکھ ڈالی اسے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ یہ نظم بھی ایک شیا بکار تھی۔  
وہ نظم یہ تھی۔

## نویدر سحر

از:۔ گھامڑ

نویدر سحر سنو!

ڈم۔ ڈم۔ ڈم۔ ڈم۔

مرے ندیم سرور ہو، کو اب بیت گئی دات

نما دوں گے کہکشاں کی سبار تو دیکھ

پھیکے ہوتے جا رہے ہیں ظلم کے یہ عمبر دار

اور اب صبح ہونے کا نقطہ ہے انتظار

اور یہ سلاسل ٹوٹ جائیں گے سلاسل بے شمار

نویدر سحر سنو!

ڈم۔ ڈم۔ ڈم۔ ڈم۔



کو نظم اور سامراج کا درد ختم ہونے کو ہے  
ختم ہونے کو ہیں سوک و اسفت و خند دم  
بڑھ رہے ہیں غلوں کے جرم  
پھینکنے کے لیے اپنا حق۔ اپنی آزادی  
یہ مدقوق کچلے ہوتے فریادی  
ہندو سسے سے پرچموں کی چھاؤں میں  
ہر ایک کھیت میں۔ ہر ایک گاؤں میں  
قدموں کی چاپ ہے۔

چپ چپ چپ چپ

لوہیہ سحر سنو!

ڈم۔ ڈم۔ ڈم

سرور ہمارے ہر صغیر سن یہ قرنائِ آواز  
دیکھو یہ مایوس، بکھے دلوں کی لاہوتی پرواز  
اب اٹھ چھٹی جاتی ہے تاریکی۔  
پہن تھا۔ نقرئی لیں سنبھال  
کہ سحر ہو گئی اسے دوست۔

لوہیہ سحر سنو!

ڈم :

یہ نظم جیسی تراویح دنیا میں کمرام ہو گیا، اور بیسہ گھے سال کے منتخب ادب کا نمبر پوشا  
ہوا تو گھامش کی تین تخلیقات اس کے صفات کی ذہنیت تھیں جو ادب کے تین مختلف شعبوں میں  
اس کی استاد کی تائید دار تھیں۔ ————— ممتاز انجمنِ اہلِ اہمات۔ رشور میں۔ نیم شوری، اور

لاشوری۔ افساد، لکڑی کا دوست، اور اس کی نظم "نورید سحر" — تینوں انتخاب کی زینت بنیں۔  
یہ ایک ایسا امتیاز تھا جو بہت کم ادیبوں کو نصیب ہوا ہے اور جس سے کئی پرانے ادیبوں کو  
اس سے شکی بغض ہو گیا۔

ادبی شہرت کے زین پر چڑھنے کے بعد گھامڑ کی طبیعت یک لخت لکھنے لکھانے سے کشتی  
ہو گئی اور اس نے کھانا باکھل ترک کر دیا۔ ایڈیٹروں کی طرف سے ایک دو سال تک قرائشیں  
آتی رہیں لیکن وہ شس سے مس نہ بنایا۔ بات یہ تھی کہ اس نے شادی کر لی تھی اور خانہ داری کے  
جنگل اور تنگ محل کے بھیرؤں کے گھامڑ کو سب چوکڑی جھلا دی تھی اور اس کا دماغ ٹھکانے  
لگا دیا تھا۔ تین سال کے بعد تو وہ یہ بھی بھول گیا کہ اس نے کبھی ادیب کی حیثیت سے اچھا کیا  
نام پیدا کر دیا تھا — عجیب بات یہ ہے کہ اس کا نام اس کے ماحول کے دماغوں سے بھی  
جلد ہی غم ہو گیا۔

ادبی شہرت کی عمر بھی کتنی مختصر ہے !

# ڈیلو سے نوں کوٹ تک

## ایک سفر نامہ

”ڈیلو سے نوں کوٹ تک“ صوبہ سندھ کے ضلع قنبراہ گرد قنبراہ میں ایک گاؤں ڈیلو اور ایک دیوے اسٹیشن نوں کوٹ کے درمیان ایک سفر کی روداد ہے۔ یہ سفر ستمبر ۱۹۲۵ء میں کیا گیا تھا۔ لکھنے والے جذباتی ہم آہنگی کے مد نظر صیغہ واحد استعمال کرنے پر مجبور ہیں۔

جب میں ڈاکٹر کوکرواد جاکنے کے بعد لوٹا تو دونوں ساربان اونٹوں کی عمارتیں تھیں دو دروازے کے باہر بیٹھے میرا انتظار کر رہے تھے۔ سوچ ابھی ریت کے ٹیلوں سے نیزہ مہر اور پچا تھاگر ڈیرجی کا مشورہ تھا کہ مجھے ابھی روانہ ہو جانا چاہیے۔ سو ایک ساربان کو اونٹ پر ”پاکھر“ ڈالنے کے لیے کہا گیا۔ ڈیرجی نے (جو ایک پیدائشی شتر سوار ہیں) میری کتابیں ایک چادر میں دو برابر گھسٹریوں میں اس طرح باندھ رکھی تھیں کہ متوازن سورت میں اونٹ پر باسانی دھری جاسکیں۔ انھوں نے شام کا کھانا جو مدٹیوں اور گھی میں تھے ہوئے انڈوں پر مشتمل تھا، پسے سے انباروں میں لپیٹ رکھا تھا اور اس پر بندھے ہوئے رنگین فیتے لٹے تو اسے اچھا خاصا نفیس بندل بنا دیا تھا۔ اس بندل کو نہایت محنت اور چابکدستی اور انگلیوں کے دباؤ سے حجامت کے ٹھیلے میں ڈالنے کی کوشش کی گئی اور جب یہ کوشش ناکام ہوئی نظر آئی تو اسے نہایت جوندے طریق پر پھونسن دیا گیا۔ انسان کے دماغ میں عقاست اور غیبت

پہلو بہ پہلو موجود ہیں۔ اس لیے نفیس ہڈی کو حجامت کے حقیلے میں ڈالنے کے بجائے ٹھرنے پر مجھے مصلحت نہیں کیا جاسکتا، یہ حجامت کا قیلا سچ مچ طریقہ کار نہیں ہے۔ اس میں اتنی چیزیں سما سکتی ہیں کہ آپ ان کا تصور تک نہیں کر سکیں گے اور جب یہ بالکل سب سے اعلیٰ اور ہمارے کمرے کی سی صورت اختیار کرے تب بھی اس میں کئی ایک چیزوں کی گنجائش ممکن آتی ہے۔ اس حقیلے کو ہم نے پاکھڑے کی گھنڈی سے لٹکا دیا۔ ساربان اندر سے میرا ہڈی ڈال اٹھا لایا۔ دیر جی اور ساربان نے مل کر اسے پاکھڑے پر کچھ اس طرح بچا دیا کہ میرے اور ساربان کے لیے دو نہایت ملائم اور آرام دہ نشستیں بن گئیں۔ یہ اطمینان کر کے کہ کوئی چیز رہ تو نہیں گئی۔ میں دیر جی کو آخری ہدایات دے کر اپنی نشست پر بیٹھا۔ دیر جی کے لیے میلادوں و دھواں شکر گزار تھا۔ اچھا آہی۔ وہ میرے لیے اتنا ہی مددگار ثابت ہوا تھا جتنا شہر و مشر کے لیے مشر جو میرے پیام کے دوران میں سوائے اللہ دین کے پرانے کے وہ میرے لیے سب کچھ مہیا کرتا، ہاتھ۔ اور فی الواقع ڈیلر میں وہ میرے لیے لازمی اور ناگزیر اور جانے کیا کیا ہو گیا تھا۔

ساربان اپنی نشست پر آیا تو دھواں و شب معمول چند بے شکے کا ویسے بنا کر اٹھا۔ میں اب بہت ہندو ہر چکا تھا، دیہاتی مکانات کی مشیروں کے برابر میں نے نیٹ جھوڑ کر دیر جی کو اور ایک مبہم طریق پر ڈیلر کو الوداع کہا اور تھوڑی ہی دیر میں ڈیلر اور اس کے اچھے لوگ ہمارے عقب میں تھے اور ہمارے سامنے حواس باختہ سورج کی زردی اور لالی کا عجیب سا انتزاع — جیسے آگ بھڑک رہی ہے — جیسے آگ بجھ رہی ہے۔

وہی چینگینوں اور گوبرے پٹی ہوئی ریتی چراگاہ، ٹیلوں پر چلائی کرتی ہوئی بھریاں کنوئیں میں سے پانی کھینچتی ہوئی تین عورتیں جو دروازے پر بیٹھیں معلوم ہوتی تھیں۔ بیٹہ منشی دھارے ہاں اسے نائب تحصیل دار کہتے ہیں، ان کے سر اور ننگے پاؤں، ہاتھ میں دسی لیے اپنی گائے کے پیچھے دوڑتا ہوا اور اپنی بیٹہ منشی شپ کے آداب اور مصلحتوں کی

پر داد کرتا ہوا اور دوسرے کول کے لڑکے فٹ بال کہتے ہوئے فٹ بال کی آواز سے معلوم ہوتا تھا کہ اس کے اندر ہوا فوراً دمی پیپ کے بجائے انسانی پیپسروں کی مرہون منت ہے اور مسٹر ویروانی ہیڈ ماسٹر وہی ٹھٹھٹھا گھولتا ہوا بدحواس آدمی — اپنے الگ تنگ مکان کے سامنے والی گلی میں کھڑا ہے ہاتھ ہلا کر اوجھلایا ہوا یا شاید مجھے یاد دلانا ہوا کہ میں پٹے ہوئے اس کے لیے نادر گلیاں لانا دھول جاؤں — یہ تھے ڈیلو کے آخری فقرے۔

اس کے بعد میں تھا اور میرا ربابان — اور وہ جنگل کی بوٹیوں اور خورد و حیاڑیوں میں سے لڑتا ہوا تبتہ راستہ جو سامنے ریت کی ایک اونچی پہاڑی پر چڑھ گیا تھا — ڈاکٹر اور میں اس پہاڑی کی چوٹی تک کئی مرتبہ آئے تھے۔ اسی پہاڑی پر سے میں نے پہلی بار ڈیلو کو نیچے نشیب میں ایک کھوٹے ہوئے دھان کے شہر کی صورت میں دیکھا تھا۔ اب بھی ڈیلو سنہری شام کے شامیانے سے بالکل مطمئن اور بے پروا انداز میں چڑھا تھا۔ ڈیلو کو میری جدائی کا چنناں احساس نہ تھا۔ پھر اونٹ ٹیلے کی دوسری طرف اتر گیا اور ڈیلو میری نظروں سے غائب ہو گیا۔

منظر انسانی و محض تھا اور ایک انوکھے صحرائی صحن کا حامل۔ جنگل کی خورد و حیاڑیوں سے ڈھنپنی ہوئی ریتیں داویاں اور پہاڑیاں جو بالکل اصل داویوں اور پہاڑیوں کی طرح نظر آتی تھیں۔ کہیں کہیں عجیب سے ڈیرے ڈیرے اکیلے اکیلے درخت بھی تھے — کاش میں آپ کو سب بوٹیوں اور درختوں کے نام بتا سکتا مگر میں علم الطبیعیات کا ماہر نہیں ہوں۔

کہیں کہیں جہیں موروں کی پیدائش ہوتی تھی وہاں سے جاتی — ایک مرتبہ تو ساربان نے اشارے سے مجھے مورو دکھائے بھی جو قدرت کے اس جنگل باغ میں غرور سے اپنے رنگین پروں کی صبر و کدھانے تھے اور مورتیاں ان کے سامنے کمرہ می تھیں صحرانورد اس اور شاید منتظر بھی — دیکھو کتنا چتے ہوئے مورو کی آنکھ سے ایک آنسو پگھلتا ہے جسے مورتی "پگ" کہتی ہے اور یہی آنسو مورتی کے پیش میں انڈے کی قبر کی بنیاد ثابت ہوتا ہے — آنسو اور نسل کشی! عجیب سی بات ہے مگر

کھنڈری قدرت ہر انسانی ڈھانچے کی خاکستر سے پھول کا سکتی ہے اگر انسانوں سے انڈا پیدا کرنے کو حیرت بیکار ہے، پھر فاختہ کی آواز آئی، جو اس گلابی جھپٹے میں نیم خوابیدہ پہاڑیوں اور درختوں اور جھاڑیوں کو اپنا ایک ہی ادبی پیغام سنائے جا رہی تھی۔ کوکو کو۔ مرقم آوازوں کی بہری تھیں جو فضا میں آن کی آن میں پک جاتی تھیں۔ کھنڈائی ہوتی صداؤں کے چھینے تھے جو اندھیرے اہالے کی معدوں کو بلگوتے دے رہے تھے۔ کوکو کو پنجاب میں جاب ہم فاختہ کو گھٹکی کہتے ہیں، ایک عجیب سی لیکن بڑی خوبصورت کہانی مشہور ہے۔ بزرگ کہا کرتے تھے کہ گھٹکی کہتی ہے "یوسف کھوہ۔ یوسف کھوہ۔" جب حضرت یوسف کو ان کے بھائیوں نے کنوئیں میں ڈال دیا تو یہی گھٹکی تھی جو ان کے ہرڑے والد حضرت یعقوب کے پاس یہ پیغام لے کر آئی تھی۔ "یوسف کھوہ، یوسف کھوہ۔" یوسف کنوئیں میں ہے، یوسف کنوئیں میں ہے! — خدا جنت نصیب کرے ہمارے صدیوں کے پرانے افغان نگار کو جس کی تنید نے گھٹکی کو کاشفت الاسرار بنا دیا!

اونٹ کی چال ریاضی کے سانچے (SIGN CURVE) کے نیچے سے کچھ نہ کچھ شاہت رکھتی ہے، پسے آپ نیچے جاتے ہیں اور پھر اچانک نہیں بلکہ ایک متوازن گھماؤ کے ساتھ اوپر اٹھ جاتے ہیں اور اوپر اٹھتے ہی پھر نیچے چلے آتے ہیں۔ جیسے سمندر کی لہروں پر۔ لیکن میں اونٹ کی پیٹھ پر بیٹھ کر اتنا خوش نہیں تھا۔ ایک ٹوٹتے تنگ تھی دوسرے دو کتابوں کی گھڑیاں جنہیں دیر جی نے میرے آگے پکڑے ہو رکھا تھا۔ بار بار میرے گھٹنوں سے ٹکراتی تھیں، شروع ہو کر تیر کتابیں میرے گھٹنوں کو سلاتی رہیں، پھر ٹکیاں پنے لگیں اور اب لڑکے کی سانچے کی طرح انہیں چھیدے جا رہی تھیں۔

ڈیپو سے نوں کوٹ تک کا راستہ انہی ریشی پہاڑیوں کا لاتنا ہی سلسلہ ہے۔ چڑھا ڈاؤن تار۔ تار اور چڑھا ڈاؤن، بالکل اونٹ کی چال کی طرح۔ بالکل سمندر کی

سروں کی طرح۔ عین میں سلسلہ خیالات کی طرح۔ ان پہاڑوں کے درمیان سرائیوں میں  
کیس کہیں باجرے کے کھیت عرف بنیاں ہیں جن میں چھائیاں بافراط سہتی ہیں۔ تقریب  
ہندو دنیا تر بوڑ کو چھائی کتے ہیں۔ چھائی تقریب بہشت کا اکڑنا چل ہے اس لیے اسے  
نہایت شوق اور قدر سے تعظیم اور احترام سے کھایا جاتا ہے، چھائیوں اور ایک دوا دہ  
سبزیوں کی پیداگش کا یہی موسم ہے۔ چھائیوں کے موسم سے چند مہینے پہلے لوگ  
ایک دوسرے سے ان حسین اور خوش آئند گھریلوں کی باتیں کرتے ہیں۔ جب یہی چھائیوں  
کی کثرت ہوگی، یہاں احترام اور انتظار ایسے ملک میں فطری ہے جہاں سارے سال اور کوئی  
پھل یا سبزی نہ آگتی ہو۔

اگر آپ ابدیت کا اندازہ لگانا چاہتے ہیں تو میں آپ کو ڈیڑھ سے نوں کوٹ تکا دھٹ  
پر سوار ہو کر رات کے وقت سفر کرنے کا مشورہ دوں گا۔ سوچ غریب ہر تہم ہی اس  
سفر میں ابدیت دہننے لگتی ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے جیسے یہ سفر کہیں ختم نہیں ہوگا۔ رات  
کے ٹیلے ایک دوسرے کے بعد موت کی سی اٹل ناگزیریت کے ساتھ آتے ہیں اور مسافروں  
محسوس کرتا ہے جیسے بقا کی اس بے پایانی میں اسے ان ٹیلوں سے قطعی کر بی مفر نہیں۔  
یہ سفر ایک پرانے مریض کی زندگی سے بھی زیادہ طویلانی ہے۔

دندہ نہ سربہ افق بچے کچے گلاب کی تلچٹ پی گیا اور وہ ختوں اور جھاڑیوں پر رست  
کی سیاہی یعنی ابدیت کی کمر چانے لگی۔ ناخوش چپ ہو گئی، اس کے نفوں کی جگہ جھینگروں اور  
مشرات شبی کی مسلسل تیر اور زیر و بم سے بے نیاز پکاروں ملے لے لی۔ البتہ کبھی کبھی کسی شب  
زندہ ہلا پر دم سے کی احساس

چاندنی رات تھی، تیر حیریں کا بڑا اور برٹ جیسا سفید چاند سات آسمان پر پوری شان  
سے چمک رہا تھا۔ ہر جھاڑی اور بوٹی دیکھنے اور ٹٹٹٹے لگی تھی اور گرد کی پٹریاں چاندنی

کھنڈری قدرت پر انسانی ڈھانچے کی خاکستر سے بھول لگا سکتی ہے، اگر انہوں سے انڈیا پیدا کرنے کی توجہ نہ ہو، پھر فاختہ کی آواز آتی، جو اس گلابی جھپٹے میں نیم خوابیدہ پہاڑیوں اور درختوں اور جھاڑیوں کو اپنا ایک ہی ابدی پیغام سناتے جا رہی تھی — کوکو کو — مرقم آوازوں کی بہری تھیں جو فضا میں آن کی آن میں پک جاتی تھیں۔ کھنڈاتی جرنی صداؤں کے پھینے تھے جو اندھیرے اہلے کی حدوں کو بلگوئے دے رہے تھے۔ کوکو کو پنجاب میں تھا، ہم فاختہ کو گنگلی کہتے ہیں ایک عجیب سی لیکن بڑی خوبصورت کہانی مشہور ہے — بزرگ کہا کرتے تھے کہ گنگلی کہتی ہے "یوسف کھوہ۔ یوسف کھوہ۔" جب حضرت یوسف کو ان کے بھائیوں نے کنوئیں میں ڈال دیا تو یہی گنگلی تھی جو ان کے بوڑھے والدہ حضرت یعقوب کے پاس یہ پیغام بے کرا آتی تھی — "یوسف کھوہ یوسف کھوہ" — یوسف کنوئیں میں ہے، یوسف کنوئیں میں ہے! — خدا محنت نصیب کرے ہمارے صدیوں کے پرانے افانہ نگار کو جس کی تنقید نے گنگلی کو کاشف الاسرار بنا دیا!

اونٹ کی چال ریاضی کے مسائل کو دہا (SIGN CONVEY) کے نیچے سے کچھ نہ کچھ شائبہ رکھتی ہے، پہلے آپ نیچے جاتے ہیں اور پھر اچانک نہیں بلکہ ایک متوازن ٹکڑے کے ساتھ اوپر اٹھ جاتے ہیں اور اوپر اٹھتے ہی پھر نیچے چلے آتے ہیں — مجھے سند کی لڑوں پر — لیکن میں اونٹ کی پیٹھ پر بیٹھ کر اتنا خوش نہیں تھا، ایک تو نشست تنگ تھی دوسرے وہ کتابوں کی گھنڈیاں جنہیں دیر ہی نے میرے آگے پا کر سے پر رکھا تھا۔ بار بار میرے گھنڈیوں سے ٹکراتی تھیں، شروع میں تو یہ کتابیں میرے گھنڈوں کو سلاقی رہیں، پھر ٹپکیاں مینے لگیں اور اب راجے کی سلاخ کی طرح انہیں چھیدے جا رہی تھیں۔

ڈیپو سے نوں کوٹ تک کا راستہ انہی رتھی پہاڑیوں کا لانتا ہی سلسلہ ہے — چڑھا تو در اندازہ، اتار اور چڑھا تو اب بالکل اونٹ کی چال کی طرح — بالکل سند کی



ڈپلو سے نوں کوٹ لک

سروں کی طرح۔ عین میں سلسلہ خیالات کی طرح۔ ان چاروں کے درمیان ترائیوں میں  
کیس کیس باجرے کے حکمت عرف بنیاں ہیں جن میں چھائیاں باغراطہ ہوتی ہیں۔ تقریب  
ہندوانیا ترلوہ کو چھائی کہتے ہیں۔ چھائی تھری بہشت کا اکھوتا پھل ہے اس لیے اسے  
نہایت شوق اور قدر سے تعظیم اور احترام سے کھایا جاتا ہے، چھائیوں اور ایک دوا اور  
سبز یوں کی پیداگش کا یہی موسم ہے۔ چھائیوں کے موسم سے چند مہینے پہلے لوگ  
ایک دوسرے سے ان حسین اور خوش آئند گھڑیوں کی باتیں کرتے ہیں۔ جب چھکی چھائیوں  
کی کثرت ہوگی، یہ احترام اور انتظار ایسے ملک میں فطری ہے جہاں سارے سال اور کوئی  
چھل یا سبزی نہ آگتی ہو۔

اگر آپ ابدیت کا اندازہ لگانا چاہتے ہیں تو میں آپ کو ڈپلو سے نوں کوٹ تک دھڑ  
پر سوار ہو کر رات کے وقت سفر کرنے کا مشورہ دوں گا۔ سوچ غروب ہوتے ہی اس  
سفر میں ابدیت دہنے لگتی ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے جیسے یہ سفر کسی ختم نہیں ہوگا۔ ریت  
کے ٹیلے ایک دوسرے کے بعد موت کی سی اٹل ناگزیریت کے ساتھ آتے ہیں اور مسافروں  
موسس کرتا ہے جیسے بقا کی اس بے پایانی میں اسے ان ٹیلوں سے قطعی کوئی مفر نہیں۔  
یہ سفر ایک پرانے مریض کی زندگی کا ہی جیسا نیا دہر لاتی ہے۔

دفتر دفتر سفر بنی افق بچے کچے گلاب کی تلپٹ بجی گیا اور درختوں اور چھاڑیوں پر رات  
کی سیاہی یعنی ابدیت کی گر چھانے لگی۔ فاختہ پ ہو گئی، اس کے نغموں کی جگہ جھینگروں اور  
حشرات شجی، کی مسلسل آواز اور نہر دہر سے بے نیاز پکاروں نے لے لی۔ البتہ کہیں کہیں کسی شب  
زندہ ہول پر دم سے کی اماں

چاندنی رات تھی، تیر حویں کا بڑا اور برت جیسا سفید چاند صاف آسمان پر پوری شان  
سے چمک رہا تھا۔ ہر چھاڑی اور بوٹی دیکھنے اور ٹھٹھانے لگی تھی اور گرد کی پہاڑیاں چاندنی

میں بحرزدہ کھڑی تھیں، ہمارا راستہ جھاڑیوں میں سے سفید جھلک مارتا ہوا ریگ ربا تھا۔  
جھلک کی دات کی مخصوص آوازوں کے علاوہ ہمیں کبھی کبھی نیچے کسی کوٹ میں موشیوں کی  
گھنٹیوں کی تشناہٹ سنائی دے جاتی جو ہمیں باقی کو ہم انسانی آوازوں سے دور نہیں۔ بعض  
اوقات تو ہم لوگوں کے ہنسنے بولنے اور بھاگنے کی آوازیں بھی سن لیتے تھے۔

یہ طلسم جو چاندنی جھلک اور درختوں پر چڑھتی ہے، صرف ایک بہت بڑے ساحر کا  
کام ہے اور خست عجیب خیال صورتوں میں بدل جاتے ہیں۔ رہنم و فدوہ عظیم آسمان کو چھوتے  
ہوئے دیو بن جاتے ہیں اور کئی مرتبہ وہ یک کو دھرا دھرا پھیل جاتے ہیں، میں نے ایک  
درخت دیکھا جو اس وقت ایک بہت بڑا بادبانی جانا بنا ہوا تھا اور یوں معلوم ہوتا تھا  
جیسے وہ اپنے تمام بادبان پھیلائے کسی جزیرے میں مدفن خزانے کی دھن میں دفنانے  
ہونے کو تیار کر رہا ہو۔ ایک درخت جو ہوائی چکی کا روپ دھارے تھا، میرے غور  
سے دیکھنے سے فوراً اپنی اصلی شکل میں آگیا۔ اور وہ ایک بڑا اور صیب ٹیک جو میرے  
قریب آئے پر لکیر میں بدل گیا۔

کئی دفعہ جھاڑیاں اور لہراتے ہوئے یہ ریتیلے راستے مدھم دھنسی اور سائے اور سکوت  
سب مل کر ایک مہم سا کھویا کھویا مگر بہت بڑا انسانی شرم بن جاتے ہیں۔ میناروں، گنبدوں  
اور محرابوں والا شہر — میں نے راستے میں ایسے ہی دو مین شہر دیکھے، اور اگرچہ میں جانتا  
ہوں کہ وہ میرے ذہنی قریب تھے جو جھلک اور چاندنی اور سکوت کی باہم سازش کا نتیجہ تھے مگر  
میں اب بھی یقین سے نہیں کر سکتا کہ وہ اصلی شہر نہیں تھے۔

ایک مرتبہ میں نے جھلک میں ایک تیز سیٹی کی آواز سنی — ریل کی سیٹی کی آواز۔  
میں جانتا تھا کہ ریل یہاں سے نہیں چلتی تھی۔ اور اگر یہ آواز ایک مرتبہ بند ہو کر رک  
جاتی تو میں یہی کہہ کر اپنا پھانساں کو سہلاتا کہ میرے کان کو غصہ ہے یا دات کے کسی

پر نئے نئے چیل کی ہے، مگر میں نے سینٹی کے بعد گاڑی کی مدھم چپکا چپکا چپکا چپک بھی سنی اور پیہروں کی ہلکی گڑگڑاہٹ بھی، جیسے کوئی گاڑی چابک حرکت میں آگئی ہو، یقیناً یہ کوئی نظر نہ بخالی آسکی گاڑی تھی جو ان خلیوں میں سے گزر کر ہو تلوں کے کسی شہر کو جا رہی تھی۔ ذرا اس ریل گاڑی کا تصور کیجئے جس کے ڈرائیور سے بے کر گاڑی اور مسافروں تک سب جتنے ہوں — بچتے اور جتیاں — بجگڑوں کے ذریعے اور خشک تربوزوں کے پچی کیس اور کیلے کے پتوں کے بستر اور — ہاتھ یہ چاندنی کا جادو اور یہ انسان کی قوت خیال جو نصف میل کی نفیٹ کا باعث بنی !

رات کے ساتھ چاند کی کرنوں کا بحر بھی بڑھتا گیا، چاند کے کھنڈر سے ساتھی تارے بھی جیسے چمکاتے اور شرما تے ہوئے اپنی سیٹی پناہ گاہوں سے باہر آگئے۔ شروع شب میں ایک گھڑ سوار اور ایک شتر سوار راستہ میں تھے مگر اب تین چار گھنٹوں کے طویل وقفے اور طویل تر مسافت کے دوران میں میں رہا غم کوئی ذی روح نہ ملا۔ اگرچہ پوشیوں کی گھنٹیوں کا ٹٹنا نہیں جہیں اپنے ہم جنسوں کی قربت کا احساس دلاتی رہیں۔ میں ساربان کی زبان، اور ساربان میری زبان سے نا آشنا تھا اس لیے گفتگو کی کوشش بار بار قیامت نہ ہوتی تھی اور ایک آدمی مدھی منتر سے مثلاً فلاں مانو سنتو ہے، سے شروع ہو کر ختم ہو جاتی تھی ساربان پر چتا "صوبہ دار سنتو مانو ہے" — یعنی کیا صوبہ دار اچھا آدمی ہے؟ اور میں جواب دیتا "سوتو دار سنتو مانو ہے" ساربان کے سب سے میں اس کا مالی انصاف کسی حد تک سمجھ لیتا مگر یہ قوت تبادلاً خیالات میں مداخلت نہ ہو سکی۔ گفتگو کی تمام کوششوں کو بے بسی کے گروے سے نیچے اجنبیت کی کھاڑیوں میں گرتے دیکھ کر ساربان شاید بالکل ناامید ہو گیا اور عجیب جھنجھٹی ہوئی پیمپی بھی غیر قدق آواز میں گانا شروع کر دیا، اور اپنی ناک کو اٹھوٹھے اور انگشت شہاد میں لے کر اس سے وہی کام لینے لگا جو گوئیے ہنڈر سے لیتے ہیں اور کچھ اس کی

ناک کی "تخ" کسے ہوئے تاروں واسے ساز کی طرح سینہ اور تیز تھی۔

یہ کافی بے سراگیت تھا۔ سفر سے کتابت اور ایسی سکوت کے شدید احساس کے باوجود میں نہیں چاہتا تھا کہ اس گیت کو جاری رکھا جائے، میں سوچا رہا کہ آخر اس گیت کا مطلب کیا ہو سکتا ہے، کیا یہ کسی نوجوان دیہاتی کے عشق کا گیت ہے، کیا یہ کوئی دزدیہ نثر ہے اور "مٹھو گھوڑا" کون ہے اور بار بار اس سے کیا درخواست کی جا رہی ہے۔ کاش اس وقت میری توجہ ہوتے۔ وہ امرت دھارا قسم کے انسان جو شکیر کا سن پیدا کرنا اور شغف کے کیا دیباچہ ایک سانس میں بنا سکتے تھے۔

شاید "مٹھو گھوڑا" بہت اڑیل ثابت ہوا، اور ان تمام شاعرانہ درخواستوں کو پی گیا جو ساریاں نے اس کے حضور گزرائی تھیں۔ "مٹھو گھوڑے" کی بے اعتنائی سے تنگ آکر ساریاں نے ایک اور گیت شروع کیا جو اگرچہ اسی تیز و تند "تخ" کی دھن پر اور اسی تین کے گھنٹے کی آواز میں لایا گیا میرے خیال میں "مٹھو گھوڑے" کے گیت سے زیادہ معقول اور بامعنی تھا۔

جلد ہی وہ گیت سے بھی شک گیا اور پھر ایک دفعہ وہاں جو قبائلی طرح لیا اور کائنات کی طرح وسیع تھا اور جو چاندنی اور شکل کی سائیں سائیں سے بہرہ تھا۔ ہم چپ چاپ سفر کرتے رہے۔ ہم ایک متاب زدہ ٹیلے پر چڑھتے اور نیچے ایک تولاٹی کے انجام پر ایک اور متاب زدہ ٹیلا ہمارا منتظر ہوتا۔ کتابوں کی گھنٹیوں نے میرے گھنٹوں کا اپریشن کر ڈالا تھا۔ ایک بار ساریاں نے مجھ سے پوچھا "آرام سے بیٹھے ہو مائیں؟" میں نے اس سے ٹوٹی چھوٹی سندھ میں کتابوں کی مسلسل نوازشوں کی شکایت کی، "جے وہ شاید سمجھ نہ سکا یا میری شکایت کو اس نے سمجھ ہی نہ سکا، وہ یہ کیسے محسوس کر سکتا تھا بے چارہ کہ کتابوں ایسی بے ضرر چیزیں بھی کبھی کبھی انسان کا جینا اپن کر سکتی ہیں۔

ہم ایک جوہر کے پاس سے گزرتے ہوئے انسانی میں دھم شیعہ کی ٹکون معلوم ہو رہا تھا۔

ساربان نے جو ہر کی طرف عجیب آواز دینا لگا ہوں سے دیکھا۔ وہ شاید سوچ رہا تھا کہ اس کے کنارے بیٹھ کر کھانا اور کچھ دیر آرام کرنا سناٹ موزوں رہے گا۔ اونٹ کی رفتار بھی دھم دھم تھی مگر مجھے ابھی کھانے کی مطلق خواہش نہ تھی۔ کتابوں کی گھنٹیروں کی مسلسل چانداری اور ناگوں کے دبڑ بڑ جانے کے باوجود میں چاہتا تھا کہ منزل مقصود پر پہنچ کر آرام کیا جائے۔ ساربان نے اپنی سست رفتار ہی کا جواب میری خاموشی میں پایا اور ساتھ ساتھ کڑی تیز قدم اٹھانے لگا۔ دو گھنٹے کے سفر کے بعد ہم ایک بے کوٹ (گاؤں) کے قریب سے گزرے۔ ہمیں بہت سی گھنٹیوں، باتوں اور فتقوں کی آوازیں سنائی دیں۔ مجھے گمان سا ہوا کہ اسٹریک کوٹ موجود ہے مگر وہ کوٹ ہمیں نے دیکھا سرب آسا تھا۔ چاندنی اور ریت کا ایک قریب جی کا ذکر پہلے کر آیا ہوا۔ یہاں ایک اونچے دیبے نیلے پر جہاں دوڑا ہی آسمان کی طرف رخ کیے مردوں کی طرح بے ہوش پڑے سو رہے تھے۔ میرے ساربان نے "شو شو" کر کے اونٹ کو بٹھایا۔ اب کس اس نے میری رضامندی ضروری نہیں سمجھی میں عبور اونٹ سے نیچے اترا یا کیونکہ بیٹھے ہوئے اونٹ پر بیٹھ کر عجیب عذاب معلوم ہوتا ہے۔ کچھ دیر میں ریت پر چل تھمی کر بارہا اور جب خون کی گردش اپنا معمول اختیار کر چکی تو ان خواہیدہ مسافروں کے پاس تیلے فرش پر بیٹھ گیا۔ ساربان نے اونٹ کو دو چار ٹانڈے پیش کیے اور حمایت کے تحیلے میں سے کھانے کا بڈل نکال کر میرے سامنے رکھ دیا۔ مجھے دیر ہی یاد آگئے انہوں نے کاغذوں اور فیٹوں کی مدد سے اس پکے کو ایک پیشہ ور مثالی فروش کی سی چابک دستی سے باہر نکالا۔ لکھی میں تل ہوئی روٹیاں اور آٹے سے ہیں نے چھ روٹیاں اور نصف سالن ساربان کے حوالے کر دیا اور اب میں اور میرا اونٹ دلالہ ویرانے عبور میں کی طرح کٹھن بیٹھ کھانا کھانے لگے۔ اونٹ جو اب مجھے بڑا نظر آتا تھا دانتوں کے آبار بیٹھا جھکی کر ہاتھ اپنے دالسان و دستوں کو کل بے اعتنائی سے دیکھ رہا تھا۔ ہم ٹھوڑی کی طرح کھاتے رہے۔ کسی انسان کو کھانا اتنا لذیذ نہیں معلوم ہوا ہو گا جتنا یہ دنیا کے بدترین

بادی کا تیار کردہ سالن اور موٹی موٹی روٹیاں۔ مگر یہ کھانا ہم نے ڈانٹنگ دوم سے تکلفات میں گھر کر نہ کھایا تھا۔ خاصے کھانے گھر کے کھانے انگن میں ازلی ریت کی چاندنی پر بیٹھ کر اور وہ گھنٹیوں کی مٹا ہونے کو سنتے ہوئے ہم نے یہ دعوت اٹائی تھی۔

میں نے ساربان کو دو اور روٹیاں دیں اور تھوڑی دیر کے بعد جب اسے کچھ اور دینے کی کوشش کی تو اس نے اٹھا کر دیا۔ اب تین روٹیاں بچے رہی تھیں اور میں سوچ رہا تھا کہ ان کا کیا کیا جاتے آخر میں نے انہیں ساربان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "اٹ" اور اونٹ کی طرف اشارہ کیا۔ میری تجویز یہ تھی کہ اس دعوت میں اونٹ کو بھی حصہ دار بنانا چاہیے۔ ساربان نے جواب میں ہنسنے لگا۔ مجھ سے لڑائیاں لے لیں اور میری حیرت کی حد نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ اس نے ان کا ایک گولا سا بنایا اور انہیں خود ہی کھانے لگا۔ تھوڑی سی دیر میں تینوں روٹیاں اس کے پیادہ پٹ میں تھیں۔

اب سوال پیدا ہوا پانی کا۔ میں بہت پیاسا تھا۔ ٹوٹی چھوٹی سندی میں میں نے کھانا پانی دھٹے یعنی پانی چاہیے۔ اس نے جواب دیا: نہ پانی نہ دھٹے چھائوں دھٹے۔ اور ہم طرے پر بیٹھے اشارہ کیا۔ اس نے ایک لمبی تقریر کی جس میں بیوں اور چھائوں کے الفاظ بار بار آتے تھے، میرا ساربان ایک خوبصورت گھوڑا لگا تھا۔ اس کی آواز رسلی اور ماٹوں سے برتر تھی اور میں سوچنے لگا کہ وہ اپنی اصلی آواز میں گانے کی بیاتے اس باوریک غیر قدرتی آواز میں گانا کیوں پسند کرتا ہے جس کی طرح موسیقی کے بھی کتنے بے شمار میاں ہیں۔

اس نے کہا: ہوسائیں! کھانے کے بعد وہ زیادہ معذوب اور منون نظر آ رہا تھا۔ ہم اونٹ پر سوار ہوئے اور نیچے توان میں اتر گئے۔ ہمارے بائیں طرف ایک بچی تھی، ساربان اونٹ کو بہت آہستہ چلاتا، ایک طرف جھک کر پھل پھلے ہوئی بیوں اور باجرے میں کسی چھائی کی تلاش میں تھا۔ ایک جگہ اس نے اونٹ کو روک لیا۔ ہم دونوں نیچے اترے۔ وہ بچی میں

۴ پہلے سے نوں کوٹ تک

گھس گیا اور بازوؤں اور کینوں تلے پانچ چو بنیاں دبائے کچھ دیر بعد واپس آگیا۔ ہم دونوں وٹ دراستہ کے کنارے پر بیٹھ گئے۔ اسی طرح اکاؤں کے دو فیغوں کی طرح۔ چائیاں ہمارے سامنے تھیں وہ ان کو توڑ کر زمین پر رکھتا اور میری طرف مسکرا کر دیکھتا۔ ہم نے انھیں کھا کر اور ان کا بیٹھا اور شندھارس چوس اور پانی کرا پنی پیاس بجھائی۔

تھوڑی دیر جا کر ہم نے تیس پینتیس اونٹوں کے ایک قافلے کو جالیا۔ مجھے اونٹوں کی وہ قطار کچھ عجیب سحر آمیز طریق پر علی بابا کی کہانی کے چالیس چوروں کی طرح معلوم ہوئی اونٹ چڑے کے بڑے بڑے ٹکوں سے لڑے ہوئے جا رہے تھے۔ ہمیں بتایا گیا کہ ان میں بھی ہے۔

مگر مجھے یقین تھا کہ ان میں بھی ایسی عام اور غیر روحانی چلی چیز نہیں ہو سکتی دیکھی سے تو زمین کا تیل زیادہ روحانی ہے میرے نزدیک تو ان ٹکوں میں خود چالیں چوہی جیسے بیٹھے تھے اور ان کا سردار تیل کے ایک سو وارگر کے جیس میں ان کو علی بابا کے گھر انتقام لینے کی خاطر ٹکوں میں چپا کر لیے جا رہا تھا۔ ڈاکو۔ یا تو غلطی سے ساربان بڑے خوش باش قسم کے بے فکرے معلوم ہوئے تھے، وہ اچھلتے ناپتے اور گاتے جا رہے تھے۔ میرا ساربان ان میں سے کئی ایک کو جانتا تھا۔

خاص کر ایک بکرے کی وارٹھی والا پھر نیلا سا آدمی جو ایک جھلا دے کی طرح قریب وہ تھا، میرے ساربان کا کوئی گڑبگڑا نکلا ساربان نے اس سے کئی باتیں کیں۔ پھر ہم قافلے سے آگے نکل گئے۔ تھوڑی دیر بعد ہم نے کسی کو اپنے سامنے ایک خرگوش کی طرح بھاگتے ایک بنی میں گھستے دیکھا یہ وہی بکرہ وارٹھی جھلا وہ تھا، وہ اب بنی میں جھکا چائیاں اکٹھی کر رہا تھا۔

میرے ساربان نے بھی اس موقع کو غنیمت سمجھا اور پھر ہماری پیاس بھی تراہمی پوری طرح نہیں بجھی تھی۔ وہ بہت سی چھاس اکٹھی کر لایا، اور پھر سے دعوت اڑائی گئی۔ اس اثنا میں چالیں چوہم صاگے نکل گئے۔ خارخ ہو کر ہم نے پھر قافلے کو جالیا۔ اب سے ساربان نے شاید گھیں بانگنے کے شوق میں آگے بڑھنے کی کوشش نہ کی، اور مجھے چالیں چوروں کی قطار

میں شامل کر کے سارے باؤں سے باتیں کرنے لگا۔ میں نے اسے سختی سے حکم دیا کہ وہ آگے نکل جائے۔ قافلے کو تو وہ میرے کہنے پر نیچے چھوڑ آیا مگر اب اس کے انداز میں وہ چپتی غائب تھی، صاف ظاہر تھا کہ وہ اپنی مرضی کے خلاف قافلے سے آگے خلا ہے کچھ دور جانے کے بعد ہم نے اس عجیب سی دائیسی داسے شخص کو دس کا نام عرقا، صرف ایک لنگوٹا کے زمین پر چپتے، سروے کی مانند پڑا ہوا پایا۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ بھوت کی طرح اٹھ کھڑا ہوا اور عجیب چمیلیں کرتا ہمارے آگے آگے بھاگنے لگا۔ میں سوچنے لگا کہ یہ عرا ایک نہایت کامیاب و درباری سمجھنا یا سینا لائیڈیں ہو سکتا ہے۔ آخر میرے جلدی، جلدی، کئی رٹ لگانے پر میرے سارے بان نے بڑی بے دلی سے اپنے دوست عمر سے مفارقت گزارا کی اور ہم قافلے سے بہت آگے چل آئے مگر کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سارے بان نے اونٹ کو تیز چلنے اور لنگوٹ پہنچنے کے ارادہ کو فی الحال ملتوی کر رکھا ہے اور دوسرے معاملات کے بارے میں سوچ رہا ہے۔ وہ منوریت ہو کر کھانا کھا لینے کے کچھ دیر بعد تک اس کے بشرے اور اس کی حرکات میں نمایاں رہی، غائب ہو چکی تھی۔ وہ مجھے بالکل غیر اہم سمجھ کر نظر انداز کیے جا رہا تھا۔ ایک گستاخا زمیناں سے، کم از کم مجھے یہ ایک گستاخی ہی نظر آتی ہو وہ اونٹ کے ایک طرف ٹانگیں لٹکائے بیٹھا ہوا نبیوں کو بخور دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بدماش! کیا اب تک چائیاں اس کے خیالوں میں ہیں؟ کم از کم مجھے تو اب چائیاں میں کوئی دلچسپی نہیں رہی تھی، میں فوراً ان کوٹ پہنچا چاہتا تھا۔

وہ اونٹ کو باجرے کے ایک کھیت میں لے گیا۔ کھیت کے عین وسط میں، جہاں کہیں سے دمانتی نکالی اور کندھے پر بٹھی چادر کو ہاتھ میں لیا کھیت کے گنجان حصے میں گھس گیا۔ تھوڑی دیر بعد ٹانڈوں کا ایک بہت بڑا گٹھا بندھ لایا، اور اونٹ کے سامنے ڈال دیا۔ اونٹ نے اس انبار میں سے ایک ٹانڈہ منتخب کر کے اسے کاغذ کے ٹپتے کھانے



دلہا داری کی طرح تلخا خنودع کیا۔ ساربان ایک مرتبہ سچر کھیت میں گھسا اور پھٹے سے بھی بڑا گھٹھا باندھ لایا۔ میرے دل میں ساربان کے خلاف ایک خاموش فحشے کی آگ سلگ رہی تھی۔۔۔ دیر کر رہا ہے کجنت، مگر ساتھ ہی میرے دل میں اس شخص کے بے تحشین کے جذبات بھی تھے، قطع نظر اس بات کے کہ باجرے کا کھیت اس کا نہیں تھا۔ اور مائڈوں کے یہ دو ٹخنے قانون کے دو جنازے تھے۔ یہ شخص اپنے کام اور پیسے میں مجھ سے زیادہ مستعد تھا اور پھر اس کو اپنے جانور کا کتنا خیال تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کبھی کبھی وادوٹ کر گالی بھی دیتا تھا۔ خضر صا اس وقت جب وہ چڑھائی پر جاتے جاتے اچانک دک کر اپنے لگے ہوئے ہڈوں کو پھڑپھڑاتا یا وٹ سے ہٹ کر غیروں میں جانے کی کوشش کرتا۔ اس کی گالی کی علت لفظ *موتلا* تک محدود تھی، اگر اس لفظ کا سندھی میں وہی مطلب ہے جو ہمدادی پنجابی میں ہے، تو وادوٹ کے لیے یہ عجیب سی گالی ہے لیکن اگر گالی میں مذہب ہرنے کی گنجائش ہے تو یہ گالی پنجابی کی دوسری گالیوں کے مقابلے میں واقعی نرم اور مذہب فنی۔ اس گالی کے باوجود ساربان اپنے وادوٹ کو اپنے بیٹھے یا بھائی کی طرح چاہتا تھا۔ عرب کی محبت اپنے گھوڑے سے، ایک قہری یا بلوچ کی محبت اپنے وادوٹ سے۔ یہ میری سمجھ میں آسکتی ہے، ہم میں سے شاید کسی نے وہ مشہور انگریزی نظم - *AN ARAB'S FAREWELL TO HIS HORSE* نہیں پڑھی اور اس سے حاشیہ نہیں ہوا۔ میں نے خود ایک آدمی کو دگر صرف پردہ سمیں پر، کمالی بنیدگی سے اس بات کا اقرار کرتے سنا ہے کہ گھوڑا میرا بہترین دوست ہے۔

مجھے اعزاز ہے کہ میں حیوانات سے وفات اور قرابت کا اتنا ہند بانگ و دھڑی نہیں کر سکتا۔ حیوانوں نے مجھ سے ہمیشہ بے اعتنائی کی ہے۔ اور میں حیوانوں نے دھن میں ایک بلا تھا اور دو گھوڑے) جن کی طرف میں نے دوستی کا ہاتھ بڑھایا تیرے جذبات

کی کوئی قدر نہ کی۔ انھوں نے کئی بار اپنے قول و فعل سے مجھ پر یہ واضح کرنے کی کوشش کی کہ ان کو میری دوستی کا نہ کوئی پاس ہے نہ لحاظ اور نہ ضرورت۔ کئی گھنٹوں نے تو فی الواقع میرے چمکانے اور تھپکانے کے باوجود مجھے زمین پر بیٹھ ڈالنے کی کوشش بھی کی ہے۔

حیوانات سے محبت ایک دامن ہے جو میں آٹھک مینیں سمجھ سکا — میرا مطلب محبت سے ہے جو بعض لوگ اپنے کتے یا پالتو بن مانسوں یا لنگوروں سے کرتے ہیں۔ ہم سب نے خوبصورت کاروں میں 'مبوس' مغرور کتوں اور بالوں بھرے کتوں کو موٹر کاروں کی پچھلی سیٹوں پر نہایت شان سے بیٹھے دیکھا ہے اور شاید ہم سے اکثر کو ان پر رشک بھی آیا ہو گا۔ ہم سب نے وہ عجیب بوڑھی عورتیں بھی دیکھی ہیں جو اپنے کتوں کی خوراک، صفائی اور آرام کا اتنا ہی خیال رکھتی ہیں جتنا اپنی کوکھ کے بچوں کا۔ شاید ان سے بھی زیادہ — یہی محبت میری سمجھ سے آج تک بالاتر ہے، میں اقرار کرتا ہوں کہ کم از کم میں اس نوع کی محبت کا نا اہل ہوں۔ میرے خیال میں حیوانات کا اتنی شدید محبت کرنے والے بالکل کبھی اور تک چڑھے ہوتے ہیں اور وہ اپنے ہمکنوں سے اس درجہ بیزار ہوتے ہیں کہ انسان کی سوسائٹی پر کتوں کی سوسائٹی کو ترجیح دینے لگتے ہیں۔ حیات کی حقیقتوں سے فرار کی یہ ایک نئی صورت ہے جس کی طرف ابھی تک ہمارے رومان و شہنی شعراء متوجہ نہیں ہوئے۔

حیوانات اپنی جگہ پر بالکل ٹھیک ہیں اور میں حیوانات کو پالنے اور ان پر ٹوٹے ہوئے صدیوں کے مظالم کی بیخ کنی کرنے والی مجالس کے اکثر اصولوں سے متفق ہوں لیکن مجھ سے یہ کہیں نہیں ہو گا کہ کسی کتے یا لنگور کو اپنے ساتھ لے جی یا ڈرپ مدعو کروں یا اپنے بستر میں سلاؤں۔ اتنی ناز و داریوں نے حیوانات کے دماغ بگاڑ رکھے ہیں۔ مجھے اب بھی پورا یقین نہیں کہ ایک الزماؤرلی میم صاحبہ کی اپنے کتے سے محبت انسان اور

حیوان کے درمیان ایک UNDERSTANDING پر مبنی ہے، یا صرف رواج،  
فیض اور خود نمانی کے جذبہ پر!

اب کئی لوگ ہیں۔ اور ان میں شاید بوڑھا شیکسپیر بھی ہے جو آپ کو بتائیں گے  
کہ گھوڑا ایک شریعت الطبع اور وفادار جانور ہے۔ گھوڑے کی عظمت کا یہ چاہیگر مہم و راسل  
اسنی ادیب لوگوں کی عبارت آرائیوں کا نتیجہ ہے جو خود کہیں گھوڑے پر سوار نہیں ہوئے۔  
مجھے والد گھوڑے کی فائے کوئی پر خاش نہیں، مگر میں نے ان آنکھوں سے کئی گھوڑے  
دیکھے ہیں جن میں علم اور وفا کا تمام تک نہیں ہوتا۔ گھوڑوں سے میرے ملزم دیرینہ اور  
فرسٹ ہینڈ ہیں۔ یعنی میں نے خود گھوڑے کی سواری کی ہے۔ گھوڑوں کی تعریف کئے  
دلوں میں سے ایک شیکسپیر ہی کر لیجئے، اس پہلے کو تو کہیں گھوڑے پر سوار ہونے کا اتفاق  
ہی نہیں ہوا۔ اس کی قسمت میں تو فقط محبوب تھیں کے باہر امراء کے گھوڑوں کی لڑائی میں قاتل  
ہی گھناہندہ ایسے شخص کو بھلا اس حیوان کی نفسیات اور خصائل کا کیا علم ہو سکتا ہے۔ مسٹر ولیم  
شیکسپیر کے بعد ہمارے دوست مسٹر جان گلپس سے پوچھئے، جو ایک معروضہ اور کاروباری  
شخص تھا، اور جیسے ایک دفعہ گھوڑے پر سوار ہو کر ایک پک پک پر جانا چڑھا تھا۔

یہ مذاق نہیں میں کمال سنجیدگی سے یہ سطور لکھ رہا ہوں۔ یہ غلط خیال ہے کہ ایک کتا،  
یا ایک گھوڑا یا ایک بند انسان کا انسان سے بہتر مونس و غمخوار ہو سکتا ہے جو لوگ موشوں  
کی بریڈنگ اور پیدا کرتے ہیں یا وہ لوگ جو مرغیوں کی فارمنگ کا سلسلہ شروع کرتے ہیں  
کچھ عرصے بعد صرف موشیوں اور مرغیوں ہی کی سوانحی کے لائق نہ جاتے ہیں۔ خود ڈیپلے  
میں دو تین آدمی ایسے ہیں جن سے مجھے اور ڈاکٹر کو ایک مستقل شکایت ہے۔ ایک تو وہ ہینڈ  
فشی جن کا ذکر آچکا ہے اور دوسرا پوسٹ ماسٹر، دونوں مریشیوں کے سرگرم "پالناہار"  
ہیں۔ ڈاکٹر انھیں ہمیشہ مذاقاً اور طنزاً CATTLE BREEDERS کے لقب

سے یاد کرتا ہے۔ دونوں معقول انسانوں کی صحبت پر حیوانوں کی صحبت کو ترجیح دیتے ہیں۔ اور جب وہ اپنی گائے بھینس یا بکری کی صحبت میں ہوسکے ہیں تو زیادہ خوش اور AT HOME محسوس کرتے ہیں۔ جب وہ برہنہ سر پہنہ پا اپنی محبوبوں کے نیچے لکھی لکھی "سادسی سادسی" پکارتے ہوئے بھاگتے ہیں تو ان کی آنکھوں میں ایک نئی زندگی ایک نئی روشنی آ جاتی ہے۔ یہی وہ لمحے ہیں جب وہ صحیح زندگی سے بہرہ اندوز ہوتے ہیں۔ پھر بھی جیسا کہ میں پہلے کہ چکا ہوں، میں بوجھ کی اپنے اونٹ سے محبت کو کچھ سکتا ہوں اور اتنی محبت کر بھی سکتا ہوں۔ صحراؤں میں بھی مسافیت بے کنارہ تنہائیاں جن سے ساری انسانوں کو درد چار ہونا پڑتا ہے، انسان اور حیوان میں ایک جذبہ رفاقت ایک COW RADERIE پیدا کر دیتی ہیں۔ ساتھ ہی اونٹ غالباً اس بوجھ کی عزتِ قربین متاع ہے وہ اپنے مالک کے لیے کھاتا ہے۔ اس قسم کی محبت ایک قلندر کو اپنے بند اور ایک ٹھنڈ کو اپنے رکھنے سے ہر جاتی ہے اور شاید بعض حیوانوں کی روحیں انسانوں سے زیادہ سچی اور بے دان ہوتی ہیں کیونکہ اگر ایک حیوان شکر گزار نہیں ہوتا تو ہم کسی صورت میں اسے ناشکرا بھی نہیں کہہ سکتے۔ اور انسانوں کی اکثریت ناشکروں پر مشتمل ہے۔ ناشکر گزار سی جو بورڈ سے ٹیکسپیر کے الفاظ میں انسان کو مرہا کی برائی سانسوں کی طرح کاٹتی ہے اور اسے انسانوں کو چھوڑ کر حیوانوں کی محبت تلاش کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ یہ معرکہ جلد ڈیپلو سے نوں کوٹ تک کی مسافت اتنا طویل ہو گیا ہے۔ سارا بان نے گشتوں کو اپنی نشست پر جایا اور پھولن پر چڑھ بیٹھا اور ہم نے اپنا سفر جاری کیا۔ گشتیوں اور انسانوں کی آواز نے ہمیں بتایا کہ اونٹوں کا قافلہ پھر ہم سے آگے نکل گیا ہے۔ گلاب سارا بان اس قافلے کو جانے اور اپنے ٹکڑے عمر سے گپیں ہانکنے کا خیال چھوڑ چکا تھا۔ کچھ دور جا کر اس نے مجھے سنبھالنے کی کوشش کی کہ اب ہمیں وٹ پر پڑاؤ ڈال دینا

چاہیے تاکہ کچھ دیر آرام کر لیا جائے۔ اس دوران میں اس کا اونٹ باجرہ چرے گا اور پھر ہم صبح ہونے سے پیشتر چلی پڑیں گے۔

لیکن وٹ پر کون کھٹے! میں نے تو ڈیلو پلہ ہی میں حبیہ کر لیا تھا کہ میں وٹ پر قطعی نہیں سوؤں گا۔ میں سانپوں سے ڈرتا ہوں، ہر صحیح خیال انسان کو سانپوں سے ڈرنا چاہیے۔ مگر میری صحیح خیالی ڈر اس حد تک نہیں کہ ہے اور ڈر کر ڈرے بوقت دعا کی کچھ خاص ہدایت کی تھی کہ تنہا یہ صحیح معنوں میں سانپوں کی نگری ہے۔ ان سانپوں میں سب سے زیادہ دہشت ناک "ساہ پیوں" انسان کی جانے والا ہے جس کے متعلق مشہور ہے کہ وہ رات کو سونے والے کی چار پائی پر چڑھ جاتا ہے اور اس کی چھاتی پر ریگنا شروع کر دیتا ہے۔ اور اپنا مناس کے ہونٹوں پر اس طرح رکھ دیتا ہے جیسے کوئی اپنے محبوب کا بوسے، اس بوسے میں موت ہے، سانپ سونے والے کے منہ میں ڈھیر پکا دیتا ہے جس سے اس کے حلق کی ریگیں کھچ جاتی ہیں اور اس کی سانس گھٹنے لگتی ہے۔ اس کی آنکھیں بے نور ہو جاتی ہیں۔ کچھ دیو کے بعد ہاتھ پیر شل ہو جاتے ہیں اور زندگی گل ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر کہتا ہے کہ یہ سانپ دماغی فرضی اور خیالی ہے۔ اس کا وجود انسان ہی ہو یا حقیقی ہی اس کے طفیل تنہا کے لوگ ایک مستقل دہشت اور خوف کی حالت میں زندگی بسر کرتے ہیں اور اگر چار پائی آؤ بیوں کے مجمع میں ایک مرتبہ "ساہ پیوں" کا ذکر چڑھ جائے تو بہت دیر تک گفتگو کا موضوع ہی سانپ رہے گا اور اس کے متعلق کئی عجیب و غریب طوفانی اور اگلی پچھلے کہانیاں سنائی جائیں گی۔

ڈاکٹر سے ملاقات سے قبل میں سمجھتا تھا کہ عجب سے زیادہ سانپوں سے ڈرنے والا انسان روئے زمین پر کوئی نہ ہو گا۔ میرے خوابوں کے بدترین کا بوس وہ ہوتے تھے جن میں سانپ۔ کوڑیاے، دھبوں والے، بھروسے اور نیلے سانپ۔ میری طرف

رہتے ہوئے آتے تھے۔ صرف ریگتے ہوئے رکھے اب تک کوئی ایسا خواب یاد نہیں جس میں سانپ نے مجھے کاٹا ہو، میں اقرار کرتا ہوں کہ میں ان بزدل آدمیوں میں سے ہوں جن کو خدا نے یہ کیڑا مارنے کی توفیق و ولایت نہیں فرمائی۔ ڈاکٹر سے مل کر مجھے گود قتل اور تسکین ہوئی۔ کیونکہ وہ مجھ سے زیادہ سانپوں سے دہشت زدہ تھا۔ وہ کبھی رات کے وقت غراہ وہ چاندنی رات ہی کیوں نہ ہو مارچ کے بہتر گھر سے باہر قدم نہیں رکھے گا۔ اس نے مجھے اپنے پیٹرو ڈاکٹر کے حلق بنایا کہ اگر رات کو اسے کہیں باہر جانا ہوتا تو شام سے صبح تک اونٹ کی پیٹ پر میٹھا رہتا اور پانی پینے یا کسی اور ضرورت سے بھی نیچے اترنے سے ہچکچاتا بلکہ اونٹ کو پس سانپوں کے ڈر کے لئے بیٹھنے تک نہ دیتا۔

ساربان اونٹ کو دھ کے ایک طرف لے گیا۔ جہاں جھاڑیوں میں ایک چوٹی سی ریتلی جگہ تھی۔ اونٹ کو بتادیا گیا۔ ساربان نے میرے لیے اونٹ کی گھیر نیچے بچا دی مگر میں کچھ دیر سانپوں کے مستقل سوچتا ہوا کھڑا رہا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں لیٹ کر رہوں گا۔ مگر سوڈن گائیں۔ اور اس جھاڑی کی طرف رخ کر کے لیٹوں گا جو حکیم کے بائیں قریب ہے۔ نیند کے مارے میرا برا حال تھا۔ پر بستر بچا کر میں تھیں اور برآمد سمیت بستر پر لیٹ گیا۔ کچھ دیر تو کمبلی پر سر رکھے میں چاندنی میں سکتی ہوئی جھاڑی کو دیکھتا رہا پھر نئے نئے پتوں نے میری توجہ کلینٹا اپنی طرف مبذول کر لی۔ باہر سے کے کیمت سے ہم اپنے ساتھ پتھروں کی ایک بڑی فوج لے آئے تھے جو اب میرے سر کے گرد بادل کے ایک ٹکڑے کی طرح منڈلا رہی تھی۔ یہ پتھر شگتاتے ہوئے میرے چہرے پر  $LAND$  کرنے کی کوشش کرنے۔ انہوں نے مجھے کاٹا بھی گران کی کاٹ مٹی اور غیر موسیقی چہرے بھی ان میں تنگ کرنے اور تانے کی ضداد صلاحیت تھی۔ جذبہ انتقام سے عبور ہو کر میں نے چادر اوڑھ لی۔ چھوٹے پتھر پیتا چھنبھلائے ہوں گے۔ کچھ مایوس بھی ہوئے ہوں گے کہ ان کے شکار نے مراد وار مقابلہ

ڈپو سے نوں کوٹ تک

کرنے کی بجائے یوں ستیر گرہ کی ٹٹان لی۔ کچھ دیر میں اپنے اوپر ان کی غصیل شناسا بہت سناتا رہا اور پھر وہ مجھے چھوڑ کر اپنے دوسرے ساتھیوں میں جا بٹے جو اونٹ اور شتر بان پر بلا روک ٹوک بغیر کسی نوع کی مداخلت کے نہایت اچھا وقت گزار رہے تھے۔

میں نے سنا ہے کہ اونٹ ان ننھے صحرائی پھیروں کا بہشت ہے۔ شاید اونٹ کے جسم کی مخصوص جگہاں بھاتی ہے یا وہ اس کی بے بسی اور بچا رنگ کو پہچان چکے ہیں۔ ادھر وہ اونٹ کو دیکھتے ہیں اور حیران کا مڈھی دل حملہ آور ہوتا ہے اور اتنے بڑے "تارو" کو بھال کر دیتا ہے۔ میں نے کئی بار روپوں میں گاؤں کے باہر چرگاہ میں ساربانوں کو دیکھا ہے، جو اپنے اونٹوں کو دھواں دیتے ہیں۔

دھواں تو شایلات کے میدان پر شام کے وقت ایک کمر کی طرح چھایا رہتا ہے۔ اول اول دھواں دینے کا عمل مجھے مشکو خیز معلوم ہوا تھا۔ میرے دہی دماغ نے تصور کیا کہ یہ دھواں اونٹوں کے لیے شاید اتنا ہی سکون بخش ہے جیسے تبا کو انسان کے اعصاب کے لیے مگر بعد میں ڈاکٹر سے استفسار کرنے پر معلوم ہوا کہ پھروں کو بھگانے کا حربہ ہے اور نہایت کامیاب حربہ ہے تاہم جو اس کے اگر آپ پہلی مرتبہ اونٹ کو دھواں دیا جائے، ہوا دیکھیں تو اس دم کا انوکھا پن آپ کے ہونٹوں پر مسکلاہٹ لائے بغیر نہیں رہے گا۔ مجھے یاد نہیں کہ کس وقت سو یاغیندا ایک جرک طرح آئی اور میں اس ٹھنڈی سپید چاندنی اور دودھ سے آتی ہوئی مدھم ٹٹناہٹوں کی دنیا سے چپ چاپ ایک خوابوں کی دنیا میں چلا گیا۔ گلاس دنیا میں بھی چاندنی کی لہر اور گھنٹیوں کی ٹٹن سنائی دیتی رہی البتہ وہاں سانپ نہیں تھے۔ ایک مرتبہ میری آنکھ کھل۔ شتر بان اپنے اونٹ کو باجرے کے ٹانڈے کھلا رہا تھا۔ اونٹ کا منہ چارہ کاٹنے والی میٹھن کے مشابہ تھا جس میں لمبے لمبے ٹانڈے غائب ہوتے جا رہے تھے۔ کچھ دیر کے بعد میرے ذہن پر سانپ رہینگے گئے۔

میں بہتر میں دیک کر ملکتی ہوئی جھاڑی کو ٹھکی باندھے دیکھتا رہا اور پھر سو گیا۔  
 جب میں اٹھا تو پوچھت رہی تھی، چاند کی سفید چھیدا اسی طرح چمک رہی تھی۔ تارے  
 بھی اسی طرح چمکیے تھے۔ البتہ کہیں کہیں ان کی لڑ میں پھیکے پن کا گمان سا ہوتا تھا اس کے  
 باوجود میں نے طبعاً محسوس کیا کہ میں نے آخر کھڑکرات کو صبح کے ڈر سے دے پاؤں بھاگتے  
 ہوئے پکڑ لیا ہے۔ غصہ صبر کی تمام کردتوں میں سے یہی ایک کر دھ جیسے سب سے زیادہ دلاویز  
 اور خوبصورت معلوم ہوتی ہے۔ اس لمحے کی شیرینی صرف وہ لوگ محسوس کر سکتے ہیں جو گلوں  
 کی چار دیواریوں کے باہر کھلے فضاؤں میں دلتیں بسر کرنے کا تجربہ حاصل کر چکے ہیں کیا کہیں  
 کر دھ تہی کا سا دوسو تا اس ایک پل کا بدل ہو سکتا ہے۔ جب ہٹا رہا اور جھاڑیاں ایک نئی  
 سانس لیتی ہیں، اور کائنات ایک انگڑائی بن کر رہ جاتی ہے۔ اس لمحے کی تاثیر آفرینی کو صرف  
 شاعروں اور مصوروں، عاشقوں اور سیاحوں نے محسوس کیا ہے اور ہمارے ہندوستان  
 میں جو تہی نے محسوس کیا ہے سے

ہم ایسے اہل نظر کو ثبوت حق کہے  
 اگر رسول نہ ہوتے تو صبح کافی تھی

میں نے دو کرسی گاؤں سے مرٹھے کی بانگ سنی۔ پھر موشیوں کی گھنٹیوں کی آوازیں  
 پھر مدھم بہت مدھم کسی دھن تھان ٹونوں کی آواز میں میرے کانوں میں آئی جیسے کوئی آواز  
 دے رہا ہو اس کائنات کے رکھواسے کو اور کہہ رہا ہو کہ اس لمحے کو اب ہی بنا دے اس  
 ظلم کو قائم رکھ، اے خدا، اے خدا۔

مگر یہ ظلم ٹوٹ گیا۔ دھند پرا جالا غالب ہونے لگا، خدا کب سے گا انسان کی فراہمی  
 مستجاب الدعوات کے دربار میں یہ تھی مٹی معصوم دعائیں کب باہر پاسکیں گی؟  
 رات بھر کا تنہا بار بار سدا بان لٹھ کی طرح سوراٹتا تھا اور اس کا اوٹ الہ الوہل کی



ٹوہلو سے نوں کوٹ ٹمک

طرح ماورائے فہم و ادراک — ایک عجیب صحنی اور ڈھکے چھپے انداز میں مٹی یا جگالی کر دیا تھا۔

اگر کوئی حیوان مٹین سے کسی طرح مناسبت رکھ سکتا ہے تو وہ صرف اونٹ ہے۔ اس سے زیادہ مطمئن ہے، اعتنا اور آسودہ خاطر اور کوئی جانور نہیں، اسے غور سے دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ جیسے یہ اپنی خودکام میں بھی دلچسپی نہیں لے رہا تاہم یہ ایک ناقابل تعدد مقدار نکل جاتا ہے۔ ایک جگہ پر دیر تک بیٹھ رہنا اس کے جذبات پر داکر اس کے کوئی جذبات ہوتے ہیں، ظاہری طور پر اتنا ہی کم اثر انداز ہوتا ہے جتنا سادہ و سلسل چلتے رہنا میرے خیال میں کسی اور حیوان میں اتنی قوت برداشت اور لاابالیانہ پن نہیں جتنا اونٹ میں، اور اگر اسے ہزدگوں نے صحرا کے جہاز کا لقب دیا ہے تو وہ بالکل راستی پر تھے۔ بزرگ بھی کبھی کبھی سچی باتیں کہہ جاتے تھے میرے دوستو!

میں اب بہت جلد روانہ ہو جانا چاہتا تھا۔ مگر میں نے ساربان کو کچھ دیر سونے دیا۔ جب سورج کی خون آلود آنکھ جھاڑیوں کے اوپر مشرقی افق پر سے جھانکنے لگی تو میں نے اسے جگایا۔ اٹھتے ہی اس نے فردا اونٹ پر پا کھڑا کھا اور چند ہی منٹ میں تیار ہو کر ہم روانہ ہو پڑے۔ ہماری رفتار خاصی تھی، میں ساربان کی طرح ایک طرف ٹانگیں لٹکا کر بیٹھا تھا۔ میرے خیال میں اونٹ پر بیٹھنے کا یہ سب سے آرام دہ طریقہ ہے۔

اب ہم خدا کی جاگتی ہوئی گلابی دنیا سے گزر رہے تھے۔ پرندے ہوائیں کھارہیاں مارتے اور چھپاتے، ہمارے سر دھکتے ہوئے درختوں کے پتوں اور ٹہنیوں سے چھو جاتے۔ ایک درخت کے نیچے سے گزرتے وقت ایک شریعہ شائع نے میری سبز فٹ کو میرے سر پر سے اچک لیا۔ شاید پتوں میں چھپا ہوا اور انسانی آنکھوں سے پوشیدہ کوئی ایبیلی (Ape) یا ایک (Puck) مسافروں کو تانے کے لیے بیٹھا تھا اور یا سی

کی کارستانی تھی۔ میری سبز فٹ کانٹے دار شاخ میں الجھی ہوئی تھی۔ سارا بن اونٹ کو وہاں  
درخت کے لایا۔ اللہ میں نے بڑی شکل سے اسے پک کی انگلیوں سے چھڑایا۔ اب میں نے  
ننگے سر بیٹھا ہی بہتر کیا کیونکہ مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ یہ درخت شرارتوں اور چھیڑوں سے بھرے  
ہوتے ہیں۔

پھاڑیوں کا قاتل تھا ہی سلسلہ کچھ دیر تک اسی طرح جاری رہا مگر تقریباً دو گھنٹوں کے بعد  
پھاڑیاں پست اور کم ڈھلانی ہوئے لگیں۔ اب ہم ان تقری پھاڑیوں کی دھم پر پہنچ گئے تھے۔  
یہ بالکل مختلف اور نئی زمین تھی۔ یہاں سے وہاں تک لاکھ کی شکل کی تنوہر کی جھاڑیوں سے مٹی  
ہوئی تھوہر کی اکا دکا جھاڑیاں ہم نے دلتے میں بھی دیکھی تھیں مگر اس جگہ ان کی واحد حافی تھی۔  
سب لوگ جانتے ہیں کہ تنوہر کی جھاڑی کوئی خوبصورت چیز نہیں مگر یہاں اس انبوہ میں  
تنوہر حسین اور پرنگوہ معلوم ہونے لگی تھی۔

اب ہم پھاڑیوں سے باہر ایک میدان میں نکل آئے یہ پھاڑیاں اب ایک سرخ  
خواب کی طرح ہمارے بائیں کو ڈھلانی ہوئی نظر آنے لگیں۔ تنوہروں کی ملکیت ختم ہو چکی تھی۔  
ہم کپاس کے ایک کھیت کے پاس سے گزرے جس کے حاشیے پر شاندار درخت ایک  
زردی قطار کی طرح صاف باندھے کھڑے تھے، دو دوں میں کپاس کے پھول سفید پیروں  
کی طرح دمک رہے تھے۔ مجھے اس سے پہلے کسی یہ خیال تک نہ آیا تھا کہ کپاس کا کھیت  
بھی اتنا خوبصورت ہو سکتا ہے مگر کپاس کا یہ کھیت تقریباً پہلا منظر تھا جس نے پھاڑیوں کے  
منظر کی کیا نیت اور یک رنگی کو توڑا تھا۔ یہ میری آنکھوں کے سامنے اپنا تک بارخ اورم کی  
طرح ممک اٹھا۔ اس کے تصور سے اب بھی بیبا دل اچھلنے لگا ہے۔

ہم ایک چھوٹی نر کے ساتھ ساتھ ایک پگڈنڈی پر سے گزرے جہاں صحرائی  
سروٹوں کی ایک رعیت کی رعیت ہماری سلامی کے لیے قطار باندھے کھڑی تھی۔

لیجے صحرائی سرود جن کی نرم دھنیں جھاروں ہوا کی چٹکیوں سے جھلک پڑتی تھیں، کھینچتے تو لبہ رت لگ دے تھے وہ سرود — اور وہ پلے پھولوں والا اکلا کیکر، تانہ نغمہ ہولوں کے درمیان — ایسا وہ چوں میں صبح کا سونا لیے — گیا آپ نے بھی اس عظیم چیز، کبھی ہے؟

مجھے ہر چیز حسین اور انوکھی معلوم ہو رہی تھی، شاید اس لیے کہ میں ایک تھکا دینے والے قافلے کے بعد ایک خوش گوار تغیر سے دوپارہ ہو رہا تھا۔ یا شاید اس لیے کہ یہ صبح ٹھنڈی اور سنہری تھی اور پرندے ہمیں تاج اور گارے تھے یا شاید اس لیے کہ میں اب اس ابدی سفر کے خاتمے پر تھا۔

وہاں سے ہم ایک "نیلغھر" کے کنارے کنارے ہو لیے۔ میں نے یہاں سے پہلی بار نوں کوٹ کے قصبہ اور اس سے پرے ریوے اسٹیشن کا نظارہ دیکھا۔ اسٹیشن تنہا اور خاموش قصبے سے دور پڑا تھا۔ ایک چھوٹے سے کھلونے کی طرح۔ یہی تھا سا اسٹیشن میرا ایڈریڈو (EL DORADO) تھا۔ وہ منزل جس تک پہنچنے کے لیے لوگ کئی برسوں کے جاں جو کھم سفر کرتے ہیں۔ یہ میرا جادو کا تالین تھا اور میں ابھی سے اس سبز انجن والی چھوٹی ریل گاڑی کے متصل سوچنے لگا جو دو گھنٹے کے بعد چھپتا ہوا ہونی مجھے اٹھا سے جانے کے لیے اس اسٹیشن پر ٹھہرے گی۔

نووں کوٹ تک پہنچنے میں ہمیں کافی وقت لگا۔ نہر کا پل دور تھا اور اس کو عبور کرنے کے بعد ہمیں اسے پاؤں پٹنا پڑا۔ نوں کوٹ کا قصبہ بالکل ایک مریبے کی صورت میں تھا اور بیسویں صدی کے ایک جدید شہر کا ایک ایسا حصہ معلوم ہوتا تھا کسی ناقابل فہم عمل سے اسلئے شہر سے علیحدہ ہو گیا ہوا اور علیحدگی کے اس سلسلے میں پرانا، شکستہ ادویہ ہر گیارہویں صدی کے قصبوں میں بچے جیسے اسٹیشن سے دور رہنے والے لوگ شہر سمجھتے ہیں مگر جنہیں اپنی کمائی کا پورا علم اور احساس ہوتا ہے اور جیسا پاسر

شہر کے مارے ہمیشہ جھکائے رکھتے ہیں۔ فز کوٹ کے پاس تھکے ماندے مسافر کے لیے کوئی سکراہٹ نہیں، کوئی ہتسم نہیں، محض ایک جذبات سے عاری نظر ہے، اپنی ہوتی اور پھپکی پھپکی — گھر تھوڑے بد صورت اور بے لطف ہیں، اور وہ خانہ بدوش بھی دیں خانہ بدوشوں سے محبت کرتا ہوں، ہوا اپنے خیروں اور عجیب وضع کی بیل گاڑیوں اور اپنے پیشے کے رنگ آلود اور ناروں کے ساتھ شہر کے کنارے ڈیرہ ڈالے پڑے ہیں گدھوں کی ایک قرح معلوم ہوتے ہیں جو شہر کی لگتی مشرقی لاش کے خنجر پر دعوت اڑانے کے لیے جع ہو گئے ہوں۔

ہم دو تین ہوشوں کے پاس سے گزرے جن میں سے ایک چٹائی بوا رہی تھی وہ ان غلیظ شہریدہ اور کھلے ہوشوں میں سے تھے جن میں کھانے کے علاوہ مسافروں کو چارپائیاں بھی میا کی جاتی ہیں اور جن کے تمام مشروبات، ککولات کا ایک ہی ذائقہ ہوتا ہے اور جن میں بڑے بڑے ترموں والے گلاسوفن دن رات گلا پھاڑ پھاڑ کر گیتے رہتے ہیں۔ سننے اور سنانے والوں کے لیے یہ امر کسی طرح قابلِ ملاحظہ نہیں ہوتا کہ کونسا ریڈیو سجا یا جارہا ہے۔ خواہ بچے ملک گائے یا کالو قرال (مچ پارٹی) سننے والے کے لیے ایک ہی بات ہے۔ وہ حرف پاگل کر دیتے والا شہر سننے گا۔ پنجابیوں کو ایسے غرضناک ہوش کھولنے کا خاص سلیقہ ہے جس ہوش کا گلاسوفن یا لائٹ پیکی جتنا ہی زیادہ اونچا اور شوریدہ ہوگا اتنے ہی زیادہ گاہک اور چنگے چے آئیں گے۔

ہم ہوشوں کے پاس سے گزرے، خانہ بدوشوں کے خیوں کے پاس سے گزرے، ہزوں کوٹ اتنے رتھے میں پھیلے ہوئے تھے۔ حکومت کے مسافر خانے کے پاس سے گزرتے، ریوے اسٹیشن کے سامنے جا کر ہم اتنے اسٹیشن کے مسافر خانے میں صرف ایک شخص کھڑا تھا اور وہ شخص ٹکٹ کھڑک کے پچا ملک بد سے فچے کچھ شہر اور غلط اور تھیسس آنکھوں

سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی مونچھیں لمبی اور بالکل سیدھی اور مکمل جھٹیں، اور ایک دوسرے سے ۱۸۰  
 کا زاویہ بنارہی تھیں۔ — خطہ مستقیم کھینچے لیکن خطہ سے مونچھوں کے پھیلاؤ پر حرف آتا ہے۔  
 اب جب سے میں نے ہر دو درمیان "لمری سوار" یا اسی قسم کی کسی فلم میں اسے فضل بکٹ پر  
 کے کسی جاسوسی سنسنی خیز ناول کا فلم ورژن (VERSION) کہا جاسکتا ہے ایک سیدھی اور  
 مکمل مونچھوں والے دلین کو دیکھا ہے۔ مجھے سیدھی اور نوکدار مونچھوں والوں کے متعلق  
 ایک بدگمانی سی ہو گئی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ بالکل بے ضرر اور شریف آدمی ہوں اور اتنے  
 سادے جتنی ان کی مونچھیں مگر مجھے تو وہ چور اور چبکترے اور خشک اور خوفی معلوم ہوتے  
 ہیں۔ میں ایک سیدھی اور نوکدار مونچھوں والے آدمی کے ساتھ کسی انڈیویری رات کو اپنے  
 گھر سے دس قدم سے زیادہ دور جانے سے چمکپاؤں گا اور پھر نہ جانے کیا بات ہے کہ  
 اس قسم کی مونچھوں والوں کی شکل ایک جیسی ہوتی ہے۔ ہی لال انگلیں اور موٹی ناک اور ہونٹوں  
 کے گوشوں میں ٹپٹی ہوئی گایاں۔ — مسافر خانے کا تین تہا "باشندہ" مجھے عین بن لہری  
 سوار کا شاندار اور پراسرار دلین لگ رہا تھا۔

ساربان نے میرا بستر اور کتا بول کی گشتیاں اٹھا کر مسافر خانے میں پہنچا دیں وہ نیچے  
 فرش پر دیکھنے لگا تھا مری سوار کے دلین نے ایک میز پر ادھو خش خشتی سے سامان کو تھپکے  
 بیچ پر دیکھنے کے لیے کہا ایک پراسرار مسکراہٹ اس کے ہونٹوں میں دہکی ہوئی تھی۔  
 میں نے ساربان کو کرایہ دیکر رخصت کیا۔ گشتی کھول کر کتا میں نکال بس اور ان کو بستر  
 میں باندھ دیا۔ وہ شخص حج میں اور میرے سامان میں غیر معمولی دلچسپی رہا تھا۔ شاید میں اس  
 کے بچے ایک مہر تھا۔ آخر جب بستر باندھ کر میں نے اس سے وقت پوچھا تو وہ اسٹیشن ماسٹر  
 کے کمرے کی طرف تہاگا۔ تھریچے میں دیکھ کر آتا ہوں۔ واپس آکر بولا "اے گاڑی ڈیڑھ  
 گھنٹے کے بعد آئے گی۔ آپ ٹھہریں جا کر کچھ کھا پی آئیے۔ میں آپ کے سامان کا خیال کنٹرولنگ

نگر میں بچہ نہیں تھا۔ اور لہری سوار فلم میں اس کی چال بازیوں اور کرتوت دیکھ چکا تھا۔  
 میں ایک برتنی کے انداز میں سکرایا۔ جس طرح ایسے موقعوں پر مسٹر شرک مہر مسکراتا ہے  
 شہر جانے کے ارادے کو فی الحال ملتوی کر کے میں پتھر کے رنج پر میسر کر گئیں گی سوانح  
 حیات پڑھنے لگا۔

OUR ADONAI'S HAS DRUNK POISON, OH!

# معلوماتی قاعدہ

— پیچوں کے لئے —

پیارے بچو! مدت سے ہمارا قومی ترانہ نہیں تھا۔ اس کی کمی کی وجہ سے دل عمل رہتے تھے۔ ہم سراٹھا کر چل سکنے کے لائق نہ تھے۔ افغانستان کا قومی ترانہ تھا، تبت کا قومی ترانہ اور تو اور بوڈالینڈ کے مردم خودوں کا قومی ترانہ تھا۔ ایک قومی ترانہ نہیں تھا تو ہمارے یہ تو تم کو نابالغ مسلم ہی ہو گا کہ باعزت ملک اور خاک کپڑے کے بغیر زندہ رہ سکتے ہیں مگر قومی ترانے کے بغیر ہرگز نہیں۔

الحمد للہ۔ اب ہماری حکومت نے اس کی کوپرا کر دیا ہے۔ اب اس نے ہیں پانچ ہزار روپے کی لاگت سے ایک قومی ترانہ تیار کر دیا ہے۔ بچو اسے اپنے سر میں پھینچو کے زور سے گاؤ اور خدا کا شکر بھالاؤ۔ جانتے ہو یہ کس زبان میں ہے؟ یہ ہماری مادری زبان عربی میں ہے۔ اس میں اردو کے چار الفاظ بھی ہیں ان الفاظ کی فہرست بناؤ

قومی ترانے کو سمجھنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جب تم بڑے ہو کر غش فاضل کی سند لوگے تو یہ ترانہ خود بخود تمہاری سمجھ میں آ جائے گا۔ ابھی تمہارے لیے یہی جانتا کافی ہے کہ اس ترانے کا ایک ایک لہلہ سونے میں تولنے کے لائق ہے اور اسے ایک بار پڑھنے کے بعد ہی خدا سے ذوا بجلال کی شان آشکارا ہو جاتی۔

**جمہوریت**

بچو آج کل جمہوریت کا زمانہ ہے جبکہ دیکھو دیکھو کے نظارہ حسن میں مست ہے۔

آؤ! ہم جیتیں بتائیں کہ جمہوریت کس کو کہتے ہیں؟ ایک دانائے فرنگ نے اس کی تعریف  
یوں کی ہے کہ جمہوریت بعض آدمیوں کی حکومت ہوتی ہے جسے بعض آدمیوں کے  
فائدے کے لیے چلاتے ہیں۔

خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ہمارے ملک میں بھی جمہوری نظام رائج ہے، ہمارے  
حاکم منتخب شدہ ہیں۔ یعنی انھوں نے ایک دوسرے کا انتخاب کیا ہے۔ وہ سب  
بڑے مزے میں ہیں۔ ان سے پوچھو تو وہ جمہوریت کے فائدے بتاتے نہیں نکلیں گے۔

پھر۔ جمہوریت کوئی نئی چیز نہیں یہ بڑا پرانا نظام ہے۔ پرانے زمانے کے  
رومیوں اور یونانیوں میں بھی یہ نظام بے حد مقبول تھا۔ اس زمانہ کی اور آج کل کی  
جمہوریت کا مقابلہ کرنے سے پتا چلتا ہے کہ دو ہزار سال کے عرصے میں دینے کوئی  
خاص ترقی نہیں کی۔ سبکی دور سے کچھ مدت پہلے روم میں ایک شہنشاہ کو ایگولا نامی  
حکومت کرتے تھے۔ یہ بڑی خوبیوں کے بزرگ تھے۔ آپ اپنے آپ کو ایٹنی شہنشاہ  
سمجھتے تھے۔ اور کہا کرتے کہ میں تو برائے نام شہنشاہ ہوں۔ سینٹ چاہے تو مجھے ہٹا  
سکتی ہے۔ تم یہ سن کر حیران ہو گئے کہ ان دنوں میں بھی سینٹ یعنی پارلیمنٹ، عزائم  
کرتی تھی۔ جس کے ممبر لینے اسی طریقے سے چنے جاتے تھے جس طرح ہمارے  
اپنے ملک میں کالینگولا صاحب کے دماغ میں کیا آئی کہ انھوں نے اپنے گھوڑے  
سیہانس نامی کو سینٹ کا ممبر منتخب کر لیا۔ کالینگولا کے ڈر کی وجہ سے کسی نے سیہانس  
کے مقابلہ میں کھڑے ہونے کی ہمت نہ کی اور سیہانس بلا مقابلہ سینیٹر SENATOR بن گیا۔  
سیہانس پھولوں کا تاج پہنے لگنے پاتے اور بادلوں سے لدا چندا سینٹ کے اہلکار  
میں کالینگولا کے ہمراہ آتا۔ عام ممبروں کا ایک ووٹ ہوتا تھا مگر سینٹ نے  
با اتفاق رائے یہ پاس کیا کہ سیہانس کے دو ووٹ ہوں گے۔ بعد میں کالینگولا نے



یہاںس کو روسی سلطنت کے ایک ایشیائی صوبے کا پرہیزگار بنی گورنر مقرر کر دیا۔ جب یہاںس کا انتقال ہوا تو اس کی کنش کو روس پہنچایا گیا۔ کانگولانے پوسے قومی اعزاز سے اپنے محبوب سینیٹرک بجز وکھین کی سرس دن یہاںس کا سوگ منایا گیا۔ تاہم اسے ثابت ہے کہ سفر ت نل سمان کانگولانے کے وقت میں بھی سینٹ میں ایک مخالف پارٹی ہو ا کرتی تھی۔ ہمارے ملک میں تو یہ پارٹی الیکشن سے کچھ عرصہ پہلے ہی جیلوں میں ٹھونس دی جاتی ہے۔ کانگولان صاحب مخالف پارٹی کے مبروں کی شیروں سے کنش کو اپاکنے تھے۔ آج کل کی جمہوریتوں میں یہ ممکن نہیں۔ زندہ شیر پہ مشکل دستیاب ہوتے ہیں۔

پھر دیکھا تم نے جمہوریت کتنی اچھی چیز ہے۔ اسی کی بدولت ایک معمولی گھوڑا ترقی کو تاکتا۔ روسی سینٹ کا ممبر جانا گو کہ یہاںس کا دماغ تھارا نہیں ہو سکتا، پھر بھی کوشش کر۔ تو تم بھی یہاںس کا سا بلند مرتبہ حاصل کر سکتے ہو۔

## مسٹر جان فاسٹر ڈلز

پھر۔ تم نے اخباروں میں مسٹر جان فاسٹر ڈلز کا نام بار بار پڑھا ہوگا۔ آؤ ہمیں ڈلز صاحب کے متعلق کچھ بتائیں :-

مسٹر ڈلز ریاست ٹائے متحدہ امریکہ کے وزیر خارجہ ہیں۔ یہی کن اور ملکوں کے وزیر داخلہ ہیں۔ لیکن یہ بات ذرا چمکے سے کہنے کی ہے۔ چچا سام کے دست راست ہیں اور کندھے پر چار پانچ بچے لٹکائے پھوٹے ملکوں کی تلاش میں گرداں رہتے ہیں۔ آؤ قریب سے دیکھیں کہ ان کے بچوں پر کیا کھاجا ہے۔ ایک پر انگریزی میں ڈلز ڈکھا ہے۔ دوسرے پر میڈ "تیسرے" پر کوئی ٹوٹا پھوٹا

مکوں کو ایک ذہر مند سے چک کر ایک ایک کے ان بچوں میں ڈالتے جاتے ہیں۔  
 کنن ملک ایسے ہیں جن کا سر نیٹو میں ہے اور میڈو میں اور ٹانگیں بیٹو ہیں۔  
 چھوٹے مکوں کو پلانے اور کھلانے کے لیے ان کے پاس طرح طرح کی مشائیں  
 اور اچھی چیزیں ہیں۔ ایک چمب میں جو رنگ گم ہے تو دوسری میں کوکا کولا کی بوتلیں۔  
 قیسری میں لائن سیدر کی کینڈی ہے۔ چرتھی میں ہوائی چاندوں ٹیگنوں وغیرہ کے کھلونے۔  
 ٹائیڈ روجن ہم ان کا قدر کی حسیب میں ہے۔

مسٹر ڈاؤنر سے متین اور قابل سیاست دان ہیں۔ ان کے ماتھے پر ہمیشہ بل پڑے  
 رہتے ہیں۔ ان کو بے حد سوچنا پڑتا ہے۔ اسی دو بچے کچھ کچھ خالی ہیں۔ بہت کم لوگوں  
 نے انہیں مسکراتے دیکھا ہے۔ ان کے پاس اتنی فرصت ہی نہیں۔ ان کے دوست میں  
 قرابین وقت بے وقت چنا دے جاتے ہیں۔ ان کے ایک دوست اینٹونی ایڈن ہیں،  
 ان سے ڈاؤ صاحب کو بڑی امیدیں تھیں لیکن انہوں نے ہندوستانی میں فرائض اور  
 ویٹ من کا معاہدہ کر کے ان کو سخت صدمہ پہنچا دیا ہے۔

جناب ڈاؤ ہمیشہ ایسے کمزور مکوں کی اعانت کے لیے تیار رہتے ہیں جو اپنے  
 تحفظ کے لیے فوجی امداد کے لیے طالب ہوں۔ یہ امداد واعانت ان کی امن دوستی اور  
 جمہوریت فوازی کی واضح دلیل ہے۔

آؤ پھر مسٹر جان فاسٹر سے درخواست کریں کہ جب وہ اس عمدہ مجید سے  
 سبکدوش ہوں تو وہ ہمارے یہاں تشریف لے آئیں تاکہ ان کے تدبیر اور موقع بھد  
 سے اس آزاد ملک کے ریڈر اور عوام فیضیاب ہو سکیں۔

ریڈر یو

پھر۔ تم نے ریڈر فرورڈ سنا اور دیکھا ہو گا۔ لیکن ہے تمہارے گھر میں بھی

ایک ریڈیو ہو۔ ریڈیو بیسویں صدی کی ایک حیرت ناک ایجاد ہے۔ دیکھو تو ایک معمولی کھڑکی کا کبس ہے۔ چابی گھماؤ تو بھانت بھانت کی بولیاں سنتے ہیں آئیں گی۔ کسی بہر پر تو الی ہو رہی ہے۔ کسی پر داور کسی پر شدت دکھیان۔ خدا جانے ہمارے آباؤ اجداد ریڈیو کے بغیر کیسے زندگی بسر کرتے ہوں گے ؟

دینا کے کس حصہ میں زلزلہ، سیلاب، یا طوفان بتا ہی لائیں اس کی خبر فرار ریڈیو پر آتی ہے۔ اکثر طوفان کی گھن گرج بھی خبر کے ساتھ ہی سنائی پڑتی ہے۔ پہچان سام کے ملک میں تو تم طوفان یا زلزلے کو ٹیلی ویژن کے پردے پر بھی دیکھ سکتے ہو۔ اس نعمت سے ہمارے آباؤ اجداد محروم تھے۔ کوئی قبیلہ نہیں کہ وہ گھوڑے بچ کر سویا کرتے تھے۔ بچو ہم کو جلا نیند کیسے آسکتی ہے۔ جب کہ ہم سے صرف آٹھ ہزار میل کے فاصلہ پر ایک بادگودیل بنا دکتا ہوا گھڑا رہا ہے۔

ریڈیو کا ایک فائدہ یہ ہے کہ اس پر آنکھوں دیکھا حال بھی سنا جاسکتا ہے۔ پانچ سو میل کے فاصلہ پر اگر کوئی چمچ ہو رہا ہے یا کہیں گھوڑے بھاگ رہے ہیں یا کوئی رسم افتتاح ہے تو تم گھر بیٹھے ہی اس کا آنکھوں دیکھا حال سن سکتے ہو۔ مثلاً پریس ہوری جگنہیل چمچے میاں وزیر مرہ جات نے شکردلی میں ایک بسکٹ کی فیکٹری کی رسم افتتاح کی۔ میں نے ریڈیو پر اس کی پوری روداد سنی۔ ”آٹھ سو آدمی پنڈال میں بیٹھے ہیں۔۔۔۔۔ وہ دیکھتے دو واڑہ پر کچھ شور مچا رہا ہے۔ میں ابھی طرح تو نہیں دیکھ سکتا۔ میرا خیال ہے۔ نہیں نہیں مجھے یقین ہے۔ آٹھ سو وزیر مرہ جات تشریف لارہے۔ میں۔۔۔ بہت سے لوگ اٹھ کر ان کے استقبال کے لیے جا رہے ہیں۔ معاف کیجئے اب پتا چلا ہے کہ یہ وزیر صاحب نہیں تھے۔ ایک بکرا اندگس آیا۔ سیکریٹری عبد الشکور صاحب اسے باہر نکال رہے ہیں۔۔۔۔۔ اچھا بڑے سیگوں والا بکرا ہے۔ غالباً افغانستان

ہے۔ اتنی دور سے وثوق سے کچے نہیں کہا جاسکتا۔ بیٹ فارم پر سے بیٹھ حاجی۔ معاف سمجھئے گا نام بھول گیا۔ بہر حال حاجی صاحب آئریبل چمے میاں کے استقبال کے لیے اٹھ کر بھاگ رہے ہیں۔ پنڈال اللہ اکبر اور چمے میاں زندہ باد کے نعروں سے گونج رہا ہے۔ کئی لوگ اچھل اچھل کر وزیر صاحب پر بسکٹ پھینک رہے ہیں۔ ایک بسکٹ میرے پاس بھی آکر گرا ہے۔ اچھا لذیذ اور کھارا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

بھگوان! اب ہمیں ریڈیو کے ذرائع معلوم ہوتے! ریڈیو پر نہ صرف خبریں اور آنکھوں دیکھا حال ہی سنا جاتا ہے بلکہ پُر مغز تقریریں بھی سنی جاسکتی ہیں۔ شام کو دو مشہور غیر ملکی کے اسٹیشنوں سے 'ڈک ہیڈنگ' کی قسم کا نہایت دلچسپ پروگرام نشر ہوتا ہے۔ دو میانی وقفوں میں گراموفون پر فرمائش دیکارڈ بجائے جاتے ہیں۔ دونوں ملکوں کے غیب وطن ان پروگراموں کو بڑے شوق سے سنتے ہیں۔

مختصراً بچہ! ریڈیو پر ہی اچھی لکھا ہے۔ اس میں سب سے اچھی بات یہ ہے کہ اس میں ایک چال ایسی ہوتی ہے جس کے گھمانے سے یہ بند ہو جاتا ہے اگر یہ چال نہ ہوتی تو روزانہ کئی ریڈیو پھینک کر توڑ دیئے جاتے۔

## آزاد سرمایہ

ہمارا ملک آزاد سرمایے میں یقین رکھتا ہے، یہاں ہر طریقہ سے دوہرہ گمانے اور خرچ کرنے کی آزادی ہے۔ بچہ! تم جابو تو دس ہزار روپیہ روزانہ کتے ہو۔ حکومت کی طرف سے تم پر کوئی روک ٹوک نہیں۔ تم کروڑ ہتی بن سکتے ہو۔ فلاں اور فیشے کے عملوں میں رہ سکتے ہو۔ ایسی قیمتی موڈ کاروں میں گھوم سکتے ہو۔ حکومت کی طرف سے تمہیں ان سب باتوں کی مکمل اجازت ہے۔ دینا میں کئی ایک ایسے ملک ہیں جہاں

آزاد سرمایہ کا نظام رائج ہے۔ ہم کہتے خوش قسمت ہیں کہ ہمارے ملک میں بڑے بڑے جاگیردار کروڑپتی اور نواب ہیں، یہ نہ ہوں تو زندگی کیسے بھیک اور بے مزہ ہو کر رہ جائے۔

## سوالات

- ۱۔ ہمارا قومی ترانہ کون سی زبان میں ہے ! اس کے ایک مصرعے میں "عوام" کا ذکر ہے یہ غلطی شاعر سے کیسے سرزد ہو گئی ؟
  - ۲۔ گھوڑے سیہانض کے مرتبہ کے دوسرے نیٹیر کے نام گناؤ۔
  - ۳۔ جان فاسٹر ڈاکٹر کو چھوٹے ملکوں سے اس درجہ محبت کیوں ہے ؟
  - ۴۔ ریڈیو کے زائد تفصیل سے بتاؤ۔
  - ۵۔ آزاد ممالک کی تعریف کرو۔
- کروڑپتی۔ جاگیرداروں، نوابوں کے بغیر آزاد ملکوں کی کیا حالت ہوگی۔ تفصیل سے بیان کرو !

# مقیاس المحبت

(۱۱)

آپ نے چند روز پہلے اخباروں میں ڈاکٹر غریب محمد کے امسوسناک انجام کی خبر پڑھی ہوگی — غالباً اسی سرسری انداز میں جس طرح آپ روزانہ خود کشیوں، ڈاکوؤں یا اغوا کی خبریں پڑھتے ہیں۔ پڑھنے کے فوراً بعد ہی اس کے متعلق بالکل بھول جاتے ہیں۔ آپ یقیناً ایک حزن اور عجیب حالات کے سلسلے سے بھی تواقف میں آئے ہوں گے۔ بالآخر اس دردناک اور خوفناک ٹریجیڈی کا باعث ہوئے۔ بھلا کتنوں کو خبر پڑھتے وقت یہ احساس ہوا ہوگا کہ چاکی داڑھا کا یہ ڈاکٹر جس کی ڈاکٹری اکیڈمیک ڈگریوں کی مرہون منت نہ تھی۔ پاکستان کا پہلا اور یکنمل سائنسٹ تھا جو اگر کچھ دیر اور زندہ رہتا تو اپنے ملک کے لیے فخر کا موجب ہوتا۔ اس کی بے وقت موت سے حقیقتاً یہ نوزائیدہ سلطنت ایک ایسے سائنسٹ اور موجد کی خدمات سے محروم ہو گئی ہے جس کا ہم پہلے اس دہانے میں شاید ہی پیدا ہو سکے۔

میں اس کا دوست تھا — ایسا واحد دوست جو ڈل ٹنگ سکول میں تعلیم پا سکتے کی وجہ سے اس قابل ہے کہ اردو کے ایسے مکمل فقرے لکھ سکے جن میں نامل، فعل اور مفعول تینوں موجود ہوں۔ یہ میرا فرض ہے کہ میں پہلے چاکی داڑھا کے مقبول پر اور پھر پاکستان پر اور اس کے بعد دنیا پر واضح کروں کہ میرے دوست کی وفات سے سائنس کو کتنا نقصان پہنچا ہے۔ اور کیسے اس کی اپنی حیرت انگیز ایسا و مقیاس المحبت ہی اس کے

دریائے بیاری کے طغیانی زدہ پانیوں میں چھلانگ لگا کر ڈوبنے کا سبب ہوئی۔  
 ہر وہ شخص جو چاک و واڑا میں رہتا ہے، کارپوریشن اسٹریٹ کو اچھی طرح جانتا ہے۔  
 یہ چاک و واڑا کی سب سے فیشن ایبل گلی ہے اور اس شہر میں وہی حیثیت رکھتی ہے جو  
 صدر میں انکسٹن اسٹریٹ کو حاصل ہے۔ کارپوریشن اسٹریٹ کیا ہے۔ گارے کے کچے  
 تیرے میڑے سے گھر۔ چھوٹی شرٹائی ہوئی سی دکانیں جو سڑک کے بجائے کسی اور سمت  
 رخ کیے ہیں۔ کارپوریشن اسٹریٹ کے وسط میں پمپ ہے جہاں پھرد اور بیجوں میں  
 ملکاؤں جیسی عورتیں کھڑی ساراؤں پانی بھرتی دیتی ہیں۔ اسٹریٹ کی چوڑائی ہر دس فٹ  
 پر بڑھتی اور گھٹتی رہتی ہے۔ بعض جگہ دروازے سے لگی ہوئی میونسپلٹی کی لائٹیں ایک تنہ  
 ہوئے بازو کی طرح آنکھوں کے سامنے ناگہانی طور پر نمودار ہو جاتی ہے۔ مختصراً کارپوریشن  
 اسٹریٹ خود در و دناش کا دوسرا نام ہے۔ میرا ایک دوست منظر کمالی جو ایک ترقی پسند  
 ادیب بھی ہے۔ اس کو گھٹتی ہوئی حسیناؤں کی گلی کہا کرتا ہے جس سے بہتر اور زیادہ  
 مناسب نام شاید اور کوئی نہیں سوچا جاسکتا۔ کارپوریشن اسٹریٹ میں تقریباً دو  
 فرلانگ آگے جا کر فضل محمدی خٹاپ کے سامنے ڈاکٹر عزیز محمد کی دکان تھی۔ وہ ایک  
 معنک۔ نوکدار اور ادھی والا۔ فراخ گند نما پیشانی والا آدمی تھا اور اسے پہل نظر دیکھتے  
 ہی یہ یقین ہو جاتا تھا کہ اگر کسی شخص پر لفظ 'جینس' کا اطلاق ہو سکتا ہے تو وہ چاک و واڑا  
 کا یہ ڈاکٹر ہے۔ بحیثیت ڈاکٹر کے — یہ مجھے انیسوس سے کہتا پڑتا ہے — وہ ان  
 ہزاروں ڈاکٹروں میں سے تھا جو مریض کو دیکھ کر بہت پر حسرت انداز میں اپنا سر ہلاتے  
 ہیں اور نو احتیاس کو یقین دلا دیتے ہیں کہ اگر ان کو ایک دو بیجے پیچھے ملو اگر مریض دکھایا  
 جاتا تو اس کے بچنے کی کوئی صورت ہو سکتی تھی۔

چاک و واڑہ کے کئی شر پسند لوگ ڈاکٹر پر ہنساناں باندھتے تھے کہ بیاری کو دھڑکے

قبرستان آباد کرنے میں اس کا سب سے زیادہ ہاتھ ہے۔ یہ دراصل ایک توسل بہتان تھا۔ بات دراصل یہ ہے کہ ڈاکٹر غریب محمد کو طویا ہی اس وقت جانا تھا جب کہ مرعفی کے بچنے کی کوئی صورت ہی نہ ہوتی تھی

اپنی خودکشی سے تقریباً ایک ہینہ پہلے ڈاکٹر غریب محمد میں ایک عجیب تبدیلی نظر آنے لگی۔ وہ خاموش اور کھویا کھویا سا رہنے لگا اور جب میں ایک دو بار اس کی دکان پر گیا تو اس کے چہرے کی وحشت اور اس پر آسانی سا جلال دیکھ کر مجھے اظہارِ مدعا کی جرأت نہ ہوئی۔ اس نے اپنی دزدش کم کر دیں۔ صرف ایک دفعہ اس نے مجھے اتنا اشارہ دیا کہ اس کا داغ بہت بڑی باتوں میں ابجھا ہوا ہے۔ ”اسپ۔ میں دن رات اپنا سارا وقت ایک ایسی ایجاو کے بارے میں صرف کر رہا ہوں جو دنیا میں فطرتِ حیا دے گی۔ اس کے نقایض میں پہل سب ایجاویں۔ ریڈیو۔ ایٹم بم وغیرہ بچے کا کھیل معلوم ہوں گے جس کے منظر عام پر آنے کے بعد جرمنی کے ماہرینِ نفسیات کی تمام تعجیو ریاں بے ہودہ ہو کر رہ جائیں گی اور آنے والی نسلیں ڈاکٹر غریب محمد سے پہلے زمانے کو انسانیت کا تاریک دور کہا کریں گی“

(۲)

مجھے یقین ہے انہی دنوں ڈاکٹر غریب محمد کو پہلے پہل حے خیال سوچا کہ ایسا کہ ایجاو کیا جائے جس سے محبت ناپی جاسکے دراصل یہ صرف اکیلے اس کے داغ ہی کا نتیجہ نہ تھا بلکہ اس کو تکمیل پہنچانے میں کچھ حصہ حکیم اللہ کوک منیاس کا بھی تھا۔ انہوں نے اس ایجاو کی ضرورت پر چاک داڑا کے خیر اور دم دل راستہ دانوں میں (جواب تک اس مہنگائی کے زمانے میں بھی اپنی پرانی غریب پروردگی اور جہانِ فانی کی روایات پر قرار رکھتے ہوئے اپنے لاکھوں کو گرمی جی ہوئی چائے کی پیالی اور غایا ریڈ کا بنا ہوا بس صرف



دو آنے میں جپا کرتے ہیں۔ پہروں اور گھنٹوں سر جوڑو کر بٹھیں کہیں۔ عموماً جس وقت ہم ان پر بلائے ناگہانی کی طرح نازل ہو جاتے تو وہ وائیں بایں یوں دیکھنے لگتے جیسے اپنا جوتا تلافی کر رہے ہیں۔ بات کا رخ فوراً بدلتے دیتے۔ ہم سب کا خیال تھا کہ وہ چاک داڑا کو رات رات میں بارود سے اڑکنے کی قسم کی کوئی خطرناک سازش کر رہے ہیں مگر ان کے کچھلے کئی برسوں کے حب الوطنی اور جانفروشی کے دیکار کے پیش نظر ہمیں اپنا خیال ترک کرنا پڑا۔ وہ ہم نے سوچا کہ یہ سقراط، بقراط یہ وہ عظیم گنبدِ فدا و داغ یقیناً اپنے انتہا راج سے کوئی ایسا اچھوتا غامض اور ایسا مفید آکر دریافت کریں گے جو چاک داڑا کے کمینوں کی زندگی قابلِ شک بنا دے گا۔ ایک دفعہ میں نے ان دونوں میں سے ایک کو تحقیقِ صحبت کا پارہ "کہتے سنا۔"

پچھلے جو لائی کو ایک صبح جب میں یعقوب کرانی سے پانچ روپے ادھار مانگنے کے ارادے سے جا رہا تھا تو کارپوریشن اسٹریٹ میں ڈاکٹر عزیز محمد کی دکان کے سامنے ٹھہر گیا۔ کیوں نہ ڈاکٹر عزیز محمد ہی کو پانچ روپے مانگنے کے لیے کہا جائے۔ آخر دوست ہی دوست کے کام آتا ہے۔

ڈاکٹر کی کی طرف بیٹھ کیے کرسی پر پاؤں رکھے سامنے میز پر ایک گھڑی نما چیز سے کبیل رہا تھا۔ میز پر چند ایسے اوزار رکھے تھے جو جہاں تک مجھے معلوم ہے ڈاکٹر اشتغال نہیں کرتے۔ ایک حضورِ آدمی درجن کیلیں اور گزریاں، دو بیچ کش ہیں نے گمان کیا کہ شاید ڈاکٹر خود اپنی گھڑی کی مرمت کر رہا ہے اور اس میں تعجب کی کوئی بات بھی نہیں تھی۔ کیونکہ ڈاکٹر کئی گنوں کا مالک تھا۔ میں دکان کے اندر چلا گیا اور پیشتر اس کے کہ وہ مجھے مدد کر دیکھتا یا اپنی گھڑی نما چیز کو چھپانے کی کوشش کرتا میں اس کے سر پر موجود تھا۔ اور اپنی انگلیوں سے اس کی سپاٹ چاند چٹختا رہا تھا۔



ناپنا۔ اس کے موجد کے لیے ضروری ہے کہ وہ قدرت کے فزیکل قوانین کے علاوہ روحانی قوانین پر بھی عبور رکھتا ہو۔ اور روحانی قوانین کو صحیح سائنٹفک اسپرٹ سے قابو میں لانا ہر ایک کے بس کا رنگ نہیں۔ اگر حکیم اللہ کوک سنیا سی جیسے عامل روحانیت کی مثال حال نہ ہوتی تو میں خود ہماری طرح تاریکی میں بھٹکتا رہتا۔ یہی جگہ ہے جہاں تم لوگ غلو کو کھا جاتے ہو۔ — تم لوگ تقیاس المحبت کو بالکل انہی فزیکل قوانین کے مطابق ایجاد کرنا چاہتے ہو جن پر فخر میسر۔ صرف اس قانون پر کہ پارہ حرارت سے پھیلتا ہے۔ مگر محبت صرف فزیکل قوانین کے تابع نہیں — ۱۔ ۲۔ ۳۔ ۴۔ ۵۔ ۶۔ ۷۔ ۸۔ ۹۔ ۱۰۔ وہ بطور انطریق پر ہنسنا۔ یہ مجھے سخت ناگوار گزارا۔

میں نے ضبط کرتے ہوئے پوچھا: ”تمہارا یہ محبت نامہ ہے؟“ یہ مقیاسِ محبت  
 اور سے طور پر مکمل ہو چکا ہے؟

”بالکل نکل ! تم نے کیا سوچ رکھا تھا۔ بھلا میں اتنے روزے اور کیا کر رہا تھا؟ ڈاکٹر غریب محمد نے مصالحہ نگاروں سے مجھے دیکھتے ہوئے جواب دیا ”وہ اور دو چار کی ہی صحت اور خوبصورتی سے کام کرتا ہے۔ میرا مقیاس الحبت ! پھر وقتاً چرنگ کر اور قدر سے ہر اس زدہ ہو کر وہ اس پادرمیاء نام اصل میں پکڑا دے۔ دوست احباب پیار سے اس پتے پہنچتے ہیں۔ غزل میں میرا تخلص بھی یہی ہے۔“ (یہ ایسا دس پینٹ بھی نوکرانا پڑتی ہیں۔ تمہیں معلوم ہے یہ پینٹ کرانے کا معاملہ کہاں اور کس طرح ہوتا ہے۔“ ”میرے مجھ پر چھوڑ دو“ میں نے اپنے دوست کے لیے مضبوط سہارا جتے ہوئے کہا ”میں اس کام میں سٹینڈلٹ ہوں۔ وہیں روٹیاں بنانے کا ایک بالکل نیا طریقہ ابھی حال ہی میں پینٹ کرا چکا ہوں۔ مگر مقیاس الحبت کو پینٹ کرنے کے لیے تم اس قدر بے چین کیوں ہو؟“

”تمہارے سوا اور کون یہ آلودہ ایجاد کر سکتا ہے؟“ میں نے اسے حوصلہ دیا۔ ”میرا امکان تھا کہ سائنٹفک ایسپر وچ کے فقدان کی وجہ سے میرا اب سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور پھر تمہارا بہترین دوست ہوں۔ تم کیسے اپنے بہترین دوست سے ایسی ناشائستہ حرکت کی توقع کر سکتے ہو؟“

”نہیں؟“ اس نے کہا ”مجھے تمہاری طرف سے کوئی خطرہ نہیں۔ خطرہ ہے تو صرف ایک شخص سے جو اس ایجاد کے کئی خفیہ رازوں میں میرا شریک کار رہا ہے۔ بھئی ثبوت بدلتے دیر نہیں لگتی۔“ وہ رازدارانہ طریق پر اپنا منہ میرے اس قدر قریب سے آیا کہ اس کی زبانی دھڑکی کے چند بال میرے کھٹے ہوئے منہ میں گھس کر میری زبان پر کھجلی کرنے لگے۔ ”تم سے کیا چھپاؤں۔ تم تو جو کچھ ملگوئیے اس پر یار۔ میں تمہاری وہ چادر دن کی مسلسل لنگ و دو نہیں بھولا جو معہربان حب کے لیے تم تھے بلبلیں فراہم کرنے کے سلسلے میں کی تھی! مجھے حکم اللہ لوک کا ڈر ہے۔ اُسے مقیاس المحبت کے پرزوں اور اس کی مشینری کے راز کا علم ہے اور اس میں چند مثل اور تعویذ اسی عامل کامل کے ہیں۔“

”تعویذ؟“ میں چلتا ہوا ”تمہارا مطلب ہے یہ مقیاس المحبت تعویذوں سے چلتا اور کام کرتا ہے؟“

”صرف تعویذ نہیں۔ تعویذ بعد میں آتے ہیں پہلے اس میں پرزوں، انگریزوں اور اسپرٹوں کا ایک بے حد الجھا ہوا میکینزم ہے۔ ایک جیسی گھڑی کے میکینزم سے متا جلتا مگر اس سے کہیں زیادہ پیچیدہ دار۔ یہ گھڑی بند جو تم دیکھتے ہو ایک خاص دھات کا ہے جو اندر سے کھوکھلی ہے اور جس کی ماہیت اور خصوصیات سے انگریز، جرمن اور امریکن ہیئت دان تک نا آشنا ہیں۔“ وہ مجھے اس سے زیادہ بتانے پر تیار معلوم

نہ ہوتا تھا۔

”تم جانتے ہو۔ ڈاکٹر“ میں نے کہا ”میں تمہارا بہترین دوست ہوں۔ وہ واقعہ یاد کرو جب میں بلبلیں پکڑنے کے لیے چارپانچ روز بغیر کھائے پئے صحرائوں اور گستانوں کی خاک چھانٹا پھرتا تھا۔ اور جب میں ان کو ڈکڑے میں رکھ کر تمہارے پاس لایا تو میرے بعض حامدوں نے تم کو جھڑکایا تھا کہ یہ بلبلیں نہیں بلکہ جنگلی موسے ہیں۔ تم بھی ان کی بات مان گئے تھے اور مجھے اس شہادت کے پیسے کہ واقعی یہ بلبلیں ہیں شیخ افضل علی ناولسٹ کو ادھی رات کے وقت اس کے بستر سے اٹھا کر لانا پڑا تھا۔ وہ وقت یاد کرو اور مجھے ذرا تفصیل سے بتاؤ کہ یہ آدھ کیسے کام کرتا ہے۔“

ڈاکٹر نے کچھ تامل کے بعد مجھے تفصیل سے بتایا کہ آدھ کس طرح کام کرتا ہے۔ گھڑی کے ساتھ ایک گھڑی بند یا کنگن ساحلن تھا جو کلائی پر فٹ کیا جاسکتا تھا۔ اس کنگن کے دوسرے سرے پر گھڑی کے متقابل ایک بلوریں عکس اجڑا ہوا تھا جو دراصل بلور کا نہ تھا بلکہ ایک عجیب و غریب نامعلوم دھات کا تھا۔ جس کی دریافت مغرب کے ماہریت پرست ریٹ وان شاید اس وقت تک ذکر کیے گئے جب تک ان کے درمیان کوئی ایسا ہیئت وان نہ پیدا ہوا جو ایک وقت ہیئت وان بھی ہو اور ایک دلی کامل بھی۔ اس بلور کے مرکزے کی خاصیت یہ تھی کہ عام فزیکل حرارت اس پر کوئی اثر نہ کرتی تھی۔ مگر جھٹ کی لہریں جو فضا میں ریڈیو کی لہروں کی طرح سفر کرتی ہیں اس کے ساتھ مل کر ایک متوازن قوت کی روک ٹوک کے حلقے اور گھڑی کے اسپرنگوں میں سے دوڑا دیتی تھیں۔ اسپرنگ متناوب ہیئت ذرہ ہو کر گھڑی کے پوائنٹر (سوئی) کو کھاک ڈھکیا انہی کھاک دائرہ اطراف میں حرکت میں لاتے تھے۔ گھڑی کے چہرے پر ۱۲ سے ۶۰ تک ایک حرکت دار (۱-۲) سے ۶۰ (-) تک دوسری طرف ہند سے لکھے تھے جن میں سے

ہر چند سے محبت یا نفرت (مضیٰ ہند سے نفرت کے تھے) کی ڈگری ظاہر کرتا تھا۔ اس طرح ....



ڈاکٹر نے اتنا سمجھانے کے بعد مجھ سے کہا: ”میں تم کو اس کے استعمال کا طریقہ بتاتا ہوں۔ فرض کیا تم سامنے سے ایک خوبصورت عورت آتی دیکھتے ہو اور یہ معلوم کرنا چاہتے ہو کہ اس کو تم سے اس وقت کتنی ڈگری کی محبت ہے یا وہ کتنی شدت سے تمہاری طرف کھینچ رہی ہے۔ تم اسی وقت اس گھڑی کو اپنی کلائی پر پہن لیتے ہو۔ ہور کے ٹکڑے کو تم اپنے منہ کے سامنے اس طرح لے آؤ گے کہ وہ آنے والی کی تیر خٹکوں کے مابین میں شامل ہونے لگے۔ محبت کی لہروں کے اس بور پر دیکھتے ہی گھڑی کا پوائنٹر اپنی نیچلی پوزیشن سے ہٹ کر دائیں یا بائیں حرکت کرے گا فرض کیا سوئی ۱ + پر آکر رکھتی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ اس عورت کو تم سے محبت ضرور ہے مگر داہنی قسم کی۔ ۱ + سے ۲ + یا ۵ + پر آکر ٹھہرے تو اس کا مطلب ہے کہ اس عورت کی محبت تمہارے لیے اس شدت کی ہے کہ اگر تم کشش کرو تو وہ تمہارے ساتھ بھاگ نکھنے کے لیے بھی تیار ہو جائے گی۔ ۶ + پر خدادی ہو سکتی ہے بشرطیکہ رمل کی کا باپ رضا مند ہو۔

”اور ۱ - اور ۲ - یہ کیا ظاہر کرتے ہیں۔“

”تم تو محض بچے ہو اتنا بھی نہیں جانتے۔ ۱ - محبت کا کیا مطلب ہو سکتا ہے! یہی کہ اُ نفرت اگر سوئی ایٹنی کھاک دائرہ حرکت کرے اور مضیٰ ۱ پر رکے تو اس کا مطلب ہے کہ عورت کو تم سے نفرت ہے اور اس نفرت کی شدید اور آخری ڈگری۔ ۲ - ہے۔ ایسی نفرت جو تم کو اس عورت کے بھائیوں سے جوتیاں پڑا سکتی ہے“

ہوتیاں پڑنے کے ذکر پر انھیں بھپکاٹے بغیر میں نے ایک بالکل غیر ضروری سوال کیا۔  
 ”ایک اور بات! اسے شہورِ سنیت دان! کیا یہ گھڑی — اور مقیاسِ المحبت صحت چاک ڈاڑا  
 کے خوش فیصیب باشندوں ہی کے لیے وقف ہوگا؟“

”نہیں“ ڈاکٹر غریب محمد ایک عظیم سائنس دان کے بوجھے میں کہنے لگا ”میں ایک سچا  
 سائنس دان ہوں۔ اور ایک سچا سائنس دان، قوموں، ملکوں اور جد بندیوں کی Tensions  
 میں نہیں سوچتا، اس ایجاد کا فیض ساری بنی نوع انسان کے لیے ہے — حتیٰ کہ  
 سکھوں کے لیے بھی!“

”اتنا فراخ دل! سکھوں کے لیے بھی! میں تعریفی نگاہوں سے اسے دیکھتا ہوا چلایا اس  
 ایجاد کے فیض سے تم سکھوں کو بھی محروم نہیں رکھنا چاہتے! مگر فیض! میں سچ کہتا ہوں اس  
 مقیاسِ المحبت میں کوئی فیض نہیں۔ تم نے ایک حیرت انگیز آرا ایجاد کیا ہے۔ مگر اس میں  
 فیض کوئی نہیں۔ اس سے کئی گھروں کی خوش تنبا ہو جائے گی۔ اور ان کئی عاشقوں کے دل  
 جواب تک اپنی محبوباؤں کی محبت اور محبت کے فیض میں فریب زدہ اور مست ہیں وہ جاہل  
 گئے.....“

”پھر بھی یہ ایک عظیم ایجاد ہے!“ ڈاکٹر غریب محمد بولا! ”ہر چیز کے فائدہ بھی ہوتے ہیں  
 اور نقصانات بھی۔ میں اس کا انکار نہیں کرتا کہ اس ایجاد سے اس کے حاملین کی زندگیاں اجیرن  
 ہو جانے کا احتمال ہے۔ ہو سکتا ہے بعض لوگ جواب اپنے محبوبوں کی محبت کا یقین رکھتے ہوں  
 مقیاسِ المحبت کے چہرے پر سچائی پڑھ کر اتنے مایوس ہوں کہ خودکشی کریں۔ — مگر  
 میرا خیال ہے کہ اس ایجاد سے زیادہ بڑھ کر خلق کو فائدہ ہی پہنچے گا۔ اس سے نوجوانوں کو شادی کے  
 لیے صحیح انتخاب کرنے میں بے حد سہولت ہو جائے گی۔“

’خیر کم از کم یہ ایجاد میرے لیے بے کار اور بے ضرر ہے۔ مجھے دیکھ کر خدا جانے کیا بات

ہے محدثوں کی وہ ریڈیفائی ہر جس کی طرف ابھی ابھی تم نے نہایت خوبصورتی سے اشارہ کیا ہے وہیں رک جاتی ہیں۔ مجھے یقین ہے اگر میں اس مقیاس المحبت کو اپنی کلائی پر باندھوں تو یہ پوائنٹر صفر پر ٹھہرا رہے گا۔ عورتیں مجھ سے محبت کرتی ہیں نہ نفرت۔"

انجام کار میں تھے ڈاکٹر سے وعدہ کیا کہ میں اس ایجاباد کے بارے میں اپنی زبان بند رکھوں گا اور کسی سے ذکر تک نہ کروں گا۔ اس کے بعد میں نے ڈاکٹر کی اجازت سے مقیاس المحبت کو اپنی کلائی پر باندھ کر مختلف اشیاء کے درجہ محبت کو تجزیہ اس ناہنجیز سے غنی بنایا۔ نتیجہ مندرجہ ذیل ہے۔

45

• یہاں سے سفر کریں گا



گھر طاعتاٹھائے ہوئے ایک عورت جو آہ می تھی  
بیگز گھر مے کے ایک عورت۔

ایک انٹرویو کارپوریٹیشن اسٹریٹ کے ٹکڑے پر

کمرہ امیری طرف دیکھ رہا تھا۔

دولت کے حواس نے آپ کو

يعتوب کرانی۔۔۔ جیاکے واٹر کالال واٹر می

والی ہودی جس کا میں ایک سو روپے کا مقروض

تھا اور جس کے پاس میری پانچ ٹائپاں ہیں

میتوب کرائی کی ۶۔ محبت کو دیکھتے ہی میں زوراً ڈاکٹر غریب محمد کی ڈسپنری میں اندر

ایک چھوٹی ٹی کال کو ٹھنڈی قہی جس کو اس نام سے پکارا جاتا تھا جابھیا اور اس وقت تک

چسپا رہا جب تک ڈاکٹر نے آں کبیر کا سگھل دے کر مجھے یقین نہ دلایا کہ یعقوب کوانی اب فی الواقع اگلے گزدر گیا ہے۔



”واقعی ڈاکٹر“ میں نے ڈسپنسری سے نکلنے ہوئے اور کڑی کے جانوں کو بھاڑتے ہوئے کہا: ”آج تنیاس المیت نے جو تنیاس انفرت بھی ہے میری جان بچائی اور عزت دکھائی، اس نے مجھے فوراً اطلاع دے دی کہ آج تنیاس قرض خواہ تنہا سے سر پر جو تیاں توڑنے کے ارادے سے نکلا ہے۔ کم بخت آج بوٹ بھی نئے اور نوکار کیلوں والے پہنے تھا!“

”بس اب یہ تنیاس اتار کر مجھے دے دو۔ مجھے ابھی دو تین پیچ کئے ہیں اور ایک اور تعزیر گمری کے پیچھے ڈالنا ہے۔ کل تک میں اس کو پیٹنٹ کرادوں گا۔“ لیکن حکیم اللہ لوک منیاسی....“

”پیٹنٹ کرانے میں تنہا ہی مدد کروں گا۔“ میں نے آرٹھے وقت میں اپنے دوست کے کام آتے ہوئے جواب دیا ”پر واہ نہ کرو۔ ایڈمنسٹریٹر کے دفتر کا ہیڈ چیر مانی میرا دوست ہے۔ اچھا اب میں چلتا ہوں۔“ ”یک نکتہ بچے خیال آیا اور مڑا“ ڈاکٹر غریب غم کیا تم مجھ کو آج شام تک پانچ روپے ساڑھے تین آنے اور چار روپے سکتے ہو“

وہ کچھ متاثر سا معلوم ہوتا تھا۔ میں نے اسے دوبارہ بتایا کہ میں اس کا بہترین دوست ہوں۔ بیلوں کا بیعت سے طریقے سے ڈکر کیا۔ آخر ڈاکٹر نے اپنے قبیلے سے پورے پانچ روپے ساڑھے تین آنے گئی کر میری منتہی پر دکھ دیے۔

”پانچ روپے کیا چیز ہیں“ ڈاکٹر.... روپے دے چکنے کے بعد اب حاتم طائی کا پارٹ کھیلنے میں کوئی ہرج نہیں سمجھتا تھا۔ پانچ روپے اپنے بہترین دوست کے لیے! میں آخر اس ایجاوے لاکھوں ملانے والا ہوں“ وہ اپنے آپ کو ڈھارس دے رہا تھا۔

(۳)

کوئی تین روز کے بعد بادش سے پناہ لینے کے لیے میں جب ڈاکٹر غریب محمد کے مطب میں داخل ہوا تو اس بغیرہ اور ہونہار جنس کو ایک ایسے دلفریب مشغلے میں کچھ ایسا

منہک پایا کہ اسے میرے آنے کا چاہیے نہ چلا۔ وہ زمین پر اکڑوں پنجوں کے بل بیٹھا ایک سفید  
 زمانہ ٹانگ کا بغور نوہ لہ کر ایک بصر کے سے انداز میں سوائے کر رہا تھا۔ اس ٹانگ کی مالک لڑکی  
 پر بھی تھی اور لغویانہ طور پر چکی ہوتی تھی۔ جیسے چلوں سے لڑی ہوئی تھی آپ نے  
 کرائے۔ ایک ہفتہ سے اپنے بھو لادو فرغل کے گھرے کو اور گھنٹوں تک اٹھانے تھی۔  
 راتہ۔ اگر آپ چاک وائر کے بخند سے ہیں تو آپ نے ضرور اس کو کہیں نہ کہیں دیکھا ہو گا۔ اس  
 خند سماں کا ۲۳ ہے۔ راتہ! چاک وائر کے کئی یہ یہ نوجوان ترقی پسند شعرا نے اس کو خطاب  
 کر کے جیسی جی کر تھی ہوتی نکلیں کہی ہیں اور دوتیں ناکام محبت نوجوانوں کی خود کو کتنی بھی اسی سے  
 منسوب کی جاتی ہے۔ وہ یقیناً کارپوریشن اسٹریٹ کی گھنٹی ہوتی حسیناؤں میں نہیں ہے۔  
 وہ اتنی حسین نہیں اس کا شہد اس قسم کی لڑکیوں میں کیا جاسکتا ہے جو میں سال کے بعد مر جاتی  
 ہوتی، واصل اندازی کرنے والی، طوطے کی چونچ جیسی مڑی ہوئی خاک والی عورتوں میں تبدیل  
 ہو جاتی ہیں اور جن کے شعل بیگان میں نہیں کیا جاسکتا کہ ان کے بھی چاہنے والے تھے۔

ان سطور کے ناچیز کھنڈے والے نے بھی یہ ایک سال پہلے کا واقعہ ہے جب وہ انہیں  
 کنوارا چاک وائر کا آفیشل ممبر نہیں بناتا تھا ایک دفعہ گل میں اس کی بالکنی کیے نیچے کھڑے ہو کر  
 اس کو محبت اور پیار کے الفاظ سے مخاطب کرنے کی جرأت کی تھی۔ مگر اوپر سے سرد پانی کی  
 دو باتیاں پڑنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ اس عشق کی ابتداء صافرا نہیں ہے۔ حقیر  
 راقم الحروف مستقل مزاج عاشق کہیں نہ رہا۔ اگر تباہی میں اس کی حوصلہ شکنی کر دی جائے  
 تو وہ محبوب سے دایوس ہو کر عشق کے اور امتحانوں میں اپنی قسمت آزمائے کو چل پڑتا ہے۔

واہ کیا دن تھے! ————— میں میں خل نہیں ہونا چاہتا تھا۔ مگر کیا کرتا ہر موسم سلاحداد باغی ہو  
 میں اس محبت کے سین میں خل نہیں ہونا چاہتا تھا۔ مگر کیا کرتا ہر موسم سلاحداد باغی ہو  
 رہی تھی۔ ایسی بادش جو کراچی میں کہیں نہ ہوئی تھی۔ آخر چاہیے کہ راتہ نے پورا نکلیں اٹھائیں  
 اور مجھے دیکھتے ہی اس کے فرغل کا دامن نیچے گھنٹوں تک آگیا۔ راتہ کی نظروں میں میرے لیے

اس وقت زہر بھرا تھا اور مجھے یقین ہے کہ اگر میری کافی پراس وقت تھپاس المیت ہوتا تو اس پر ریڈنگ ۵ اور ۶ کے درمیان ہوتی۔ ڈاکٹر غریب محمد نے بھی مجھے قاتلانہ نظر سے دیکھا گیا مجھے کچا چبا جانا چاہتا ہے۔ وہ میرے سلام علیکم کا جواب دیے بغیر اپنی مریضہ کی طرف متوجہ ہوا۔ ”کتے جو ہوئے آکر کاٹ ہی جیتے ہیں گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ کتے کے پاگل ہونے کا وہم بھی نہ کیجئے۔ میں اس کتے کو مہرے تین سال سے جانتا ہوں۔ وہ فیروزگ ہے۔ زخم بھی صولی ہے۔ روز یہاں مجھے ایک دفعہ آکر ٹانگ دکھا دیا کیجئے“

راقبہ ایک مریضہ کی ڈیا اٹھاتے جو اسے ڈاکٹر غریب محمد نے دی تھی پھولوں کے سے چکے قدم رکھتی دکان سے اتر گئی اور میں نے اپنے دل کو اس حمد سے مضبوط کیا جو حال ہی میں انجی کنواریان کے سالانہ جلسے میں کئی ایک متکبر ہستیوں کے سامنے میں نے کیا تھا۔

”پھوہہ... ڈاکٹر غریب محمد نے پیشانی سے پسینے کے قطرے پر پچھتے ہوئے کہا ”پھوہہ میں کہتا ہوں کتنی خوبصورت ٹانگ! کیسی سفید پنڈلی!“

”یہی میں کہتا ہوں کتنی خوبصورت پنڈلی۔ کیسی سفید ٹانگ۔ گنا جو ہر شے اس معلوم ہوتا ہے۔“

”کیا بکو اس ہے“ ڈاکٹر بولا ”اسپ! تمہارے مذاق میں اصلی خراج نہیں ہوتا یہ میری سمجھ میں نہیں آتے۔ میں نے آج تک صرف ایک اور ایسی عورت دیکھی ہے جس کی ٹانگیں راقبہ کے مقابلے میں پیش کی جاسکتی ہیں۔ وہ عظمی مارلین ڈیٹرچ۔ عظم کیٹریس۔ اس جوش ربا نے صرف اپنی ٹانگیں ہی کئی ہزار ڈالرز میں انشور کر رکھی تھیں“

”تم اس سے کہاں ملے ہو۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے تم ہاں وڈو ہاں وڈو کوٹ دادھا کرشن نہیں گئے۔“

”وہ آہ میں نے اس کو۔ اس کی ٹانگوں کو پروہ نہیں پر دیکھا ہے۔ ایک زمانہ خوبصورت ٹانگ دیکھنا نادرات زمانہ میں سے ہے۔ اور اہل نظر کے لیے ایک عظیم وجدانی تجربہ کیٹس

نے ایک ایسی ٹانگ دیکھ کر وہ مشہور بند کھٹا جڑوں شروع ہوتا ہے۔

”حسین چیز ایک واقعی سرست ہوتی ہے۔“ — کیش کرن تھا؟

پیسر اس کے کڈاکٹر غریب محمد مجھے کیش اور انگریزی ادب پر پرفیسر بلکھو دیتا پشاور کی لنگی میں ایک ٹنٹاتی ہوئی انگلیوں اور مطلقاً، دائرہ والی اور حیرت انگیز آدمی ہاتھ میں سوئی لیے آیا یہ راقبہ ہچکا اور سر پرست حاجی بھلے ڈیو تھا۔ ڈاکٹر نے فوراً دوڑا اس کے قدم لیے۔ اس کے دانتیں کال کو پس دیا۔ گھر سے دارکری ڈیوٹری سے لاکر اس کے لیے رکھی۔ میں اب جانے کی سوچ رہا تھا غریب ڈاکٹر نے سانے فضل محمد لٹی وائے کو آواز دی کہ فوراً اسپیشل چائے لے کر آئے تو میں نے سوچا کہ اس وقت میرے سامنے کوئی اور ایسا اہم معاملہ نہیں جو چائے جیسا اہم ہو۔ چنانچہ میں دک گیا۔

”آج کل اسپ صاحب آپ کو کام پر صبح سویرے جانا پڑتا ہے، ڈاکٹر غریب محمد نے ٹریفک طریقے پر مجھے اشارہ کیا کہ میں تشریف لے جاؤں۔“

”نہیں“ میں نے نہایت خوش مزاجی سے جواب دیا ”میں نے وہ کام چھوڑ دیا ہے اور اب جس کام پر جاتا ہوں اس کا کوئی معین وقت نہیں۔“

”مطلقاً دائرہ والی نے ڈاکٹر سے سوال کیا ”راقبہ یہاں آئی تھی؟“

”ہاں آئی تھیں“ ڈاکٹر نے اپنے دل کی ملک کے لیے ادب کے طور پر صیغہ جمع غائب استعمال کرتے ہوئے کہا ”میں نے ان کی تسلی کر دی ہے۔ زخم معمولی ہے۔ صحت چند روز مجھے ٹانگ دکھانے کے لیے آنا پڑے گا۔“

”ہوں؟“ حاجی بھلے ڈیو نے چائے سرکٹے ہوئے ایک ڈکالری۔ ”آج کل انیم پھر جنگی ہو رہی ہے اور ٹھیکے والے بیک کر رہے ہیں۔“

”بندے کو کہا ہوتا“ ڈاکٹر نے جھٹ اپنی صداقت مندی اور خدمت گزاری کا ثبوت دیا۔

۴۰ آخر قندہ یہاں کس لیے بیٹھا ہے؟

۱۳ چھا — جوں ! آج شام تک چھ تو دنایم کا انتظام کر رکھتا۔ دم میں عراق سے  
برخود ہوا دوسرے ڈیڑھ کے منی انڈر سائے پر چکا دل گا..... ڈاکٹر غریب محترم چاک داٹا کے نیک  
حربیں آدمیوں میں سے ہو۔ کئی بیوایش اور یتیم بچے نہیں دعائیں دیتے ہیں..... میں کمرانی  
زبان میں چاک داٹا کی تمام روشنی اور عقیدہ جیتوں کے حالات زندگی با تصویر مرتب کر رہا ہوں۔  
یہ چاک داٹا کا کون ہے۔ "ہوا تو ہو" ہوگا۔ عقیدہ جیتوں میں تمہارا نام دوسرے نمبر پر رکھوں  
گا۔ پہلا نام خود میرا ہوگا۔ مجھے اپنے حالات زندگی تصویر کا بلاک اور اپنے کلام کا انتخاب جلد  
مہیا کر کے دو۔ "ہوا تو ہو" میں نام چھپانے کا یہ صرف چالیس روپے ہے۔ — ایم ٹی ٹی ٹی  
جورجی ہے اور راقیہ بھی اب بیس سال کی جو چکی ہے۔"

میں استعمرے میں بڑکا ایک بن گمانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ آخر مجھے اسی کو ٹھٹھا پڑا جس کی وجہ سے اچھو آگیا اور باہر رہا گیا پڑا۔

شام کو ہوتے وقت میں نے ایک لڑکی کو جراتاً تھم دیکھا۔ وہ میونسپلٹی کی لائین کے نیچے ڈاکٹر کی دکان کے سامنے ایک انداز سے کھڑی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی ہٹ گئی۔ میں غور توں کے لیے سم فائل سمجھا جاتا ہوں۔ ڈاکٹر دکان میں تھا اور اپنی وارمی کسے بھیچے سکرانے کی کوشش کر رہا تھا۔

میں نے پوچھا ”آج تم بڑے خوش معلوم ہوتے ہو۔“

”عرقش ہونے کی بات ہی ہے۔“ اس نے کہا ”بوڑھا لنگور رضا مند ہو گیا ہے۔“

”بڑھا انگور کون کس بات پر فائدہ ہو گیا ہے؟“

”بچے کی طرح تمہیں ایک ایک بات جانا پڑتی ہے۔ بوڑھا لگور۔ حاجی بھٹے دینو اور کرن۔ جو صبح یہاں میرے پاس بیٹھا تھا۔ تمہارے دفن ہونے کے بعد وہ تین گھنٹے اور

یہاں بیٹھا رہا۔ دوپہر کا کھانا بھی میرے ساتھ ہی کھایا۔ میں اس کو اوٹے پر سے آیا ہوں۔ راقبہ کا رشتہ دینے کے لیے تیار ہو گیا ہے۔“

”ہر شخص کو۔“ میں چلایا، ”تم چاک داڑ کا کے کنواروں کی انجمن کے سیکرٹری ہو۔ اپنے وعدے یاد کرو۔ اپنے عہد انجی تمہیں۔“

”میں سیکرٹری کے عہدے سے استعفاء لے گا ہوں۔ اگر ماقبہ میری زندگی میں نہ آتی تو کبھی اس پر یقین کرو میں اپنے بہترین منگوٹیوں کو اس طرح نہ چھوڑتا۔ پھر بھی میری ہمدردیاں ہمیشہ تمہارے اور دوسرے کنواروں کے ساتھ رہیں گی۔ روحانی طور پر میں تمہارے شانہ بشانہ چلوں گا۔“

”راقبہ“ میں نے حسد میں جتنے ہوئے کہا، ”ایک عورت کی خاطر تم اپنے صلیبِ نزاری اور دستوں کو چھوڑنے پر تئی گئے ہو۔ اور ایک ایسا خطرناک اور محققانہ قدم اٹھانے کے لیے تیار ہو گئے ہو جس کا انجام میں سوچتا ہوں تو دل ہل جاتا ہے۔ اب بھی وقت ہے ڈاکٹر غریب محمد۔ پلٹ جاؤ۔ باز آ جاؤ۔“

”ڈاکٹر“ ڈاکٹر وجدانی کیفیت میں سرشار تھا۔ ”انہی خوبصورت ٹانگ؟“

”مگر تم کو کیسے معلوم ہے کہ اُسے۔ راقبہ کو تم سے محبت ہے۔ تم جانتے ہو تم اب چھتیس سینتیس کے ہو اور اتنے بوسٹ بھی نہیں کو عورتیں تمہا سے پیچھے مریں۔“

”لیکن راقبہ ضرور مجھ پر مرقی ہے۔ اس کی انگلیں مجھے محبت کا صاف پیغام دیتی ہیں۔ اس کے ہونٹ مجھے چومنے کی دعوت دیتے ہیں۔ اس کی ہر ادا میں ہر اشارے، ہر کانٹے میں میرے لیے محبت ہی محبت ہے۔ محبت اور دعوت؟“

”دعوت کا لفظ سن کر میں نے کہا، میں کچھ بھوک محسوس کر رہا ہوں۔ چائے کے منتظر کیا خیال ہے؟“ میں نے پرامید نظروں سے اس کی طرف دیکھا، ”اور محبت کے بارے میں۔“

”کہ اس کو تم سے محبت ہے یہ تمہارا ہی غلط فہمی ہے۔ اس کی اوڑن اور سیلی انگلیوں سے

کوئی نتیجہ اخذ نہیں کیا جاسکتا۔ عورت نہایت ہی پراسرار مخلوق ہے۔ میں ایک ایسے انداز سے باتیں کر رہا تھا جیسے میں نے ساری عمر عورت کی نفسیات کے مطالعے میں گزاری ہے۔ اب وہ پرسوں جو انٹ یہاں سے بلدا تا مہرا گذر رہا تھا۔ ظاہر اس کا مجھ سے کسی قسم کی تینگی رکھتا۔ قریب قریب نہ تھا۔ لیکن مقیاس المحبت کو گانے سے مجھ پر یہ حقیقت کھل کر اس انٹ کو مجھ سے + تم ڈگری محبت ہے۔ میرا دوستانہ مشورہ ہے کہ تم کل نفسیات المحبت سے یقین کر لو کہ اس کا درجہ محبت کیا ہے۔ پھر کوئی اور چیز سوچنا۔

مجھ اب افسوس ہے کہ میں نے اس کو یہ مشورہ دیا۔ ایک طرح ہی مشورہ چار دروازے کے بعد اس کے خونخاک انجام کا سبب بنا۔ آپ کہیں گے مجھے یہ مشورہ نہ دینا چاہیے تھا۔ لیکن میرے خیال میں حقیقت یہ حال اس پر کھلتی تھی۔ آج نہیں توکل۔ کل نہیں تو پرسوں۔

میں جانے لگا۔ ایک نکتہ ایک خیال آنے پر میں مڑا۔ "ڈاکٹر غریب محمد کیا تم مجھے کل دوپہر تک دس روپے ساڑھے آٹھ آنے ادھار دے سکتے ہو۔ ڈبل روٹیاں بنانے والوں کی جنرل دو لگ لگائی کی شینگ ہے اور یہ خیر صدارت کے فرائض انجام دے رہا ہے۔ صدر کے فرائض میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ سب لمبوں کی چالے سکرٹ سے تراش کرے۔ صرف کل دوپہر تک! تم جانتے ہو میں تمہارا بہترین دوست ہوں۔ وہ طبیبیں یاد کرو! چاک و ڈاڑھیں ایک بہترین دوست کا ہونا جو دکھ مکھ میں ساتھ دے سکے اور مشورے دینے میں اپنا ثانی نہ رکھتا ہو۔ تعدت کی عظیم ترین نعمتوں میں سے ہے۔"

لیکن آج اتنی لمبی چوڑی تقریر کی ضرورت نہ تھی۔ ڈاکٹر غریب محمد پر حاتم طائی مکمل طور پر سوار ہو چکا تھا۔

اس نے مجھے قہقہے میں سے دس روپے ساڑھے آٹھ آنے نکال کر دے دیے جو دکان کے باہر آتے ہوئے بیوقوف کولانی نے جو میری گھات میں کھڑا تھا اپنے سود کی ادائیگی میں

دوسرو ایسے..... پہلے کی طرح حسین علوی پر غصے اور تلاش میں رو پہلی شام میں بیٹیاں بجاتا چلا گیا۔  
میرے استاد نے مجھے کہا تھا "جی ہاں کسی نہیں کرنا چاہیے"

(۴)

کراچی میں اس جلائی میں بارشوں نے جو رقصیں کیں اور جو گل کھلائے ان کا تذکرہ ہمیشہ شہر کی تاریخ میں ملے گا۔ ان بارشوں کے فوراً بعد ایک حبیب باگروا نے کی پیش گوئی حکومت کے "موسم کے خداؤں" کی طرف سے کی گئی۔ مگر بعض وجوہ کی بنا پر جو صرت باگروہی کو معلوم ہیں وہ کراچی کی طرف آنا آٹا ٹاٹ گیا۔ حکومت کے جلد باز "موسم کے خدا" کھسپانے ہو کر منہ دیکھتے رہ گئے بعض دوسرے حضرات کو بھی جو اس سائیکلون کے لیے تباہ سے منتظر تھے سنت دیو سی ہوئی۔ پھر بھی بارشوں نے جو کچھ کر دیا تھا سائیکلون (cyclone) کے لیے اس میں اصلاح کرنے کی مطلق گنجائش نہ تھی۔ اسی لیے غالباً اس نے نازل ہونے کی ضرورت نہ سمجھی۔

چاکل دار میں حالات بالکل بنی سمائی اللہ تھے جہاں پانی کے گڑھے تھے وہاں تالاب بن گئے جہاں تالاب تھے وہاں جھیلیں۔ اس شہر کی دو تین گلیوں میں لوگ تیر کر گزر رہے تھے۔ دیاری ندی جو اپنے اندر ایک معمولی نالے کی جی جی کھینچ موم نہیں ہوتی تھی۔ اب چڑھ کر ایک تیز و تند دریا بن گئی تھی اور کنارے کی بستیوں کے لیے ایک بہت بڑا خطرہ!

یہ بارشیں ختم ہونے کے بعد دس دن تھا۔ میں کئی دو بجے غریب انوار ہوتل میں ڈبل روٹیاں پڑانے والوں کی انجمن کی خیر معمولی بینڈنگ کی صدارت کر رہا تھا۔ ہمارے علاوہ غریب انوار ہوتل میں اس وقت کئی اور شہر اور سربراہان ہستیوں اور جو شخص اور چائے نوشی میں اپنے غلوں اور اپنی ٹاکسیدوں کا مارا ڈھونڈ رہی تھیں۔ مسٹر ایم اے چکوری، گنہ اور پرندہ نما مصلح قندہ ظلم ایکٹر۔ اب گناہ فراموش کرو اور کچھ بوسیدہ ملہ۔ وہ وہیلے اس قدر بیزار ہو چکا تھا کہ عرصے سے اس نے اپنے خاقوں پر خود بھی ہنستا چھوڑ دیا تھا۔ اس کی زندگی کا اب ایک اصول تھا غریب انوار



بروز میں بغیر آنے والوں کا یہی اصول تھا کہ چانے کے دم کھیں اپنی جیب سے ذویہ جائیں۔ شیخ فضل علی ڈنگوی منشی فاضل۔ وہ جو کئی جاسوسی منسقی خیز۔ ذاتوں کی بنیادیں حرام کرنے والے نادلوں کا مصنف۔ جس کے نادلوں نے کئی اسکول کے بچوں کو جاسوس اور دیر عاشق بنانے میں اہم حصہ لیا تھا۔ وہ اصلی زندگی میں نہایت دبیبا۔ چورہ دل شخص تھا۔ ہمیشہ پیچھے مرمر کر دیکھنے کا عادی۔ اس کے قرض خراہ چاکلی دارا میں جگہ جگہ موجود تھے ان میں ایک میں بھی تھا۔ اس وجہ سے اس کی زندگی اٹھنا ایک جاسوسی ناول بن گئی تھی۔

حکیم شاہسوار خاں عامل کابل۔ عیسیٰ امراض روحانی و جسمانی میں دباں بیٹھا تھا حکیم اللہ لوک سنیا سی کے اس ہونہار شاگرد کی باتوں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ سال کے اندھا اندر پاکستانی پر فیروں اور قطبوں کی حکومت ہو جائے گی جس کے فوراً بعد بعض غلوں کے زور سے جدوستان دے خود بخود جاک جائیں گے اور جو اہل خیر و ان فیروں اور قطبوں سے درخواست کریں گے کہ وہ بھارت پر راج کریں۔ اس کے تین سال بعد سارا بھارت مسلمان ہو جائے گا۔ اور کفر کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اس سیاسی تفسیر آرائی کے بعد حکیم شاہسوار خاں نے یہ بھی واضح کیا کہ وہ وہ جیسے کے اندر سب سنگدل محبوبوں کو یہودی عاشقوں کے پاؤں میں ڈالنے کی ایک سکیم بنا رہا ہے جس کے بعد اس کے خیال میں چاکلی دارا میں صرف ایک حل طلب معرہ رہ جائے گا کہ کس طرح ان جنات کو جو یہاں کے طبقہ اناث پر شیفٹ ہو چکے ہیں۔ اس بات کے لیے کیا یا جائے کہ وہ انہیں چھوڑ کر دینے یا دسی کے پار ہجرت کر جائیں۔ ان کے علاوہ چاکلی دارا کی بھارتیہ کا ہونے والا موافقت حاجی جیسے ڈیٹر بھی دباں تھا۔ وہ وہ ایک کوٹہ میں بیٹھا چائے شرب رہا تھا اور اس کی دائر میں اس قدر تعفانہ نظر آ رہی تھی کہ کوئی بھی اس کے پاس بے دھڑک جا کر اس کی لڑکی کا رشتہ مانگ سکتا تھا۔ اگر کوئی اس وقت اس کے پاس جا کر راقبہ کا رشتہ مانگتا تو وہ نہایت پورا نہ طریق پر مسکاتا، اس کی دائر میں مسکاتی، وہ اپنی ہوا ہر کی اسیکہ اور چائیس وہ پے چہرہ کا ذکر نہ کرنا اور جب رشتہ مانگنے والا اس کی چائے اور کیکیوں کے دم سے چکنا

تو وہ اٹھ کر سونے کے لیے چلا جاتا۔ دوسری صبح وہ اس کو بھول چکا ہوتا۔ یہ حاجی جیلے دستہ تھا۔ بزم خود چاک دالا کانپور شہری۔

ایک محنت میں نے سامنے کھینے دو داڑھیوں سے دیکھا کہ کوئی شخص سرگ کے مہین وسط میں سیاہ گون پینے چمکے لگائے۔ شیخو سکوپ گھم میں ڈالے اپنے دلوں بازو اوپر ہوا میں اٹھائے گیٹ بھاگ رہا ہے۔

شیخ فضل علی ڈنگوی ناموسٹ نے کہا: ”ڈاکٹر غریب محمد معلوم ہوتا ہے۔“

یقیناً ڈاکٹر غریب محمد ہی تھا۔ اس قدر تیز بھاگے جاتا اور ایسی ہیئت گزائی تھی! اعتراضات کیا تھی؟ حکیم شاہ سوار ایک جلالی سے میں بولے: ”اس پرچی سوار ہو گیا ہے۔“

”میرے خیال میں دماغ چل گیا ہے، میرے دماغ روٹیاں بنا نے دلے ایک ساتھی نے دوائے ظاہر کی جو خود چند جینے پہلے اس حد تک پاگل ہو گیا تھا کہ تنی پوسٹ آفس کے پاس ایک درخت کی ٹہنیوں پر چڑھ گیا تھا اور ہر گزرنے والے کو بتاتا تھا کہ وہ اپنے آشیانے میں آؤں کہ وہ ہے۔“

شیخ فضل علی بولا: ”ڈاکٹر اس سے زیادہ پاگل نہیں ہو سکتا جتنا کہ وہ ہے۔“

ہم سب نے اس فقرے کی گہرائی اور اس کے مزاج کو بے حد سراہا۔ ایک ٹرایم لے چکوڑی نے مسوس کیا کہ اسے بھی کچھ کہنا چاہیے۔

”معلوم ہوتا ہے ڈاکٹر غریب محمد کسی مریض کو دیکھنے جا رہا ہے جلدی میں اس لیے ہے کہ

ابھی سڑاٹھل اس کا شکار اس سے پہلے ہی نہ پھین لے جائے۔“

یہ مذاق ہمیں کچھ اچھا معلوم نہ ہوا کیونکہ ایم لے چکوڑی کو ابھی چاک داڑا کے حقوق شہریت نہیں دیے گئے تھے وہ ایک پردی آدمی غریب تھا اور پردی آدمیوں کو اصل شہریوں کا مذاق اڑانے کا کوئی حق نہیں پڑتا۔ اس کا یہ فقرہ ہمارے بہترین ساتھیوں پر ایک اچھا حملہ تھا۔

”مطلقات داڑھی والا آدمی حاجی جیلے ڈیڑھ سے پاس آیا۔ اس نے پوچھا: یہ آدمی کون دوڑ

رہا ہے۔“

”ڈاکٹر غریب لمحہ۔ اپنے ہونے والے داماد کو نہیں پہچانتے۔“

”ڈاکٹر غریب لمحہ؟ کون؟ میرا حافظہ کمزور ہے۔ آج مجھے دقیم نہیں ملی۔ تہا سے پاس ایک دوپٹے ساٹھے چاڑھنے ہوں گے اور پھر ایک گنت اس نے میری گردن کے گرد اپنی بائیں حائل کر دیں۔ اور چھلنے لگا۔ اس شخص نے میرے ایک دوپٹے ساٹھے چاڑھنے پر ایسے نئے میں دھر بیٹھے سے اس کی تلاش میں ہوں۔۔۔۔۔“

میں نے حالات کو قابو سے نکلنے دیکھ کر جھٹڑ نوکر جھٹکا دیا اور گردن چھڑا انہوں کو پھونکتا سرک پر پہنچ گیا۔ وہاں سے جو اللہ اکبر کا فخر لگا کر میں نے فرانا بھڑا کوئی خواجہ دلوں کو انتھارنا ایک گورھا گاڑی پر صاف اپنی جپ لگاتا اپنے تعاقب کرنے والوں کو دور پیچھے چھوڑ گیا۔ ڈاکٹر غریب لمحہ میرے آگے آگے بے تحاشا اس طرح بھاگ رہا تھا جس طرح کہ اس کے سب پچھلے مریضوں کی رو میں اس کے تعاقب میں ہیں۔

میں چلتا ہوا ”ڈاکٹر ڈاکٹر۔“

اس نے بھاگتے ہوئے پیچھے ہٹ کر مجھے آواز دی ”اسپ! میری دکان پر جا کر میز کے کپڑے کے نیچے جا کر دیکھو تمہیں سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔“ اس نے اپنی رفتار اور زیادہ تیز کر دی۔ جھٹ اور دیوانی نے اس کے پھرے کو اس قدر سچ کر دکھا تھا کہ اس کو پہچاننا مشکل ہو رہا تھا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ اس کے سامنے کوئی خطرناک ارادہ ہے۔ اب ڈاکٹر پرامینڈ پر تھا۔ پرامینڈ دو یا تے یادی کے کنارے پر ایک پختہ بند ہے۔ یہاں سے یادی میں نیچے اپنے نقاباتی ہوئی حورنیں اور کچھ دہیں میٹی ہوئی بی بیوں ایک دلکش نظر پیش کرتی ہیں۔ شہری کچھ اور حورنیں کے پیچھے غروب آفتاب بے حد حسین ہوتا ہے۔ چاکلی واڈا کے باغوں سے اکثر پرامینڈ پر غروب آفتاب کا حسین نظر دیکھنے کے لیے آتے ہیں۔ لیکن اس وقت یادی واقع ایک دریا تھا میرے سامنے پانی ہی بانی تھا۔ متلاطم پتھروں کے اوپر دوڑتا ہوا کھٹا آلود پھرا ہوا پانی۔ ڈاکٹر غریب لمحہ پرامینڈ کی

مختصر پرچہ ہو گیا۔ شام کے مٹنے ہوئے گلاب جیسے پس منظر پر ایک سہلٹ اکیل عجیب و غریب تصویر۔  
ڈاکٹر نے بازو اٹھائے ہوئے تھے۔ میں نے اس کو آوازیں دیں۔ اس نے ایک بار زور سے یاہلی کا  
نعرہ لگایا اور میری آنکھوں کے سامنے سے غائب ہو گیا۔  
ڈاکٹر غریب محمد نے دریائے یاری میں پھلانگ لگادی تھی۔ یہ اس عظیم سائنٹسٹ کا انجام تھا۔  
لیکن اس انجام کا ذمہ دار کون تھا۔ اس کا آلہ مقیاس محبت و مراقبہ اس کی اپنی بڑھتی ہوئی  
درواہگی بہر حال میں جانتا تھا کہ پاکستان ایک ایسے موجد کی قابلیتوں اور دیسرتی سے محروم  
ہو گیا ہے جس کی تیسری صدی شاید میری پیش کر سکے۔.....

(۵)

ڈاکٹر کی دکان کلاؤن لپٹ کھلے تھے۔ اندر کوئی نہ تھا اور ایسا لگتا تھا جیسے وہ پتھر یا  
میں کسی کام سے گیا ہے اور ایک منٹ میں آجائے گا۔ میں جانتا تھا کہ وہ اب کبھی نہ آئے گا۔۔۔  
کبھی ہیں۔ میں نے یز پر سے کپڑا سر کا یا۔ ایک میرے نام کا بعد ان سر پہرہ غافل تھا جس کے  
اوپر مقیاس محبت رکھا تھا۔ مقیاس محبت کی سوئی ۶ پر تھی!  
میں نے لفافہ کھولا خط کا مقصود یہ تھا:-

”میں ڈاکٹر غریب محمد مقیاس محبت کا اصلی موجد اور صرف وہ تعویذ جو اس آسے میں  
بند ہیں حکیم اللہ لوک سنیاسی کے ہیں، اب اپنی عمر کے شتیدہاں سال میں اپنی سب سے کا زندگی کو ختم  
کرنے کے لیے سارے ہا ہوں۔ دریائے یاری کا پانی بارشوں کی وجہ سے چڑھا ہوا ہے اور خود کشی  
کرنے کا ایسا تار موقع چاک داڑل کے باشندوں کی زندگی میں روز روز نہیں آیا کرتا۔ آپ پر بھی  
لگے کہ میں ایک کامیاب ڈاکٹر۔ کئی عجیب و غریب ایجا دوں کا موجد۔ مقیاس محبت جیسی چیزیں  
کن چیز کا دریافت کرنے والا۔ کیوں عزت اور دنیاوی شہرت کو ٹھکرا کر اپنی زندگی سے ہاتھ  
دھو نا چاہتا ہوں۔ اس کی وجہ نا کامی محبت ہے۔ سچ وہ عورت جس کے بارے میں مجھے  
یقین تھا کہ اسے مجھ سے بے انداز محبت ہے میرے پاس آئی..... میں نے اس وقت جب

وہ اپنے مدھر ہونٹ میرے خنٹوں پر رکھنے کے لیے بڑھا رہی تھی مقیاس الحبث سے اس کے درجہ حبث کو ناپا۔ انوس اس کی محبت جھوٹی تھی، اس کے ہمدرد جان جھوٹے۔ اس کی مدھر آنکھوں کا نشہ جھوٹا تھا۔ مقیاس الحبث پر سونے کی رینڈنگ۔ "تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اس کی محبت ظاہری تھی اور حقیقت میں اسے مجھ سے نفرت تھی۔

"آپ اتفاق کریں گے کہ اب میرے لیے اس دنیا میں رہنا بے سود ہے۔"

"میں اپنی یہ دوکان چوچا کی داڑ کا بہترین پرائیویٹ مطلب ہے، اپنے دوست اسپ کے حواسے کرتا ہوں۔ میری اولاد و زید کوئی نہیں دیں تے شادی نہیں کی اور یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ نہ میرے کوئی ایسے رشتہ دار ہیں جو میری زندگی میں اپنے آپ کو میرے رشتہ دار کہتے ہوں۔ اسپ میرا بہترین دوست ہے۔ اس مطلب کے کئی تیر ہدف مشغول کی تیاری کے لیے اس نے اپنی جان تک دوا دی تھی۔ اور مجھے تک مثلاً بلوں کی تلاش میں بخون کی طرح دشت و صحرا میں مارا مارا پھرتا رہا تھا۔ مجھے امید ہے کہ اسپ ڈاکٹری کے پیشے کو ذیل روٹیاں بنانے کے پیشے سے زیادہ منفعت بخش اور سہل پائے گا۔

"اپنی ایجاد مقیاس الحبث بھی اس کو دیتا ہوں اور ساتھ ہی یہ جیفہ کرتا ہوں کہ اس کو ہرگز ہرگز استعمال نہ کرے اور نہ اس کو عام کرے۔ اس کے استعمال کے نتائج انتہائی خطرناک ہو سکتے ہیں۔ جس طرح خود میرے کہیں میں۔ یقیناً اس سے دنیا کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ اں اگر میں زندہ رہتا تو میرا ارادہ تھا کہ اس آسے میں ایسی اصلاح کی جائے کہ بعض عملوں سے نفرت کو محبت میں تبدیل کیا جاسکے۔ مگر یہ خداوند تعالیٰ حق شانہ کو منظور نہیں تھا۔ اب میں دریغ باری کی طرف رجوع ہوتا ہوں کیونکہ مجھے ڈر ہے کہ بارش ختم جانے کی وجہ سے بانی اتر جائے گا۔"

(۶)

مقیاس الحبث میرے پاس ہے۔ اور ڈاکٹر کی وصیت بھی۔ اگرچہ اس کی دکان کو حکومت

نے مرحوم کی خواہش کے خلاف میرے نام الاٹ کرنے سے انکار کر دیا ہے لیکن میں مرحوم ڈاکٹر کی وصیت پر عمل کروں گا۔ مقیاسِ المحبت کبھی مارکیٹ میں نہیں آئے گا۔ میں چاکلی واڈا میں خصوصاً اور ساری دنیا میں عموماً مایوسی اور غم نہیں پھیلا نا چاہتا۔ اگر نوجوان عاشق چند سال ایک رنگین دھوکے اور فریب میں کاٹ دینا چاہتے ہیں تو میں ان کی زندگیوں میں شک و شبہ کیوں پیدا کروں۔ ان کو اپنی خود فریبی کی دنیا میں مست ہی رہنے دینا چاہئے۔

میرے پاس مقیاسِ المحبت ہے۔ لیکن میں ایک جنایت ناخوش انسان ہوں۔ آج پھر میں نے اس کو کلائی پر باندھا اور مختلف اشیا کا درجہ صحت ناپا۔ نتیجہ پہلے کی طرح مایوس کن تھا۔

۴+

اونٹ

۳-

گھڑا سر پر رکھے ایک عورت

۲-

بغیر کمرے کے ایک عورت

نتیجہ پہلے سے بھی بدتر ہے۔ عورتوں کا صفر اب - ۳ ہو گیا ہے۔ اونٹ کی جت اسی طرح بدستور پانوا ہے۔ آئندہ سال کی بارخوں میں شاید میں بھی ..... !

## تنقید نگاری سے توبہ

مجھے کتابوں پر ریویو لکھنے میں عکرمائل ہے۔ اور میں انہیں پڑھے بغیر ہی ریویو لکھ سکتا ہوں۔ یہ خدا کی دین ہے۔ جس طرح بعض لوگ شاعر یا پیدائشی انتقراضانہ نویس ہوتے ہیں۔ غالباً میں ایک پیدائشی تبصرہ نگار ہوں۔

پچھلے دو ایتھن سال کے عرصہ میں میں نے ادیب سازی کے سلسلہ میں جو کام کیا ہے وہ آپ سے پوشیدہ نہ ہوگا۔ میرا ریویو کرنے کا طریقہ یہ ہے۔

”خیال تو“ کا ایڈیٹر جمیرا دوست ہے مجھے کتابیں ریویو کرنے کے لئے بھیجتا ہے۔ میں ان کو ادھر ادھر سے الٹ کر کسی صفحہ کو کھول کر دو تین سطریں پڑھتا ہوں۔ مثلاً اس نے کہا ”چمائے کی پیالی بیڑ!“

بھورے خان نے کہا ”شکر یہ میں ابھی ابھی مین پل کر آیا ہوں“

اور پھر کتاب کو بند کر کے اس پر تین چار صفحے کا ریویو نگھیٹ دیتا ہوں۔ اگر کتاب ذرا اہم ہوئی تو میں اسے اپنے بھانجے کو رجو آٹھویں جماعت میں تعمیر پار ہے، پڑھنے کے لیے دے دیتا ہوں۔ اور ذات کو سوتے وقت اس سے کہتا ہوں کہ مجھے اس کا پلاٹ سنائے۔ اگر اس کے پٹے کچھ نہ چڑا تو کچھ لیتا ہوں کہ کتاب فی الواقعہ ہائی بروڈینا اور اپنے ریویو میں اسے ترجیح اور عالمانہ بتاتا ہوں۔ اب تک یہ طریقہ بہت کامیاب رہا تھا۔ کتنا کامیاب آپ کو اس شہرت سے اندازہ ہو سکتا ہے جو اس سلسلے میں مجھے حاصل ہے۔ خود میرے ریویو پر ریویو لکھے جانچکے ہیں





پہننے ہوئے ہو میری ہے :

میں نے کتاب کو ایک اور جگہ سے اٹا۔ یہاں اس قسم کے نا دور جواہرات جڑے تھے اگر عبد الشکور اپنے تحت الشعور کو کسی طرح اپنے الشعور میں مدغم کر سکتا تو اس کی نفسیاتی لمبیزوں کو قائم ہو جاتا۔ اس کو خود بخود ملازمت مل جاتی۔ اور اس کے دفتر کا سپرٹنڈنٹ خود بنفس نفیس ملازمت کو پشت پر رکھے اس کے پاس حاضر ہوتا۔ اس کے مکان کا پتھلے دو ماہ کا کہ یہ خود بخود ادا ہو جاتا اور اس کے قرض خوار اس کی خوش طبعی سے متاثر ہو کر اپنے پیچھے قرضے مانگنے کی بجائے اسے اور قرضہ دینے پر اصرار کرتے۔ مگر انسوس کو عبد الشکور محض دس جماعتوں تک پڑھا تھا۔ انسوس اس نے ڈاکٹر سنگھ نراڈ کی کتاب "سائیکالوجی آف نیورس" نہیں پڑھی تھی۔ انسوس اس نے اندر سے شدید نہیں پڑھا تھا انسوس وہ بعد کوشش جبریز چاشنی کی اومیسس کو ایک صفحے سے آگے پڑھنے میں کامیاب نہ ہوا تھا اگر وہ کم از کم "اومیسس" ہی آدھی تک مطالعہ کر لیتا تو اس وقت اس کی نفسیاتی اور جسمانی حالت اس قدر قابلِ رحم نہ ہوتی۔ چنانچہ اس کی بے وقافی ذکر کرتی اب وہ اس طرح محسوس کر رہا تھا۔ جیسے وہ پاگل ہو جانے لگا۔ جیسے اس کے لیے پاگل ہو جانے کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں ہے۔ . . . . .

یہ کافی تھا۔ اور میں کتاب کو بند کر کے اس پر ریلوے لکھنے بیٹھ گیا۔

پندرہ منٹ میں میں ٹکریو ریلوے لکھ ڈالا۔ چھ صفحے کاریلو۔ اس میں میں نے لکھا کہ اس ناول میں مصنف محرم ذوالفقار خان نے ایک بے کار تعلیم یافتہ نوجوان کے جذبات کی فرمائین نقطہ نظر سے تجزیہ نفسی کرنے کی کوشش کی ہے مگر وہ اس میں زیادہ کامیاب نظر نہیں آتے۔ پھر میں ان کی اس کوشش کو کامیاب بھی نہیں کیا جاسکتا۔ وہ زندگی کی تلخ حقیقتوں کی ہر پہلو عکاس کرتے ہیں مگر ان کی روایت

پرستی سب کئے کرانے پر پانی چیر دیتی ہے۔ ان کی کردار نگاری کی تکنیک خارجی نہیں بلکہ داخل ہے یعنی وہ اپنے کرداروں کے چھپے چھپے سمت و شعور میں گھس کر ان کی زبان سے بولتے ہیں۔ اور جب اس شاندار اور بے حد رقت انگیز سین میں جہد و لشکر جو اس ناول کا ہیرو ہے اپنے کپڑے پھاڑ کر چلاتا ہے۔ میں پاگل ہوں، میں پاگل ہوں۔ تو ہمیں صاف طور پر اس میں مصنف خود جوتا ہوا نظر آتا ہے محترم ذوالفقار خان میں ایک حیب یہ ہے کہ وہ کرداروں کو باہر سے ٹوٹتے ہیں۔ اور ان کے بارے میں گہرائی سے نہیں گھستے۔ لیکن امید ہے کہ اپنی اگلی کتاب میں وہ اس کے بالکل برعکس تکنیک استعمال کریں گے۔ ان کی پہلی ہی کتاب سے سب کی آنکھیں کھل گئی ہیں۔ اور ادبی دنیا میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا ہے۔ سب نے محسوس کیا ہے کہ ایک نیا ادیب منصف شہود پر جلوہ گر ہو چکا ہے۔ جس کی ادبی کاوشوں سے اردو ادب کو چار چاند لگنے کی توقع ہے۔ مگر ذوالفقار خان کو سب سے سب سے بڑھنا ہو گا۔ ابھی انہیں فعل نگارش کے متعلق بہت کچھ سیکنا ہے۔ اور انشیا کی سب کتابوں کا مطالعہ کرنا ہے۔ ان کے ناول سے گمان ہوتا ہے کہ عہد الشکور نے دھوم مچا کر منصف خود ہی ہے، ابھی تک تاسیہ کا لوجی آف نیو راکس نہیں پڑھی آندرسے ٹرید نہیں پڑھا۔ میں خرم ذوالفقار خان سے پوچھنے کی حیرت کروں گا کہ اگر انہوں نے خود اپنے اقرار کے مطابق نہ فرائڈ کو پڑھا ہے نہ آندرسے ٹرید کو اور نہ جانس کو تو پھر انہوں نے پڑھا کیلئے کیا کتابوں کے مطالعہ کے بغیر وہ ہیں کیسے کوئی محسوس یا مابعد تخلیق سے کہتے ہیں۔ راقم الحروف نے طو ان تینوں مصنفوں کو ہائی اسکول ہی میں پڑھا ڈالا تھا۔۔۔۔۔ اس نپٹنے میں شاید ذوالفقار خان پتنگ اڑاتے ہوں گے، یا بہرام ڈاکو حوت ہے وہاں ہد کی قسم کے ناولوں سے اپنی راتوں کی نیند حرام کرتے ہوں

گے . . . . . خرم ذوالفقار خاں چینی کا سبکل مصنف جنگ چنگ پھوں سے بے حد متاثر معلوم ہوتے ہیں۔ (یہ نام میں نے اس وقت فرضی گھڑیا تھا) اور انہوں نے اپنے ناول کے پلاٹ کے سلسلہ میں مشرق چنگ پھوں کے ناول ”چیکو“ کی جیکو سے کسی حد تک استفادہ کیا ہے۔

کچھ اس قسم کے الفاظ تھے میرے ریلوے کے لفظوں کے کچھ پیر پیر کے ساتھ میں اس موضوع کے متعدد ریلوے پہلے کر چکا تھا اور ایڈیٹر ”خیال تو عمر یہ ریلوے حوالہ کر دینے کے بعد میں اس کے اور خرم ذوالفقار خاں کے متعلق سب کچھ بھول گیا۔

جب یہ ریلوے خیال تو میں چھپا تو اس سے تین چار روز بعد مجھے خرم ذوالفقار خاں کا خط موصول ہوا۔ جس میں انہوں نے میرے حوصلہ افزا ریلوے کا شکریہ ادا کیا تھا اور مجھے یقین دلایا تھا کہ انہوں نے چنگ پھوں کی کوئی کتاب نہیں پڑھی۔ اور اگر ان کے ناول کی مشرق چنگ پھوں کے ناول سے کچھ مشابہت ہے تو اسے غرض اتفاق پر عمل کیا جاسکتا ہے۔ آگے چل کر انہوں نے مجھ سے درخواست کی تھی کہ آیا میں ان کو مشرق چنگ پھوں کے پبلشر کے ہتھے سے آگاہ کر سکتا ہوں۔ جس سے عظیم چینی مصنف کے ناول ”چیکو“ کا انگریزی زبان کا ایڈیشن دستیاب ہو سکے۔

میں نے جواباً لکھ بھیجا۔ ”چیکو“ تو میں نے اصل چینی زبان میں پڑھا تھا جہاں تک مجھے علم ہے اچنی ناول کا انگریزی زبان میں ترجمہ نہیں ہوا۔“

میرا خیال تھا معاملہ یہیں پر ختم ہو جائے گا۔ دوسرے دن میں ابھی بستر سے نکل کر شویہ ہی کر رہا تھا کہ کسی نے دروازے پر دستک دی۔ میں سمجھا شاید دودھ والا ہوگا۔ منہ صابن کے جھاگ میں لٹکڑا ہوا ہاتھ میں بردش — اس



کو اس طرح شاید بچے اس سے جلد چھٹکارا حاصل ہو جائے۔

”شیو کرلوں گا۔۔۔۔۔ آپ فرمائیے۔ اتنے سویرے سویرے۔۔۔۔۔“

”ہاں وہ چینی کتابچہ کراچیکو“ آپ کے پاس ضرور ہوگی۔ آپ نے اپنے ریلوے میں اس کا حوالہ دیا ہے۔۔۔۔۔ وہ نہیں تو چنگ پھنگ چوں کا کوئی دوسرا شاہکار؟“

”وہ کتاب“ چیکو! چیکو!“ ہاں! مجھے یاد آیا۔ میں گی ہی تراے پڑھ رہا تھا مشر چنگ پھنگ چوں۔۔۔۔۔ یہی نام ہے نا۔۔۔۔۔ اس وقت چین کے کھاسیکی روایت میں لکھنے والوں میں سب سے زیادہ ممتاز ہے وہ جو میں نے آپ کی کتاب پر اپنے ریلوے میں لکھا تھا کہ اس کی چنگ پھنگ چوں کی کتاب سے مشابہت ہے۔۔۔۔۔“

”آپ نے چینی زبان کب سیکھی تھی؟“ مشر ذوالفقار نے بات کاٹتے ہوئے، بنجیدگی سے کہا۔ ”غالبا اس وقت جب میں کوڑی کے گھوڑے پر سیر کیا کرتا ہوں گا۔“ میں نے اس سوال میں نیش لہن کو نظر انداز کر کے اتنی ہی بنجیدگی سے دوڑیکہ مشکورہ طور پر دیکھتے ہوئے جواب دیا ”غالبا ۱۹۲۸ء میں۔۔۔۔۔ میں اس وقت انڈین جماعت میں پڑھتا تھا۔“

مشر ذوالفقار نے قطع کلاں کر کے مجھے مزید دروغ گوئی سے بچاتے ہوئے پچھا ”آپ نے من یو ٹانگ کی کتاب پڑھی ہیں۔ وہ سب تو انگریزی میں ہی ترجمہ ہو چکی ہیں؟“

”میں نے جواب دیا۔ ہاں اچھا لگتا ہے، مگر خارجی اسکول کا مصنف ہے۔ میرا مطلب ہے اس میں داخلیت نہیں۔ پھر میں برا نہیں۔ میں نے تو اس کی کتابیں اصل چینی زبان میں پڑھی ہیں۔ ترجمہ میں دراصل وہ بات نہیں رہتی۔“

”اور پنگ پانگ کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟“ ذوالفقار خان نے پوچھا۔  
 ”اچھا لگتا ہے“ میں نے جواب دیا۔ اگرچہ میں نے اس کا نام کبھی نہیں سنا تھا۔ چین  
 کی عوامی زندگی کا اس وقت وہ واحد ملک اس ہے۔ مگر رومانیت پسندی اس کی تخلیقات  
 میں جو غار جیت ————— اور ————— رومانیت کا رنگ لے آتی ہے۔ وہ  
 میری راستے میں اس کی اصلی خوبیوں میں سے بہت کچھ منفی کر لیتا ہے۔ پھر بھی وہ اس  
 وقت چینی ادب کا آئندہ سے ٹرید ہے۔“

”صداٹ کیجئے“ مسٹر ذوالفقار خان نے یک لخت اٹھتے ہوئے کہا۔

”آٹھ بجے بجے ایک منزوری کام پر جانا ہے۔ اب اجازت چاہتا ہوں۔ پنگ پانگ  
 کے متعلق آپ کے ان ارشادات کو میں یہاں کے ہر ادیب تک پہنچانے کی کوشش کروں  
 گا۔ غلط جمع رکھئے اور ویسے جاتے جاتے یہ عرض کروں کہ پنگ پانگ ایک کھیل کا نام  
 ہے۔ جو گیند سے میز پر کھیلا جاتا ہے؟“

”میرا مطلب طریقہ فکر کی شائبہ سے تھا۔ آپ سمجھتے ہیں نا ————— سبجیکٹو  
 (SUBJECTIVE) طریقہ فکر آبجیکٹو (OBJECTIVE) آپ سمجھتے ہیں  
 نا؟“ میں نے بازو ہلکا کر کے اپنا مطلب سمجھانے کی کوشش کی۔ اور اس کوشش میں  
 برش سے اپنی ناک پر سفیدی کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

”سوہ کتاب تو آپ کے پاس ہوگی ہی۔ بات یہ ہے کہ ہم نئے ادیبوں کو چینی ہی  
 فن کاروں کے شاہکار پڑھنے چاہئیں۔ نمبر روڈ پر ایک چینی دندان ساز آہ فنگ  
 میرا دوست ہے۔ میں اس سے اگلے ہی روز دو ڈرامے لکھا چکا ہوں۔“ مسٹر  
 ذوالفقار خان نے صحت کھول کر اور انگلی اندر ڈال کر مجھے نکل ہوئی ڈراموں کی بجائے  
 دتوہ دکھانے کی کوشش کی۔ ”میرا ارادہ ہے کہ آہ فنگ کی مدد سے میں ”پیکو پیکو“

کا اردو ترجمہ کروں۔ ورنہ آپ تو یہی ہیں۔“

”ہاں ضرور کیجئے، میں اردو زبان طبقے کو چین ادب سے روشناس کرانا چاہتی ہوں۔“

ضرور کیجئے۔ میں نے کہا۔

”اچھا تو مجھے وہ کتاب ایک دو دن کے لیے عنایت کر دیجئے!“

”کون سی کتاب۔۔۔“ ”ہاں اس کتاب کے متعلق بھول گیا تھا۔“

”وہی چیکو! چیکو!“ — چنگ چنگ پیوں کا شاہکار۔“

”وہ کتاب۔۔۔“ ”ہاں! میں نے خدا جانے اس کو کہاں رکھ دیا ہے۔“ ”میں نے

کہا۔“ ”پرسوں میں تو وہ میرے پاس ہی تھی۔ ورنہ اس پر میل بھا بھجے نا۔“ ”عجیب نا

معقول رکھا ہے۔ میری کتاب میں یہاں سے اٹھا کر لے جاتا ہے۔ اور بھینس کے آگے ڈال

دیتا ہے۔“

”بھینس کے آگے!“ ”مسٹر ذوالفقار نے کرسی پر سے ہٹا کر اٹھتے ہوئے اجتماع

کیا۔“

”ہاں بھینس کے آگے! یہ اس کی“ ”ہاں میں سے ایک ہے۔“

”مگر چنگ پانگ ایک چینی مصنف ہیں تو ہے۔۔۔“ ”آپ مذاق تو نہیں کر رہے۔“

”ذوالفقار صاحب ٹھہریئے۔“ ”چائے کر پتے جالیئے۔“ ”مگر میرا عاقباتی دروازہ کھول کر

باہر جا چکا تھا۔“

صاحب میرے گالوں پر سوکھ چکا تھا۔ اور ذوالفقار خان کے چلے جانے کے بعد

مجھے ایک مبہم سا احساس ہوا کہ ریویو نری کی حیثیت سے میرا کیرئیر ختم ہو گیا ہے۔

مسٹر ذوالفقار خان اپنے وعدے کا پکا ثبوت ہوا۔ قابل سے قابل ترین

ڈسٹنڈ ور ہی بھی اس خوبی سے اس کام کو سرانجام نہ دے سکتا جس غریب سے اسے

ذوالفقار خان نے کہا۔ ایک ہفتے کے اندر اندر شہر کا ہر اسٹے آدمی۔ کافی ہاؤس کا ہر خوش اس قصبہ کو جانتا تھا۔ اوتہ پنگ پانگ کے متعلق میری رسائے کو قہقہوں کے درمیان۔ ادنیٰ غفلتوں میں دسرایا جاتا تھا۔ کم از کم اردو کے دو ماہناموں "صبح" اور "مسکین" کے تنقید نگاروں نے طویل مقالوں میں

میری خوب خبریں و تنقید نگاروں کو ایسا نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ کاش ہم لوگوں میں یونین اُپرٹ ہوتا (ہیٹے کے اندر اندر سادی ادبی دنیا اس مذاق سے واقف ہو گئی تھی۔ اور اب جب کہ تین ماہ بعد میں لوگ مجھے دیکھتے ہیں تو ان کی ہاتھیں چرنے لگتی ہیں اور وہ مجھ سے پوچھتے ہیں۔ "پنگ پانگ" کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟" میرے لیے گھر سے باہر نکلنا دو بھر ہو گیا ہے۔

میرا دوست "مخیال" تو "کائیڈ ٹراپ" مجھے اپنے رسالے کے لیے ریویو لکھنے کی دعوت نہیں دیتا۔ میں اب اس جگہ سے کوچ کرنے کا ارادہ کر رہا ہوں۔ اُس جگہ جہاں ہم زبان کوئی نہ ہو۔ اور جہاں کوئی نہ ہو، وغیرہ اور وہاں ذوالفقار خان بھی نہ ہو۔



# زیر اسکیم

زیریں کو در آمد کرنے کا انوکھا خیال چچا عبدالباقی کے ذہن میں پہلے پہل غالباً اس تصور کو آیا جب ہم — چچا عبدالباقی، اس کا سات سالہ لڑکا عبدالرحمن اور میں چڑیا گھر میں جانوروں کا معائنہ کرنے گئے۔ معائنہ کا لفظ میں نے قصداً استعمال کیا ہے کیونکہ جس طریق سے چچا جانوروں کو خورد اور بنیدگی سے دیکھتا ہے، اس کے لیے معائنہ کا لفظ ہی مناسب ہے۔

میں نے غالباً پہلے بھی کہیں عبدالرحمن کا ذکر کیا ہے۔ وہ نکلے ہوئے کانوں والا ایک شوخ لڑکا ہے جسے اپنے بڑوں کا ذوق بھر بھی پاس ادب نہیں۔ ایسے بچوں کی ہی وجہ سے بزرگ حضرات کو قیامت کے قرب کا احساس ہو جاتا ہے۔ ان دنوں میں کچھ روز کے لیے چچا کے ہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ اور ایک طریق سے اس عبدالرحمن کی باتنی کے فرائض سرانجام دے رہا تھا۔ اپنے اس شاگرد کی مستقل صحبت چند دنوں سے میرے اعصاب پر اثر انداز ہو رہی تھی۔ عبدالرحمن میرا صدور جہشتانی ہو رہا تھا۔ پتی بھر کے ایسے مجھے تہنات چھوڑتا۔ اور میں سرواڑا ہوں بھر کر اکثر اس بات پر قہقہے کرتا کہ بعض انسان دوسرے انسانوں کے اس قدر خشتانی کیونکر ہو جاتے ہیں چچا کے مکان پر آگیا تھے ایک ہفتہ ہی تو ہوا تھا اور اس عرصے میں عبدالرحمن مجھ سے میرا مغل اور سگڑ کا سڑ بلور خود مانگے ہوئے شخصوں کے قبول کر چکا تھا۔ ایک دو روز سے وہ مجھے اس بات پر اکسانے میں لگا ہوا تھا کہ میں اپنی کلائی کی گھڑی بھی اسے نقد کر دوں۔ اس کا اسکول

کالام بھی میں اسے کر کے دے رہا تھا۔ چچا عبدالباقی اپنے منہ بولے بھتیجے اور لڑخیز ہونہا<sup>۱</sup> بیٹے کے درمیان اس قدر محبت اور دوستی کو دیکھ کر پھولانہ سماتا۔ اور اگرچہ وہ جانتا تھا کہ یہ محبت اور دوستی ایک طرف ہے پھر بھی وہ یہی ظاہر کرتا ہے جیسے میں عبدالرحمن پر جان چھڑاتا ہوں اور اس سے گہری وابستگی اور انس رکھتا ہوں۔

اپنی دونوں ایک ٹھیکیلی، سنہری انگوٹھ کو چڑیا گھر کے جانور ہیں دیکھ کر بہت خوش معلوم ہوتے تھے۔ چچا عبدالباقی کے ہمراہ چڑیا گھر جانا ایک سعادت ہے۔ ہمارا جانوروں کے معائنہ کا طریق کار یہ تھا کہ ہم ایک جانور کے منہ پر کپڑے کے سامنے جا کر کھڑے ہو جاتے۔ چچا ہم سے ایک قدم آگے بائیں منہ پر کپڑے کے ساتھ پہنچ کر رک جاتا ہے۔ اور عبدالرحمن اور میں اس کے پیچھے صاف آراہو جاتے، چچا عبدالباقی چشمناک پر ہاتھ رکھتا ہے اور میں بید کی سوئی لیے اور عیسے متانت اور وقار کی تصویر بنے جانور کا معائنہ کرتا ہوں۔ اس کے دوران میں وہ اپنی سوئی سے جانور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھے اور عبدالرحمن کو اس جانور کی عادات و خصائص، طریقہ دو ہاٹھ، فلسفۂ زندگی وغیرہ پر ایک مبسوط لکچر دیتا ہے مختلف جانوروں کے متعلق اس روز کئی قسم کی معلومات حاصل ہوئیں جو بہت عجیب و غریب تھیں۔ ایک جگہ چچا کا یہ معائنہ پورا کا میاب نہ رہا۔ بد قسمتی سے

جانور نے موقع کی سنجیدگی اور اس کی اہمیت کو نظر انداز کر دیا۔ ہذا یہ کہ چچا عبدالباقی بڑی بندروں کے ایک جڑ سے کے منہ پر کپڑے کے ساتھ کھڑے ہوئے میرے اور عبدالرحمن کے استفادہ کی خاطر برازیل بندروں کے سماجی اور معاشی پس منظر پر روشنی ڈال رہے تھے۔ اور چچا کی تقریر سننے کے لیے کئی تماشائی ہمارے گرد جمع ہو گئے تھے، خود برازیل بندروں کا جوڑا چچا کی باتوں کو گہری توجہ اور دلچسپی سے سنتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اس تقریر کے دوران میں چچا نے کسی مسئلے پر زور دینے کے لیے اپنی سوئی اٹھا

کوندروں کی طرف اشارہ کیا۔ جس پر برازیلیوں میں سے ایک نے نہایت پھرتی اور صفائی سے سلاخوں میں سے پنجرہ نکال کر سوئی کو چھپٹ لیا۔ چچا کی تقریر لوگوں کے ہتھکڑوں میں ختم ہو گئی۔ پہچانے نہیں مگر یقین دلایا کہ برازیلیوں نے یہ غصہ دل لگی کی ہے۔ اور ان کا سوئی ٹھین لینے کا کوئی ارادہ نہیں اور یہ کہ وہ اس سے بخوشی ویر کیٹنے کے بعد اسے لوٹا دیں گے۔ برازیلیوں کی مزاج کی حس اور معقولیت کے بارے میں چچا کی خاص رائے تھی۔ ہم نے برازیلیوں کو کئی طریقوں سے سوئی واپس کرنے پر اکسایا۔ عبدالرحمان نے انہیں دو تین مونگ پھلی کے پیکیٹ پیش کئے۔ مگر برازیلی اپنی مزاج کی حس کو بہت دوسے جانے پر تھے۔ بیٹھے تھے۔ بخوشی ویر کے بعد چچا عبدالباقی نے برازیلیوں میں اپنا اعتماد دکھوایا۔ ان کے متعلق اپنی رائے تبدیل کر دی اور ان کو دھکی وی کر دہ چڑیا گھر کے سپرنٹنڈنٹ کے پاس جا کر چڑیا گھر کے بعض جانوروں کے برے اخلاق کی شکایت کرے گا۔ اور اس سے اپنے نقصان کے ہر مانے کا مطالبہ کرے گا۔ اس کی نوبت نہ آئی اور چڑیا گھر کے ایک ملازم نے آخر خود پنجرے کے اندر جا کر چچا کی سوئی کو برازیلیوں سے رہائی دلوائی۔

چچا کے سکون طبع کو دوسرا دھچکا اس وقت لگا جب ہم شیر ہبر کے پنجرے کے سامنے کھڑے تھے۔ یہ شیر ہبر ایک معترضہ حیوان تھا۔ اور سلاخوں کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ ایک بیڑاری کے عالم میں تاک رہا تھا۔ چچا سلاخوں سے آدھ فٹ کے فاصلے پر اپنی سوئی کو زمین پر ٹیکے شیر ہبر کا معائنہ کرنے لگا۔ وہ یہیں شیر ہبر کی حرکات اس کی وسعت قلبی اور اس کی خودی پر ایک تقریر کر رہا تھا اور ہم پر واضح کر رہا تھا کہ کس طرح ایک شیر ہبر ایک عام شیر سے یعنی اس شیر سے جو ہر نہیں ہوتا ہر لحاظ سے ممتاز ہوتا ہے میرا خیال ہے کہ جب وہ ہمیں یہ بتا رہا تھا کہ شیر ہبر یا میں سیدھا تیرتا ہے، اور اگر وہ

تیرتے ہوئے پہاڑ میں مڑ جائے تو چرواہوں کا رسے پر آکر دوبارہ تیرتا ہے۔ شیر بھرنے  
اجتناب کے طور پر اس کو اپنے بڑے ایال دار سر کو جھنجھوٹا اور خوفناک طریق سے دھاڑا۔  
پہا چا عبد الباقی اور ہم فوراً وہاں سے بھاگے اور زیربوں کے احاطہ کے پاس آکر دم لیا۔  
احاطے میں دو زیربرے زمردیں گھاس پر پٹیل رہے تھے۔ وہ چاق چوبند  
دھاری دار زیربرے جوہری خاکستری کھال پر چوڑی سیاہ دھاریاں خوشنما معلوم ہوتی  
تھیں۔ اور چوپایوں کے خلاف اپنی جلی غاصت کے باوجود وہ انہیں دلچسپی سے دیکھنے لگے۔  
پہا چا عبد الباقی احاطے کی جالی کے ساتھ لٹکے ہوئے ایک کڑوی کے بورڈ کی طرف چلا گیا جسے  
چڑیا گھر کے منتظین نے ان لوگوں کی خاطر گھوایا تھا جو زیربوں میں کسی قسم کی دلچسپی لیتے تھے۔  
اس پر انگریزی میں زیربوں کے متعلق ہر نوع کی معلومات بہم پہنچائی گئی تھیں۔ بورڈ کو  
بغور پڑھنے کے بعد پہا چا عبد الباقی ہماری طرف آیا، اور اس نے عبد الرحمان اور مجھے فرمایا کہ  
اطلاع دی کہ احاطے میں وہ جو دو ڈھیرنا جا زہر ہیں حقیقتاً زیربرے ہیں۔

اس نے ہمیں احاطے والے زیربوں کے گزشتہ سوانح کے بارے میں ایک مکھڑ دیا۔  
پہا چا عبد الباقی ان حیوانوں کے اگلے کوٹوں اور چیت انداز سے بے حد متاثر معلوم ہوتا  
تھا۔ اور اس کی رہنمائی میں ہم نے احاطے کی جالی دار چار دیواری کے گرد چار پانچ چکر لگائے۔  
پہا چا چوپایوں کو ہر ممکن ذرا سیج سے دیکھنا چاہتا تھا۔ عبد الرحمن بھی زیربوں کے متعلق کچھ  
جانتا تھا۔ کم از کم اس کا خیال تھا کہ وہ بانٹا ہے۔ اس نے اپنی اور دو کی کتاب میں زیربوں  
پر ایک مضمون پڑھا تھا۔ ان دونوں باپ بیٹوں کے درمیان جو مجھے علم حیوانات کے متعلق  
کلی معلومات دینے پر مصر تھے میں لکھنے آپ کو بے حد جاہل محسوس کیا۔ میں نے تہہ کیا کہ چڑیا  
گھر سے جلتے ہی زیربوں پر ایک مکمل کتاب پڑھوں گا۔ اور اپنی معلومات غار کو دیکھ  
کرنے کی کوشش کروں گا۔ چوپایوں کے بارے میں میری معلومات بہت کم ہیں۔ اور



”وقت آ رہا ہے جب گھوڑے بیکار ہو جائیں گے۔ بھیتیں بھتیاں قلعی ادا شدہ جھے  
گھوڑوں کے خدات کوئی بعض نہیں۔ جھے ان سے ہمدردی ہے۔ مگر اس میں کوئی شک  
نہیں کہ ان کا مستقبل تاریک ہے؟“

چڑیا گھر کے ایک لازم کے بتانے پر کہ اب چڑیا گھر بند ہو رہا ہے اور پھر چار بجے  
شام کو کھلے گا، ہم نے زیریں کو خیر باد کہا اور چھانک کی طرف بھاگے، زیریں کی درآمد  
کی تجویز پر بحث چھانک تک ہوتی رہی اور جب ہم وہاں سے گھر کے لیے دوہری پست  
والی بس میں سوار ہوئے تو چھت کے اوپر بھی یہ بحث جاری رہی چچا عہد الباقی کی واضح  
دلیوں کے باوجود کہ زیریں کی درآمد بے حد منافع بخش رہے گی، میں ابھی پوری  
طرح مطمئن نہ تھا۔ اور میرے شکوک کی طور پر دفع نہ ہوئے تھے۔  
چچا کے ڈرائنگ روم میں شکوک کی چائے پینے ہوئے بھی ہماری گفتگو کا موضوع  
زیریں تھے۔

”دیکھو بھئی بھتیجا! امیری بات سنو! چچا نے مجھے قائل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔  
”فرض کہ وہم پہلے چل سو زیریں درآمد کریں اور ان کی پہلی انٹرنیشنل نسل کا انتظام کریں۔  
سال کے اخیر تک اگر ہمارے پاس پانچ سو زیریں بھی ہوں۔ ممکن ہے ہزار ہوں یا  
دو ہزار۔۔۔ میں کم سے کم تحفہ نگار ہا ہوں۔ ہاں اگر پانچ سو زیریں سے بھی ہوں۔  
اور ہم ان کو پانچ سو روپیہ فی زیریں کے حساب سے بھی فروخت کریں تو پانچ سو روپیہ  
ضرب پانچ سو کتنے ہوئے؟“ جمد الرحمن بھئی پانچ سو کو ذرا پانچ سو سے ضرب تو دو؟“  
جمد الرحمن نے اپنی کاپی پر ضرب دے کر جواب بتا یا نہ پانچ سو پچاس؟“  
”پانچ سو پچاس روپے ہوئے۔ ہاں بھئی بھتیجا! پانچ سو پچاس۔۔۔ مگر  
بھئی جمد الرحمن پانچ سو پچاس کیسے ہوئے؟“

”دولاکھ پچاس ہزار بنتے ہیں“ میں نے زبانی ضرب دے کر بتایا۔ میری ریاضی بعد الرحمن سے قدرے بہتر ہے۔

”دولاکھ پچاس ہزار روپیہ۔ چلو پچاس ہزار روپیہ چھوڑ دو۔ دولاکھ ہیں پھر بھی بچتے ہیں۔ اور کتنی مدت میں۔ صرف ایک سال کی مدت میں۔ اور پھر ہمیں مزید زبرے درآمد کرنے کی بھی ضرورت نہیں۔ ہمارے اپنے زبرے بڑھتے رہیں گے“

”لیکن چچا وہ تم تو تے سال کے اخیر میں سب کے سب بیچ دیئے تھے!“

”نہیں بھئی۔ سارے کہاں یہ بیچے تھے۔ اور پھر جن کو ہم زبرے فروخت کریں گے۔ ان کو اس شرط پر فروخت کریں گے کہ ان میں سے جو زبرے پیدا ہوں گے وہ ہماری ملکیت ہوں گے۔ ہم ان لوگوں سے باقاعدہ معاہدے پر دستخط کریں گے۔“

مجھے ابھی تک اس سکیم کی کامیابی کے بارے میں شکوک تھے۔ میں نے ماہنامہ ”آؤ“ کے اجراء اور دوسری کئی سکیموں کے حسرت ناک انجام کے شعلے سوچا۔ ہم نے ان کو کس غلط طریق، کس خود اعتمادی سے شروع کیا تھا۔ اور آخر ان کا خسر کیا ہوا۔ وہ تو پھر بھی کسی مذہب معقول کیسے ہیں۔ یہ زیروں کی درآمد کی سکیم تو ایک بالکل بے معنی سکیم تھی۔

دیکھو میرے بھتیجے بھتیجا۔ ”چچا نے میرے خیالات بھانپتے ہوئے کہا: ”جب کوئی باہمت شخص نئی اور نئی چیز شروع کرتا ہے تو لوگ اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ لیکن ہمیں بے وقت لوگوں کے جھگڑوں سے بڑھنا چاہیئے۔ جب میں نے مرغیوں کی نذرنگ کا آغاز کیا تو کئی میرے اپنے احباب مجھ پر ہنستے تھے اور کہتے

تھے وہ جدا ہائی شرط دہی کہ ہمیں کے اندر اندر تم ان مرغیوں کو خود کھا جاؤ گے۔“

”اگر چاہا! تم واقعی کھا گئے۔“

”ہم نہیں کیسے پتہ ہے؟“

”تم نے خود ہی ایک دھند بتایا تھا۔“

تبھی بھتیجا راہ اور بات ہو گئی تھی۔ ہم نے آغاز ایک سو مرغیوں سے کیا۔ انہی دنوں بھے در و گروہ کی شکایت ہو گئی ڈاکٹر نے خوراک یہ تجویز کی کہ ہر روز مرغیوں کو پھل کھائیں۔ پھر گھر میں روز چار چار مہانہ آکر رہنے لگے۔ وہ بھے سے اپنے کاروبار کے سلسلے میں مشورے کرنا چاہتے تھے۔ مرغیوں کی فارمنگ شروع کرتے ہی میں احباب میں بے حد مقبول ہو گیا تھا۔ اور وہ اکثر شام کو میرے عزیز خانہ پر آ موجود ہوتے تھے۔ جب مرغیاں ختم ہو گئیں، میری مقبولیت فوراً گھٹ گئی۔ ہاں تو بھی بھتیجا راہ وہ مرغیاں زیادہ تر احباب کھا گئے۔ جو کچھ حقوڑی بہت بچ گئی تھیں انہیں بالاقساط پڑوسیوں کا ایک ٹلا کر کھڑا کر کھا تا رہا۔ — خیر یہ تو دوسرے قصے شروع ہو گئے۔ میں کہہ رہا ہوں کہ زیریں کا معاملہ دوسرا ہے۔ تم بھی اس پر سوچو اور میں بھی اس پر غور و فکر کرتا ہوں۔“

”چچا پہلے ہیں یہ یقین کر لیں چاہئے کھانگوڑے گاڑی والے زیرے جوتے پر آمادہ ہو جائیں گے؟“

”آمادہ کیوں نہ ہوں گے۔ آخر انہیں کونسا نقصان ہے؟ تو میں ذہن نشین کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ پہلے پہل کوئی نئی بات کی جائے تو ہر کوئی ہنتا ہے۔ جب پہلے پہل ہنری فورڈ اپنی ٹیکسٹری کی پہلی موٹر کار میں چڑھ کر باہر نکلا تو میں پتا نہیں کیا کیسے دالوں کے پیٹ میں ہنسی کے بارے بل پڑ پڑ گئے۔ زیرے آجائیں تو ان کو فروخت کرنے سے



پہلے ہم ایک نائنٹی گارڈی رکھیں گے۔ اور اس میں بیٹھ کر شام کو ہوا خوری کے لیے میگو ڈروڈ اور الفنسٹن سٹریٹ میں سے گزرا کریں گے۔ اس طرح لوگ زیروں کو وکٹوریہ کے آگے جتا ہوا دیکھنے کے عادی ہو جائیں گے۔ اور رفتہ رفتہ یہ حدت جڑا کر گھٹنے لگے گی۔ یہ نائنٹی گارڈی بڑی ضروری ہے۔ اب میں تمہیں ایک اور مثال دیتا ہوں۔ شروع شروع میں جب میں کراچی آیا تو لوگ میری ترکی ٹوپی پر تعجب کرتے اور ہنستے تھے۔ اس وقت یہاں بہت کم ترکی ٹوپی پہننے والے لوگ تھے۔ اب تم خود جانتے ہو ترکی ٹوپی کس قدر عام نظر آتی ہے۔ کل ہی کی بات ہے میں الفنسٹن سٹریٹ میں سے گزرا رہا تھا۔ سامنے سے چار اچھے بھلے پڑوتا رخصت ترکی ٹوپیاں پہنے اور ایک قطار میں چلتے میرے پاس سے گزرے۔ انہوں نے مجھے اسلام علیکم کہا حالانکہ وہ مجھ سے واقف نہ تھے اور مجھ سے پیراؤ اٹھنا سیکھنا کا راستہ دریافت کیا۔ تو یہ بات ہوتی ہے جیسی بھنٹیا رہا پہلے زیروں کے خلاف تعصب کو دور کرنا ہے۔ ایک دفعہ وہ تعصب دور ہو گیا تو زمین ہموار ہے۔ اور گھوڑوں کے متعلق! میری اس بات کو پتھر پر لکھ سچو کہ گھوڑوں کا مستحق قطعاً روشن نہیں تار یک ہے؟

تھمادی رائے میں گھوڑوں کا اب کوئی چانس نہیں۔ انہیں میدان چھوڑ دینا چاہیے۔  
”زیروں کے سامنے وہ نہیں بٹھرتے۔ یہ میرا بیان ہے۔“

میرا اب بھی اطمینان جڑا تھا۔ مگر چچا عبدالباقی نے جمہوری اصول کے مطابق ووٹ لے کر دہلی میں اس کے پریزیڈنٹ کی حیثیت سے ووٹ ڈالے تھے۔ اس امر کا فیصلہ کر دیا کہ زیرہ امپورٹ نہیں ضرور قائم کی جائے گی۔ سرمایہ کی فراہمی کا کام میرے ذمے تھا۔ اور باقی کاروبار کی شرائط تقریباً وہی تھیں جو پہلی سکیموں میں ہوتی تھیں۔ چچا عبدالباقی اس ہزنس میں آدھے سے زیادہ کا حصے دار ہونے کا روادار نہ

تھا۔ وہ بلا تنخواہ مینجنگ ڈائریکٹر کی حیثیت سے کام کرنے پر تیار تھا۔ اگر میں چاہوں تو عبدالرحمن کو بھی ایک تیسرے شریک کی حیثیت سے لیا جاسکتا تھا۔ مگر اس کا فیصلہ کلی طور پر میری دلی منشا پر چھوڑ دیا گیا۔

”سرمایہ اب کیسے حاصل کیا جائے؟“ میں نے کہا۔ ”میرے پاس تو صرف چار پٹیلے اٹھ آتے ہیں۔ اور میرا والد اب روپے کے معاملے میں سخت گیر ہو گیا ہے۔ انہیں میری سکیکوں پر بالکل اعتماد نہیں ہے۔“

”ہمارے بھائی بھتیجا راجا چا عبدالہاقی بڑا لکھ کے تو دیکھو تین ہزار روپیہ مشروع میں کافی ہو گا۔ میں نے سنا ہے اس ہارڈیوں کانرج کافی چڑھا ہوا تھا اور انہوں نے ہڈیوں کے کاروبار میں کافی ہاتھ رنگے ہیں۔ آخر تم ان کے اکلوتے بیٹے اور جانشین وارث ہو۔ ان کا روپیہ تمہارے کام بھی آتا چاہیے۔ آخر کار تمہارے مستقبل کا سوال ہے۔ بھئی روپیہ کمانا چاہیے۔ اتنے ٹکرات کے باوجود میں اب بھی جب صبح بستر سے اٹھتا ہوں تو اپنے آپ کو مخاطب کر کے گاتا ہوں۔“ او عبدالہاقی دیکھ ایک اور نیا دن طلوع ہوا ہے۔ کیا تم اسے یونہی بے فائدہ گزر جانے دو گے؟“

”چچا میں بھی صبح اٹھ کر اپنے آپ کو انہی الفاظ سے مخاطب کرتا ہوں۔ لیکن کوئی فرق نہیں پڑتا۔“

”مجھ پر مجبور نہ کرو۔“ چچا عبدالہاقی بولا۔ ”زیرے ہماری مشکلات کو حل کریں گے۔“

## (۲)

جہاں تک سکیم کا تعلق تھا زیر اور آدھینی کی داغ بیل اس شام چچا عبدالہاقی

کے ڈرائنگ روم میں پڑ گئی تھی، مگر سر ہائیک کے نہ ہونے کی وجہ سے اس سکیم کو عمل میں لانے کے سلسلے میں کوئی قدم نہ اٹھایا جاسکا۔ دن گزرتے گئے۔ اور اس عرصے میں جیپا کے مکان سے کھارادر میں ایک لیسٹ میں ایک دوست کے پاس اٹھ آیا جب بھی میں چچا سے ملتا تو ہماری گفتگو کا موضوع زیر ہے ہوتے۔ میں اپنے والد کو روپوں کے لیے لکھنے سے چھپکا تا تھا کہیونکہ میں ان سے اپنی کئی روپیہ کمانے والی سیکیوں کے سلسلے میں اتنی مرتبہ روپیہ لے چکا تھا کہ اب ان کا متاثر ہونا محال نظر آتا تھا۔ اپنے پچھلے خط میں انہوں نے مجھے یقین دلایا تھا کہ مجھے ان سے اب کبھی ایک پائی بھی نہ ملے گی۔ اور یہ کہ جیپا تک روپوں کا سوال تھا میں انہیں بھلا دوں تو پھر ہے۔

آخر مجھے لکھنا پڑا ————— روپیہ حاصل کرنے کی اور کوئی صورت نہ تھی۔

واضح الفاظ میں روپے کا مسئلہ کرنے کی بجائے میں نے ڈیڑھ مہینے کا راستہ اختیار کیا۔ میں نے پہلے تو خط میں انہیں اس سال کے کاروبار میں خوب منافع کمانے پر مبارکباد دی، اور اپنی دلی مسرت کا اظہار کیا۔ اس کے بعد ان پر یہ واضح کیا کہ میں نے یہاں ایک ایپورٹ ایکسپورٹ کا دفتر کھول لیا ہے۔ اور درآمد کا کام باقاعدہ شروع کر دیا ہے۔ میں نے زیروں کا ذکر کرنا مناسب نہ سمجھا۔ میرا خیال تھا بوڑھا آدمی میرے اشارے کو بھانپ جائے گا۔ مگر پہلے تو انہوں نے خط کا جواب ہی نہ دیا۔ دو ہفتے کے بعد ایک خط آیا جس میں لکھا تھا کہ منافع کے متعلق میری اطلاعات بنیاد غلط تھیں۔

اور انہیں امسال کم از کم پچاس ہزار کا خسارہ برداشت کرنا پڑا ہے۔ انہوں نے میرے درآمد کی کہانی کے کھولنے پر خوشی کا اظہار کیا تھا۔ اور پھر یہ نصیحت بھی کی تھی کہ سڑنے کی کمی سے نہ گھبرا نا چاہیئے اور یہ کہ جس وقت انہوں نے ہڈیوں کا دھندا شروع کیا تھا ان کی جیب میں کل ساڑھے پانچ آنے تھے۔ میں نے یہ خط چچا عبدالباقی

کو دکھایا، اور دیر تک ہم بوڑھے آدمی کی خود غرضی اور کوتاہ نظری پر اظہارِ انسوس کرتے رہے۔ اس خط کے دوسرے دن ہی مجھے والد کی طرف سے ایک تار موصول ہوا کہ فوراً آؤ۔ تمہاری شادی کی بات چیت ہو رہی ہے اور تمہارا ہونے والا خسر تمہیں دیکھنے کا خواہاں ہے۔

مجھے جانے میں قدرے تامل تھا۔ مجھے دیکھنے کے بعد پہلے کئی ہونے والے خسر اپنے ادا سے تہدیل کر چکے تھے۔ جب میں نے یہ تار چچا عبدالباقی کو دکھایا تو اس نے مجھے فوراً ہانے کا مشورہ دیا۔ اس نے مجھے کئی ایسے رنگ و ل خسروں کی مثالیں دیں جنہوں نے شادی کے وقت اپنے دامادوں کو تختہ پابا کھنچ کر یا اس سے زیادہ کمے چمک حمایت کئے تھے۔ چچا عبدالباقی کی رائے میں یہ میرے لیے ایک سنہری موقع تھا۔ چچا خود مجھے گاڑی پر چڑھانے کے لیے اسٹیشن تک آیا۔ شاید وہ سمجھتا تھا کہ اگر وہ خود مجھے گاڑی پر سوار کرانے نہ آیا تو میں اپنا ارادہ بدل لوں گا۔ مجھے رخصت کرتے وقت اس نے مجھ سے ساڑھے چار روپے نکلیں کے لئے قرض بیٹے۔ حج کو وہ مجھے سوار کرانے کے لیے آیا تھا اس لیے غالباً وہ دینا سب سمجھتا تھا کہ میں اس کو نکلیں میں واپس پہنچانے کا خرچہ بڑاشت کروں اس واقعہ بھی وہ سب معمول اپنے پیسے اپنے دوسرے کوٹ کی جیب میں بھول آیا۔ تھا۔ وہ مجھ سے میری لکائی کی گھڑی بھی ادھار لینا چاہتا تھا۔ مگر میں نے ادھر ادھر کی باتوں سے اسے اس بات کا موقع نہ دیا۔ جب گاڑی نے دسل دی اور رفتہ رفتہ چلنے لگی تو چچا عبدالباقی کچے دیر طیٹ فارم پر اس کے ساتھ بھاگتا آیا۔ اس کی گول مٹول پڑو قار اور ہنس مکھ ہاتھ لگائی ہوئی شخصیت گاڑی کے پیٹ فارم سے دور تک نکل جانے کے بعد تک مجھے نظر آتی رہی۔ میری آنکھیں بھیگ سکی گئیں۔ ہم طلی بے حد جذباتی واقع ہوئے ہیں۔ میں نے انسوس کیا کہ میں نے اسے اپنی لکائی کی گھڑی کیوں نہ دیدی

جب میں نارنجہ ویسٹرن ریسرے کی گروا درسیا ہی میں مصروف گھر پہنچا تو بوڑھا آدمی برآمدے میں بیٹھا اپنی دائرہ سی کو سمجھانے لگا۔ رہا تھا۔ ایک اور چھوٹا سا بولا شخص جو قد سے ایک میٹر کی ہوئی چڑیا کی طرح تھا۔ سامنے کسی پرانا لک رکھے بیٹھا ایک پلیٹ میں سے چھوڑے کھارہا تھا۔ کسی چیز نے مجھے بتایا کہ یہ وہ ریٹائرڈ اکسٹرا انکسٹر ہے یعنی میرا ہونے والا مسٹر۔ وہ بوڑھے بٹن تک ڈوب گیا۔ ہونے والے خسروں کا ہمیشہ ٹھہر پر ہی اثر ہوتا ہے۔ ہم غلطی قدرے نمود میں۔

”اچھا تو آپ مجھے بتا رہے تھے کہ چمک جھنڈ نماں میں آپ کے پندرہ مرتبے ہیں۔ آپ کے نام ہیں یا آپ کے رشتہ داروں کے نام؟ ریٹائرڈ اکسٹرا انکسٹر میرے والد سے پوچھ رہا تھا۔“

”میرے اپنے نام ہیں“ میرے والد نے جواب دیا۔

”گو براؤن والد میں گویا دو کوٹھیاں ہیں آپ کی۔“

”چار!“ میرے باپ نے کہا۔

”آپ کا بیٹا غالباً اکھوتا ہے۔“

”ہاں!“

”اب آپ کی عمر کتنی ہوگی؟“

”پچتر سال۔“ میرے باپ نے نظریہ کہا۔ ”ابھی تک میرا ایک دانت نہیں ہلا میں

آج کل کے نوجوانوں سے کہیں زیادہ مضبوط ہوں۔“

”زیادہ میٹس کی شکایت تو ضرور ہوگی۔“ اکسٹرا انکسٹر نے پرامید لہجے میں پوچھا۔

”آپ شوگر اسٹ ضرور کرائیں۔“ بعض دفعہ پتا نہیں چلتا۔“

اسنے میں میری موجودگی کا ہنر پلا میرے باپ نے ہمراہ ریٹائرڈ اکسٹرا انکسٹر سے تعارف



## زیر اسکیم

اور اس نے مجھے ریٹائرڈ انجیکٹر کے بلیک بلیس اور جہاد کے منتقل بتایا اس نے شکار کو بڑے سیلے اور طریقے سے چھانسا تھا۔ ریٹائرڈ اکسائن انجیکٹر کی تو اس کے بعد کوئی خبر نہ آئی ہاں میرے وہاں جانے کا یہ قاعدہ ہوا کہ میں چار پارٹی ہزار روپے ادھار لینے میں کامیاب ہو گیا تھوڑے ہزار تو بٹسے آوی سے بعض عجیب طریقوں سے اینٹا گیا۔ کچھ میں نے اپنے چند پرانے دوستوں سے لیا جو اب ٹھنڈا کپاس وغیرہ کے کاروبار میں خوب پیسے کما رہے تھے۔ ہم بھی جب چاہیں کانی میٹھے اور چار منگ لوگ بن سکتے ہیں۔ اور ہمارے خاندان کے افراد ہمیشہ روپیہ ادھار لینے میں اچھے رہے ہیں۔

جب میں روپیہ کر دوا پس پہنچا تو چچا سے زیادہ غرض آوی نہ ہوگا۔ اس نے کہا کہ ہم اب اپنی سکیم کو تیزی سے حقیقت بنا دیں گے۔ پہلے تو ہم نے میگلورڈو کی کئی انگریزی اور دوسری کشتیوں کے چکر کاٹے اور ان کے منجنگ ڈائریکٹروں سے تعلق میں ملاقات کی اور ان سے زیر سے فراہم کرنے کے لیے کہا بہتوں نے سمجھا کہ ہم ان کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ اور فوراً ہمیں دفتر سے رخصت ہونے کی درخواست کی بعض نے ہمیں احمقوں کا ایک بے دخل جوڑا سمجھا۔ ایک کمپنی کا ڈائریکٹر تو چچا کے سکیم کی وضاحت کرنے پر اس قدر بے صبر اور غضبناک ہو گیا کہ اس نے ہم سے پوچھا کہ آخر ہمارا اس طرح اس کا وقت ضائع کرنے سے کیا مطلب ہے۔ اور ہمیں تنبیہ کی کہ اگر ہم اسی وقت وہاں سے نہ چلے گئے تو وہ اپنے چھ کیداروں کو بلوا کر ہمیں باہر پھینکوا دے گا۔

”اب ایک ہی صورت ہے“ چچا عبدالباقی بولا ”ان کمپنیوں کو بڑس کر نامی نہیں آتا بھتیجیہ اب تم کو خود نیروبی مانا پڑے گا۔ وہاں جاتے ہی تم کو پہلے تو ایک شکاری‘ سفری کا انتخاب کرنا ہوگا۔ میں تیس رائٹر میگروڈ کے ایک دو ناول‘ سرش‘ وغیرہ پڑھنے کے لیے دوں گا۔ اس سے تمہیں ایک سفری کے انتخاب کرنے کے موٹے موٹے اصولوں کا پتہ لگ جائے

کا پہلی چیز جو تھیں کرنی ہوگی وہ ہے ایک اچھے قابل اعتبار زرد لوہے کا انتخاب جو فریٹیج جگہوں سے اچھی طرح واقف ہو۔ وہ زرد لوہی سامان اٹھانے والے قلیوں کا انتظام کر دے گا۔ سامان میں تم ایک خیمہ، ایک سوٹ کیس اور کچھ کھانے پکانے کے برتن سے جا سکتے ہو۔ ان ساپنوں کے کاٹے کے علاج کا کہیں ساتھ ضرور رکھنا۔ تم ہر بیسویں قدم پر ساپنوں سے دو چار ہو گے۔

”میں نہیں جاؤں گا“ میں نے جواب دیا۔

آخر بحث کے بعد یہ فیصلہ ہوا کہ میرا جانا ہر حالت میں ناگزیر ہے۔ اور میں نے پاسپورٹ کے لیے درخواست دے دی۔ چچا عبدالباقی اور میں نے ایرلانڈ اور جہازوں کی کمپنیوں کے دفتر میں جا کر معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اور کمپنیوں کے سفری لٹریچر کا مطالعہ ٹرس اہنٹک سے کیا۔ ہم یہ طے نہ کر پاسے کہ نیروبی جانے کے لیے میرے لیے کونسا راستہ اختیار کرنا بہتر رہے گا۔ چند دنوں میں ہر کوئی زبردستی خرید کے مسئلے میں میرے نیروبی جانے کے متعلق جانتا تھا۔ اور اس کا اس قدر چرچا ہوا کہ بہت سے احباب کا خیال تھا کہ میں نیروبی سے واپس آگیا ہوں۔ خود مجھے کسی کہیں گان ہونے لگتا کہ شاید میں نیروبی کا سفر کر آیا ہوں۔ کئی احباب مجھے بازار میں میئر اکریمرے کو اپنی میں ہونے پر تعجب کا اظہار کرتے اور کہتے کہ ان کے خیال میں میں بھی نیروبی وغیرہ میں ہی تھا۔ بے حد سنجیدہ چہروں سے وہ مجھ سے دریافت کرتے کہ میں نیروبی سے کب واپس آیا ہوں اور وہ کیسے لگتے نہ رہے ساتھ لاسکا ہوں۔ ایک ادنیٰ رسالے کے ایڈیٹر نے کافی ہاؤس میں مجھ سے فرمائش کی کہ میں ”نقاہت“ کے خاص نمبر کے لیے نیروبی پر ایک رپورٹ تیار قلمبند کروں جس میں وہاں کے سماجی اور معاشی پس منظر پر روشنی ڈالوں اور ماہنامے کے قارئین کو زبردستی کے پکڑنے کے بارے میں معلومات بہم پہنچاؤں۔



اس چرچے اور غل کے باوجود میں نیرودی نہ جاسکا۔ اول تو پاسپورٹ ہی نہ بن سکا اور پھر نیرودی کی حکومت اپنے ہاتھوں کو بچانے کی اہمیت کے بارے میں تیار ہوگئی تھی۔ اور اپنے ملک میں شکاریوں کے آنے پر قدغن لگا رہی تھی۔ چچا عبدالباقی کی عیال کی دیکھنے کے لائق تھی۔ مگر میں اپنے دل میں کچھ خوش اور مطمئن تھا۔ مجھے سانپوں سے بہت ڈر لگتا ہے۔ اور رائڈر بیگز کے ناول ”شٹی کو پڑھنے کے بعد تو میں کسی حالت میں بھی افریقہ میں جانے کو تیار نہ تھا، اور متحیر تھا کہ لوگ آخر وہاں رہتے کیوں ہیں۔

### ( ۳ )

ایک شام کو میں چچا عبدالباقی سے ملاقات کے لیے گیا تو ایک اور شخص کو اس کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے دیکھا وہ ایک لبا ترنگا خونک شکل کا شخص تھا، اور ان شخصوں میں سے تھا جن کے متعلق اکثر کہا جاتا ہے کہ ان کے چہروں سے ہن پرستا ہے۔ مجھے یہ تو ابھی طرح معلوم نہیں کہ بن کیا ہوتا ہے مگر اس آدمی کے چہرے سے یہ ہن انہوں کے حساب سے بوس رہا تھا اس کی آنکھیں چھوٹی زرد اور تار تار تھیں، ہونٹ موٹے اور کچھ اعتدال تھے اور اس کی مونچھیں لمبی اور اچھی ہوئی تھیں، وہ لبا گولہند خاکی اور کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ وہ غالباً گرچھ کے چڑے کے ادبھی اڑی والے کیلر فل بوٹ چمٹھائے تھا۔ ایک چار بور کی رافٹل اس کے سامنے میز پر پڑی تھی۔ میں اس کو دیکھ کر اسٹے پاؤں جانے لگا تھا کہ چچا عبدالباقی نے مجھے آواز دی ”آؤ بھئی بھتیار! ہمارا کام بن گیا! چار ونا چار میں مکرے میں داخل ہوا۔ چچا ایک دھوٹی اور قمیص میں بڑے صوفے پر آلتی پالتی مار کر بیٹھا تھا اور ایک کل معنک شانت بدھ کی طرح دکھائی دے رہا تھا جسے اس وقت فروان حاصل ہونے لگا

جو اس نے لمبی موٹھوں والے خوناک اجنبی سے مجھے متعارف کرایا۔

”جی۔ اچھا ہوا تم آگے یہ میجر اے۔ آرمیکن ہیں بڑے مشہور بگ گیم ہنٹر ہیں۔ چنا پختاب پھر بگ گیم کے شکار کے لیے نیروبی پر واز کرنے والے ہیں۔ ان کو کہیں سے بتا چلا ہے کہ ہمیں نیروب کی ضرورت ہے۔ اور یہ اسی لیے یہاں مجھے ملنے کے لیے تشریف لائے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ وہ ہمارے لیے وہاں سے پچاس زیرے برماہ کے حساب سے شپ کر سکتے ہیں۔“ ————— مکین صاحب یہ محمد تقیٰ صاحب غلی میرے حصار ہیں۔“

میجر نے مجھے اپنی پٹی آنکھوں سے دیکھا اور دو ٹوک کے طور پر سامنے رکھی اپنی رائفل کو اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

میجر نے اپنی رائفل سے کھیلتے ہوئے مجھے اور چچا عبدالباقی کو مخاطب کیا۔  
 ”ہاں تو مسٹر عبدالباقی بگ گیم ہنٹنگ کے لیے افریقہ کے گھنے زہریلے جنگلات میں کئی کئی ہفتے گھومنا پڑتا ہے اگر آپ حضرات نے ٹارزن کی فلمیں دیکھی ہیں تو آپ قیاس لگا سکتے ہیں کہ یہ کام کتنے جان جوکھوں اور خطرے کا ہے۔ سفری کے انتظام میں کالی خرچ آجاتا ہے چونکہ میں آپ لوگوں کے کام پر نیروبی جا رہا ہوں اس لیے اصولاً تو آپ کو مجھے نیروبی جانے اور وہاں سے واپس کا کرایہ دینا چاہیے۔ اور وہاں ہم وغیرہ کا خرچ بھی آپ کے ذمہ ہونا چاہیے۔ مگر میں آپ حضرات سے نہ کرایہ لوں گا اور نہ وہ خرچ جو نیروب کی ہم کے انتظام پر آئے گا۔“  
 ”یہ آپ کی بڑی عنایت ہے۔ چچا عبدالباقی نے کہا۔“

————— نیروب کا پکڑنا سخت مشکل کام ہے۔ میں آپ حضرات کے لیے اپنی جان کو خطرہ میں ڈال رہا ہوں۔ ————— اچھائی الحال آپ کو کتنے زیرے

درکار ہیں؟

”ڈیڑھ سو چھابا باقی بولہ کیوں نہیں بھٹیاری؟“ الحاح ڈیڑھ سو کافی ہوں گے؟“

”دو قسم کے زیرے ہوتے ہیں؟“ شکاری نے کہا۔ ایک قسم زندا ہڑھیا ہوتی ہے۔ ایک تو سفید زیرے ہوتے ہیں جن پر سیاہ دھاریاں ہوتی ہیں۔ پھر پھورے زیرے ہوتے ہیں جن پر سرخ اور مٹی دھاریاں ہوتی ہیں۔ آپ حضرات کو کون سے زیرے چاہیئے؟“

”مٹے جلتے ہوں؟“ چھابا باقی نے کہا۔ زیادہ تر اگر سفید زیرے ہی سکیں تو اچھا ہے؟“

”ان کے لیے مجھے نیروبی سے سو میل آگے زینہودریا میں کئی دن اور کئی لپٹیں سفر کرنا پڑے گا۔ جیسا کہ آپ نے گنگ سالو منو ماتن؟“ اور مارزن کا بیٹا ظلوں میں دیکھا ہوگا۔ سفید زیرے غوما کٹری میں پائے جاتے ہیں غوما کٹری کے لوگ سخت دشمنی اور موم خورد ہیں، اور سفید زیرے کی پرستش کرتے ہیں۔ اس لیے اس خطرے کے لحاظ سے جو مجھے غوما کٹری میں شکار کیلئے کے لیے مول لینا ہوگا سفید زیروں کی قیمت عام زیروں سے زیادہ ہوگی۔“

”عام زیروں کی قیمت کتنی ہوگی؟“

”عام زیرے آپ کو غالباً چار سو روپے جوڑے کے چڑیں گے۔ اور سفید کوئی آٹھ سو کے۔ آپ حضرات کل دس بجے میرے ہمراہ ہماری کہنی، فریقین ٹریڈنگ کمپنی میں آئیے۔ میرا بڑا بھائی اس کا فیجنگ ڈائریکٹر ہے۔ آپ ڈمز دھیسو میں ملے کر سکتے ہیں۔“

اس کے بعد اس نے ہمیں اپنے افریقی سفروں کے ہنایت دل دہلا دینے والے قصے سنائے۔ باتوں کے دوران میں وہ کئی دفعہ حشر میں آجاتا جسے اور ہمیں جالور تصور کر کے ہم پر رائفل سے شست باندھ دیتا۔

”ہاں تو جیتا بس وہاں بیٹھا تھا جہاں بختیار صاحب آپ بیٹھے ہیں میں نے فرشتہ باندھی۔۔۔۔۔ اور ڈر ڈر۔“

چچا عبدالباقی اور میں اسے نیچے سڑک پر چھوڑنے کے لیے آئے۔ چچا عبدالباقی چاہتا تھا کہ میں میجر کو شہر میں لے جا کر کسی اچھے ریسٹوران میں کھانا وغیرہ کھاؤں اور سینما وغیرہ سپے جاؤں پر چچا نے مجھے ایک طرف لے جا کر کئی ایسے طریقے بتائے جن سے میجر مسکین پر اپنے روپے خرچ کر سکتا تھا۔ میں نے چچا کا ان مفید مشوروں کے لیے شکریہ ادا کیا اور میجر ایک گزرنے والی بس میں دوڑ کر چڑھ گیا۔

”میجر جی اس کام کے لیے ٹھیک آدمی“ چچا عبدالباقی نے کہا۔ ”میں نے قبریں کھانا کر سب کچھ عبدالباقی پر چھوڑ دو۔“

## (۴)

دوسری صبح میجر اسے آر مسکین چچا عبدالباقی کے مکان پر آیا اور میں اپنے ساتھ اپنی کپڑی کے دفتر میں لے گیا۔ دفتر کا رادر میں ایک غیر اہم گی میں تھا۔ اور باہر ایک نئے رنگے ہوسٹے سائن بورڈ پر افریقین برلور ان لیٹڈ لکھا تھا۔ میجر اسے آر مسکین حضور می دیکھ کے لیے ہمیں باہر چھوڑ کر اندر چلا گیا۔ چندرہ منٹ کے بعد وہ باہر آیا اور ہمیں اندر لے گیا۔ ایک بڑے کمرے میں جو ایک دفتر کی بجائے ایک رئٹس ڈرائنگ روم سے زیادہ مشابہ تھا ایک بے حد موٹا آدمی میز پر کہنیاں ٹیکے

بیٹھا تھا۔ اس کو دیکھ کر آدمی کو اکھاڑے اور دنگل کا خیال آتا تھا۔ یہ آدمی ایک رنگین  
 چھپکلیوں والی بوشہرٹ پہنے تھا اور ایک بڑے خوش مذاق دلو کی طرح اپنے سامنے  
 میز پر رکھی ہوئی آکوچوں، سیبوں اور خمیاہائیوں کی کوئی آدھ درجن پلیٹوں کی صفائی  
 کرنے میں مشغول تھا۔ اس کی دونوں گالیں فواکھات سے بھولی ہوئی تھیں۔ اور  
 اس کے جبروں کو کام کرتے ہوئے دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ اس کے پاس ہی ایک  
 چھوٹی میز پر ٹائپ رائٹر کے پیچھے ایک سیاہ چہرہ ہی نما عیسائی ٹائپسٹ لڑکی بیٹھی تھی  
 اور وہ اور اس کا ٹائپ رائٹر اس کمرے میں ایک کاروباری فضا پیدا کرنے کی  
 ہلکی سی کوشش کر رہے تھے۔

خوش مذاق دلو نے کمرے پر کچھ عیدالباقی اور مجھ سے پُر حوش طریقے پر ہاتھ ملایا۔  
 اس کے چہرے پر اس بڑے شہین پہلو ان کا سامر بیان انداز تھا جو اکھاڑے میں چھوٹے  
 اور معمولی پہلو انوں سے ان کی حوصلہ افزائی کے لیے معاف کر رہا ہو۔ اس نے ہمیں بیٹھنے  
 کی دعوت دی اور ہمیں فواکھات میں شرکت کے لیے کہا۔ میز پر اس وقت فواکھات  
 کا صفایا ہو چکا تھا۔

میسر میکین نے میز پر بیٹھے ہوئے اپنے بھائی سے ہمارا تعارف کرایا۔

”بھائی میکین! ان صاحبوں کو زیریوں کی ضرورت ہے۔ یہ ان لکڑیوں کے آگے  
 جوتنا چاہتے ہیں۔ میں نے ان کو بتایا ہے کہ میں خود چند دنوں میں نیروبی جا کر جلد از جلد  
 ان کو زیری سے شپ کرنے کی کوشش کروں گا۔ یہ اب یہاں ہم سے بزنس کی ضرورتیں  
 پر بات چیت کرنے آئے ہیں۔“

میکین نے ہمیں ایک کاروباری خوش طبعی سے دیکھتے ہوئے کہا: ”آپ حضرات  
 مجھے اس ملک میں دو واحد کھارے کاروباری آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ مجھے آپ سے مل

کو بے حد مسرت ہوئی۔ زیروں کو گاڑیوں میں جوتے کا خیال خود بھی آیا تھا۔ مگر میں اور مسکین امپورٹ کے کام میں اس درجہ مصروفیت میں کہ ہم اور کسی ہزنس میں ہاتھ نہیں ڈالنا چاہتے۔ آپ کی سکیم نہایت مہارک ہے۔ زیروں میں دو پیر ہی روپیہ ہے میجر مسکین نے کہتے ہیں ان کو سفید زیر سے لے کر پانچ سو اور سو سے لے کر ڈھائی سو روپے۔ ایف او۔ آر کو اچھی پزنس کوٹ کی ہے :-

تسکین نے یہی پُر جوش طریق سے یقین دلایا۔ حضرات یقین رکھئے آپ اس قیمت پر گویا زیروں کو مفت حاصل کر رہے ہیں۔ ڈھائی سو روپے میں تو آج کل زیر اتنی بڑا گدھا بھی نہیں ملتا۔ ہم نے اگلے روز چودھری سرکس کہنی کے لیے دو سیاہ زیروں کا ڈیڑھ ہزار کا آرڈر رک کیا ہے۔ چھ ٹکڑے آپ حضرات ہم سے پہلی بار ہزنس کر رہے ہیں۔ اور آپ کا آرڈر بھی بڑا ہے۔ اس لئے آپ کو بہت کم قیمت بتائی گئی ہے۔

مختواری سنی اور بات چیت کے بعد حجام عسبہ ابا قی افریقین براوران سے بیس سفید اور سیاہ زیروں کا آرڈر رک کرنے پر تیار ہو گیا۔ یہ آرڈر کوئی بیس ہزار کا تھا۔ اور افریقین براوران کی ہزنس کی شرائط یہ تھیں کہ آرڈر دیت وقت کی رقم کا ایک چوتھائی حصہ پیشگی ادا کر دیا جائے۔ افریقین براوران ہمارے لیے سب کچھ کرنے کو تیار تھے اور آخر میں وہ اس پر رضامند ہو گئے کہ دو ہزار روپیہ پیشگی ادا کر لیں گے۔ ہمارا آرڈر رک کر لیں گے

اور ہم آپ سے ایک اور رعایت کرتے ہیں۔ تسکین نے کہا "ہماری شرائط میں ہر جتنی رقم اس وقت ادا کرنا پڑتی ہے جب چند گاہ سے ہمارے پاس الزامس پہنچ جائے کہ مال لا دیا گیا ہے۔ آپ کو جتنی رقم اس وقت دینا ہوگی جب زیرے یہاں ہمارے گروہم میں پہنچ جائیں گے۔ ایسی شرائط آپ کو کراچی بھر میں کوئی امپورٹر نہیں دے گا۔"

"آپ زیروں کو انشور وغیرہ بھی کرانا چاہتے ہیں" میجر مسکین نے کہا۔



چھانگ لگا گئے۔ اب ان کے پیسے تیرا پ دے گا۔ چھ دھری سرکس کمپنی والے سوز  
ناک میں دم کرتے ہیں، کیا کہا.....“

اُڑتا خرپک کر دیا گیا۔ افریقین ہاروان سے آؤر کی ایک کاپی اور دو ہزار کی رسید  
لے کر ہم باہر آگئے۔ چچا عبدالہائی دونوں مسکین اور تسکین کے لیے تعریف اور تحنیں سے  
پر تھا۔

مبزنس میں فوراً سمجھ جاتے ہیں کہ کس چیز میں آج کل روپیہ ہے۔ اس نے کہا تمہیں  
دیکھا زیروں کے نام ہی سے تسکین چوبک پڑا۔ بختیار! میں تمہیں بتاؤں اس شخص  
تسکین کی کھوپڑی میں واقعی کاروباری دانش ہے۔ یہ دونوں بھائی ہمارے پیسے خدا  
نے رحمت کے فرشتے بنا کر بھروسے ہیں۔“

## (۵)

ہم چمکتے پانچویں روز افریقین ہاروان میں زیروں کے متعلق پتا کرنے جاتے۔  
تسکین کسی دفتر میں ہوتا اور کبھی باہر انگریز کی ٹائٹلسٹ مس میس وہیں ہوتی۔ پہلے بار یہیں  
بتایا گیا کہ میرا سے آر مسکین زیروں میں پہنچ گیا ہے۔ اور سفری کے انتظام کرنے میں  
مشغول ہے۔ دوسری دفعہ جانے پر پکا لگا کہ وہ فوٹو شکاریوں کی ایک پارٹی کے  
سمراہ دریا سے زمیں میں ہرچی کتزی کی طرف روانہ ہو گیا ہے۔ ایک جیسے تک  
وہ وہیں تھا۔ اور چچا عبدالہائی اور میں کچھ فکر مند رہے کہ کیسے اسے آر مسکین کو ہرچی  
رہی کتزی کے مردم خود حبشی بھون کر دکھا گئے ہوں۔ ہمیں اسے آر مسکین کے  
بھونے جانے کی اتنی فکر نہ تھی۔ جنہیں اپنے زیروں کی آخر ایک دن افریقین ہاروان  
میں جانے پر تسکین نے ہمیں اطلاع دی کہ حضور ڈی ویر ہوتی اس نے زیروں سے



## زیر اسکیم

ایک ٹرنک کال موصول کی ہے۔ مسکین دو سو زیروں کے ساتھ دواں پہنچ گیا ہے اور ان کی شینگ کا انتظام کیا جا رہا ہے۔ دو دن بعد میں بتایا گیا کہ زیرے ایس ایس ڈسٹریکٹ اسپتال پہنچے ہیں اور وہ ہفتے کے اندر اندر کراچی ہندو گاہ میں پہنچ جائیں گے۔ چچا عبد الباقی اور میں اس خبر سے دلبرائے ہو گئے اور چچا کی کوشش کے پچھواڑے ایک اسٹے کو زیروں کے قیام کے لئے صاف کر دیا گیا۔

دو ہفتے کے بعد انفریقن برادرز میں ہمارے پر سکین ہنس ہنس کر ملے۔

”آپ کے زیرے آگئے ہیں؟“

”کہاں میں؟ ہم نے بے تابی سے پوچھا۔“

”صبر تو کیجئے“ تسکین بولا۔ ”میرا کیئرنگ ایجنٹ آج صبح ان کو کیر کر کے لے آیا ہے۔ چونگی ان پر پیت پڑ گئی ہے مگر وہ سب نہایت چت حالت میں ہیں۔ اس وقت وہ کیئرنگ ایجنٹ کے گروم میں ہیں ان ایک زیرے میں نے بطور نوہ اپنے گروم میں منگوایا ہے آپ اسے دیکھ سکتے ہیں۔“

زیروں کے آنے کی خبر سن کر ہمارا خوشی کے مارے برا حال تھا۔ تسکین ہمیں کئی کڑوں میں سے لے جاتا ہوا ایک بند کمرے کی طرف لے گیا۔ جس کا دروازہ مقفل تھا۔ ایک کھڑکی میں سے جس میں سلاخیں لگی تھیں ہم نے اندر جھانک کر دیکھا ایک خوبصورت سفید زیرے اندر کھڑا تھا اس کا ہاتھ تھا۔

”تسکین“ چچا عبد الباقی نے کہا ”دور درازہ کھولو۔ میں اس زیرے کو تھپکی دینا چاہتا ہوں۔ اور نزدیک سے اس کا معائنہ کرنا چاہتا ہوں۔“

”گروم کی چابی میرے پاس نہیں“ تسکین بولا ”اور دوسرے زیرے سفر کی وجہ سے کچھ ششکا ہوا ہے۔ خیر باقی زیرے بھی سب اسی طرح خوبصورت اور تندرست ہیں۔“

آپ شام کو آکر یہاں سے ان کی ڈائری سے لے سکتے ہیں۔ پانچ ٹوکوں کا انتظام آپ کو کرنا ہو گا۔

جب جانے لگے تو تسکین نے ہمیں بقیہ رقم کی ادائیگی کے لیے کہا۔ ابھی انیس زیر سے آئے تھے۔ اور ہمیں تین ہزار روپیہ اور افریقین بلڈران کو ادا کرنا تھا۔ بقیہ رقم کے سوال نے اس خوشی کو جو زیروں کے آ جانے سے ہمارے دل وچلے میں سرایت کر گئی تھی قدر سے آباؤ کو دیا تسکین نے مس میسی کو فوراً ہمارا بل ٹاپ کر کے لے لیا۔

”ابھی ہم ایک ہزار روپیہ دے سکتے ہیں“ میں نے کہا۔

”آپ پندرہ زیر سے فی الحال لے جا سکتے ہیں“ تسکین بولا۔ ”بھے آپ پر پورا اعتماد ہے۔ باقی دو ہزار کے لیے میں ہفتہ تک انتظار کرنے کو تیار ہوں“

شام کو ہم پھر افریقین برادمان پر دو ٹرک لے کر پہنچے۔ کافی دیر ہم کوگی میں ٹھہرنا پڑا، اور پھر تسکین باہر آیا۔ اور ہمارے ساتھ ٹرک میں بیٹھ کر ہمیں اپنے بھینگ کھنٹ کے مکان پر لے گیا۔ اب کافی اندھیرا سا ہو چکا تھا۔ بھینگ ایک کھنٹ ایک چھوٹا سا پتھر آوی تھا جسے آنکھیں مامونے کی بڑی عادت تھی۔ وہ ہمیں اپنے مکان کے کھچر اٹھے ایک اماٹے کی طرف لے گیا اسی اماٹے میں چائیں گلیں کے لگ بھگ زیر سے ہوں گے۔ بہت سے ابھی موم جاموں میں طعوت تھے چچا عیدالباقی اور بھے یہ دیکھ کر کچھ بالواس ہوئی کہ زیر سے کچر قدم چھوٹے معلوم ہوتے تھے۔ تسکین نے یہیں سمجھا یا کہ یہ بڑی جلدی بڑے ہوجائیں گے۔ اور یہ کہ ان کو سدھانا اور گاڑی کے لیے

تیار کرنا نسبتاً آسان ہو گا۔

زیروں کوڑوں میں لادنا کافی مصیبت ثابت ہوا۔ ایک دوسرے بچہ پر دوتلیاں بھی چلا میں۔ آخر ڈرائیو روں اور مزدوروں کی مدد سے ہم ان کوڑوں میں لادنے میں کامیاب ہو گئے۔ تسکین براغوش معلوم ہوتا تھا اور اس کی ہنسی چھوٹی پڑتی تھی۔ چھوٹا بیکرینگ ایجنٹ تسکین کو بار بار آنکھ مار رہا تھا۔

ہم زیروں کو چھاپہ الباقی کے مکان پر لے آئے۔ یہاں ان کوڑوں سے اتارا گیا اور اس احاطے میں چھوڑ دیا گیا جو خاص ان کے لیے صاف کر دیا گیا تھا۔ اور جس کے گرد ایک چھوٹی چار دیواری تیسری گئی تھی۔ چھاپہ الباقی کے کئی سہائے اپنی کوششوں کی دیواری پر سے یہیں اور ہمارے زیروں کو دلچسپی اور دلی ہوئی مسکراہٹ سے دیکھ رہے تھے۔ اور چند چھاپہ الباقی کو زیروں کی آمد پر مبارکباد دینے کے لیے آئے تھے۔

تسکین ہمارے ساتھ چھاپے کے مکان پر آیا تھا۔ اور یہیں زیروں کی پرورش کے متعلق مختلف ہدایات دے رہا تھا۔ ان کو پہلے چند دن صحت دودھ اور تازہ کیلے دیئے جائیں۔ ان کو گرم پانی اور صابن سے ہرگز ہرگز نہ نہنایا جائے۔ بلکہ برش سے رگڑ کر صاف کیا جائے وغیرہ وغیرہ مگر ہم اس قدر مضطرب اور غوش تھے کہ اس کی باتوں پر ڈراما توجہ دے رہے تھے۔ جب تسکین نے ہم سے تیس زیروں کی وصولی کی رسید لے لی اور ایک ہزار روپیہ اپنی جیب میں ڈال لیا تو وہ سبھی بھانکا ہوا چلا گیا۔

اب کوئی دس بجے کا عمل ہو گا۔ زمرے بڑے خاموش تھے، سفر نے انہیں مضمحل کر دیا تھا۔ چھاپہ الباقی میں اور عہد الرحمن احاطے کی چار دیواری کے باہر سے ان کی سیاہ کھالوں کو دیکھ رہے تھے۔

”بے چارے بڑے بھوکے ہوں گے چچا عبدالباقی نے کہا۔ بختیار: بازار جاؤ اور ان کے لیے کھانے اور دودھ لے آؤ۔ تسکین نے کہا ہے کہ پہلے چند توڑ تھک ان کو کھلیں اور دودھ کے علاوہ کچھ نہ دیا جائے۔“

”میرا خیال ہے کہ تین من دودھ اور بیس درجن کھانے کافی ہوں گے۔“ میں نے پوچھا۔

”اے! آج رات کے لیے تو کچھ کرو، چچا عبدالباقی نے کہا۔“ ویکس بھوک کے مارے ان میں زندگی نظر نہیں آتی۔ کل سے ہیں باقاعدہ کسی ڈائری اور کسی میوہ منڈی والے سے انتظام کرنا پڑے گا۔“

اتنے میں زیروں میں سے ایک نے آواز نکالی یہ آواز کچھ گدھے کے ہنہانے سے ملتی جلتی تھی۔

”یہ تو گدھے کی سی آواز لگتی ہے۔“ میں نے کہا۔

”یہ غالباً احاطے سے باہر کسی گدھے کی ہے۔“ چچا عبدالباقی نے کہا۔ ویسے زیرے کی آواز بھی گدھے جیسی ہوتی ہے۔“

میں چچا کے گھر سے کچھ شے اور خالی ڈرم لے دیکر آیا میں رکھ کر بازار گیا اور دو تین گھنٹے کے بعد کئی دکانوں پر پھرنے کے بعد دودھ اور کھانے خرید کر لایا۔

زیروں کو دودھ پلانے کے بعد ہم سو گئے۔ صبح جب میں نے کھڑکی میں سے باہر دیکھا تو زیرے احاطے میں تھے۔ ان کی دھاریوں میں مجھے کچھ عجیب بات معلوم ہوئی۔ دوسرے یہ زیرے بہت چھوٹے اور بے ہودہ نظر آئے والے جو ان معلوم

ہوتے تھے تسکین نے ہمارے سینے اچھے اور بڑھیا نسل کے زیرے در آمد نہ کیے تھے۔

چچا عبدالباقی اس وقت اپنے سوٹ میں عبوس کمرے میں آیا۔  
 ”بھئی بھتیجا۔ تم ابھی تک بستر میں سہم اٹھو بھئی زیبروں کے ناشتہ کا انتظام  
 کرنا ہے اور ان کو نہلا کر پونچھنا ہے، بے چارے بے حد میلے کچیلے دکھائی دے  
 رہے ہیں۔“

عبدالرحمن نزدیک ہی بیٹھا تھا۔ اس نے کہا۔ ”میں زیبروں کو نہلاتا ہوں“ اور  
 وہ ایک گرم پانی کی باٹلی اور کپڑا لے کر بیٹھے ان کو نہلانے چلا گیا۔ چچا عبدالباقی میرے  
 پاس بیٹھ کر مجھے حساب کر کے بتانے لگا کہ اب زیبروں کے آجانے کے بعد ان کو  
 پالنے پر سنے سدھانے وغیرہ کے لیے کتنا سرمایہ درکار ہو گا۔ میں اسے صاف  
 صاف کہنے والا تھا۔ کہ میرے پاس اب ایک سچوٹی کوڑی بھی نہیں کہ عبدالرحمن  
 نے بچے زیبروں کے پاس سے آڈانوی۔

”ابا جی، یہ ان زیبروں کی دھاریوں کا رنگ تو کچا ہے۔  
 ”کچا کیا مطلب“ چچا عبدالباقی نے کھڑکی میں سے جھکتے ہوئے پوچھا۔  
 ”دھونے سے تر آتا ہے اس زیبرے کو دیکھو میں نے اسے نہلایا ہے  
 اور اس کی دھاریاں مٹ گئی ہیں۔“

”سو میں چلایا میرے خدا چچا عبدالباقی یہ تو گدھے ہیں۔“  
 اسی وقت ڈھینچوں ڈھینچوں کی متحدہ آواز بچے سے اٹھی۔ اس دفعہ فقط  
 ہنس کا کوئی احتمال نہیں تھا۔

ہم اسی وقت بھاگے بھاگے افریقین ہلو ران کے دفتر میں پہنچے اور واڑہ  
 کھٹکٹانے پر تسکین سے دو واڑہ کھولا۔ وہ اپنی بنیان پہنچے تھا اور اس کے ایک  
 ہاتھ میں مگدھ تھا۔

”آئیے آئیے“ اس نے پُر حش خوش طبعی سے کہا : ”میں صبح ڈنٹر پہننے کا مادی ہوں“

”تم نے ہم سے دھوکا کیا ہے“ چچا عبدالباقی نے ہڑکار دوڑوں بازوؤں کو ہوا میں لہراتے ہوئے کہا : ”وہ زیرے نہیں وہ سب گدھے نکلتے“

”کیا مطلب ہے؟“ تسکین نے کہا کل شام تم مجھ سے دیکھ بھال کے بعد زیرے لے گئے۔ وہ رسید جو تم نے مجھے دی ہے اس میں تم نے صاف لکھا ہے کہ ہم نے تیس زیرے وصول پاسے۔ اب اگر کوئی راتوں رات زیرے وصول کے بھاتا ہے اور ان کی بجائے گدھے چھوڑ جاتا ہے تو ہم اس کے لمبا در نہیں ہیں۔۔۔۔۔۔ لیکن تم کو یہ کیسے یقین ہے کہ وہ زیرے نہیں؟

”زیرے نہیں زیرے نہیں کیا زیروں کی آواز ایسی ہوتی ہے؟“ چچا عبدالباقی نے گدھے کے مہنٹانے کی ایک خیر کل سی نقل کی : ”اور گرم پانی سے دھونے سے

ان کی دھاریاں سب دھل گئی ہیں۔ تم نے یہ دھاریاں گدھوں پر رٹتی تھیں“

”آپ صاحبان ڈرا ٹھنڈے تو ہو جائے“ تسکین نے کہا آپ نے ان کو گرم پانی سے دھویا۔ کیا آپ کو معلوم نہیں زیروں کے لیے گرم پانی بیلک ہے۔

آپ کو انہیں شیل ۱۰۰ سے دھو کر آٹلی کلافتہ سے صاف کرنا چاہئے تھا؟

”میں تم پر مقدمہ چلاؤں گا۔ تم نے ہمارے ساتھ دھوکا کیا ہے“

”تہااری رسید میرے پاس ہے جس پر تم نے خود لکھا ہے کہ ہم نے تیس زیرے وصول پاسے۔“

”تم چار سو بیس ہو۔ میں تہااری موہ نہیں لیجھنے روں گا۔“

”کیا؟ نکل جاؤ، نکل جاؤ؟“ تسکین نے گدھ کو دھکانے کے انداز میں اٹھائے ہوئے

حلی کے بغیر تک ہمارا بیچا گیا۔

ہم نے غصے سے کھولتے ہوئے اور ٹانپتے ہوئے بند روڈ پر آکر دم دیا۔  
چچا عبدالمجیب سخت غصے کی حالت میں تھا۔ اس نے کہا کہ وہ اس دھوکے باز  
شخص پر مقدمہ چلائے گا اور اس سے ایک ایک پائی وصول کر کے رہے گا۔  
اور دو تین دن تک میں نے اسے بڑی بڑی قانون کی کتابوں میں مشغول پایا۔ اس  
دفتر کے متعلق وہ کوئی فیصلہ نہ کر پایا جس کے تحت افریقین برادری پر مقدمہ  
داخ کیا جاسکتا تھا۔ اور آخر مقدمہ بازی کا ارادہ چھوڑ دیا گیا۔ ہماری قانونی پوزیشن  
واضح نہ تھی۔

اس کے چند دن بعد جب میں افریقین برادری کی کمیٹی کے پاس سے گزرا  
تو نیا رنگا ہوا بورڈ عائب تھا۔ دو لمبے چوڑے شخص جن کی پرٹھیں مسکڑی  
ہوئی تھیں، ہاتھوں میں کتابیں اٹھائے دروازے میں کھڑے تھے تھیں تھیں  
طریق سے دیکھ رہے تھے۔ وہ طالب علم تھے، اور ان کے چہرے بے حد آشنا  
لگے۔ جب میں ان کے پاس سے گزرا تو میں نے ایک لفظ "نیرے" سنا  
اور آگے جا کر مجھے جہاں آیا کہ وہ مسکین اور تکیہ تھے۔ — مونچھوں کے

بغیر۔ یہ تھی نیرا سکیم !

ایک عقیدت مندانہ پیر و ڈوی

## پہچاسم کے نام آخری خط

دجے اُس کے بیتیہ سعادت جن منٹوں نے اپنے مرنے کے چند روز بعد جنت سے دستی  
مکتوب الیہ کو بھجوا دیا۔

پہچاسم — سلام علیکم

آپ کو یہ سن کر بے حد صدمہ پہنے گا کہ پچھلے دنوں میرا انتقال ہو گیا۔ پہچاسم جان وہ  
مرنے کی دھمکی جو میں آپ کو اپنے ہر خط میں دیا کرتا تھا آخر کار نکھ ہو گئی۔ آپ مائیں یا  
نہ مائیں میری موت میں آپ کی بے توجہی اور بے اعتنائی کا بھی کافی ثبوت ہے۔ میری  
بار بار کی فرمائشوں اور منتوں کے باوجود آپ نے نہ اپنے اس سے جان ہیگ کی دہلی  
بھجوائی۔ اور نہ ڈالی و ڈکی کسی فتنہ سامان کی طین ڈال دیا گئیں۔ غالباً اپنے پچھلے خط ہی میں  
میں نے ان ٹانگوں کو قریب سے دیکھنے کی متنا خواہش کی تھی۔ کیسے بے مہر نکلے آپ پہچاسم۔  
میری بات سنئی ان سن کر کے ہنسی گئے۔ اور میری سعادت مندی کا حال دیکھتے کہ  
آپ کی تفریہیں کرتے کرتے زبان تالو سے چپک گئی۔ اب آپ کے سب سے پیارے  
بھتیجے کا انتقال ہو گیا ہے۔ اور جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا ہے اس میں قصود سراسر آپ  
ہی کا ہے۔ آپ تو خدا جانے انتقال کا مطلب بھی سمجھتے ہوں گے یا نہیں۔ کیوں کہ  
آپ شہرے غرض قسمتی سے لافان۔ آپ کا بھی انتقال نہ ہو گا۔ پہچاسم جان۔ واللہ باللہ  
آپ بھول کر بھی انتقال نہ کیجئے گا۔ جنت کے بارے میں جو باتیں سن رکھی تھیں  
یہاں آکر سب جھوٹ نکلیں۔ یہاں نہ تو آپ کے ملک کی سات آزاروں کے



مرنے میں اوروں ہی ڈلی دڑ ہے۔ کوئی ایسا ملک بھی تو نہیں جسے آپ ذہنی اداوار سے نواز سکیں یا جسے آپ اپنے ہائیڈروجن بم سے نیست و نابود کر سکیں۔ آپ کی جان ہیگ تو یہاں بلیک مارکیٹ میں بھی نہیں ملتی۔ شام کے وقت مراجموں میں ہم جنت کے مکینوں کو خراب طہورہ ضرور تقسیم ہوتی ہے۔ لیکن کم بخت میں نہ تو سرور ہوتا ہے نہ نشہ آپ کی جان ہیگ کا ذکر ہی کیا۔ ارس میں پاکستانی خطرے کی غامیت بھی تو نہیں۔ اس طہورہ سے تو آپ کے اُس کا کو کا کو کا ہے ایک دفعہ لاہور میں پینے کا اتفاق ہوا تھا، بدرجہا اچھا ہوتا ہے۔

اُس تو چچا جان ! میں اپنے انتقال پر ملال کا ساخڑ آپ کے گوش گزار کرنا تھا۔ اخباروں میں تو آپ نے اس خبر کو پڑھا ہوگا۔ مشرق کے ایک مفلوک الحال ادیب کی اوقات ہی کیا تھی۔ کہ آپ کے اخبارات اور میگزین اسے چھاپنے کی زحمت اٹھاتے۔ انہیں تو ملین ڈالر ٹانگوں والی لڑکیوں کے برہنہ فوٹو شائع کرنے سے ہی فرست نہیں ہوتی۔ اس طرف ان کی توجہ ہوتی تو کیوں کر ! ہمارے ملک کے اخباروں نے البتہ اس خبر کو سیاہ حاشیے چٹھا کر ضرور شائع کیا۔ یہ ان کی ذرہ نوازی ہے۔ ورنہ آپ کا یہ نالائق بھتیجا اس لائق بھلا کہاں تھا، کہ اس کے مرے کاوش لیا جاتا۔ ہو سکے تو میری طرف سے ان اخباروں کے سرخیل مرنج مدیران کا شکوہ ادا کر دیں۔ گستاخی صاف۔ آپ کی مارلین منرو آج کل کیا کر رہی ہیں ؟ چچا جان ان کو صرف ایک ہفتے کے لیے ان مدیروں کی دل جوئی کے لیے پاکستان بھیج دیں۔ ہو سکے تو ان مدیروں کے منہ ڈالروں سے بھر دیں ہر حال ان کو اس کرم فرمائی کا صلہ ملنا ضرور چاہیے۔

چچا جان ! آپ کو شاید اس بات کا پتہ نہ ہوگا کہ آپ کے اس نالائق اور

ناہایت اندیشہ بھرتی کی ایک بیوی اور تین پیاری بچیاں بھی تھیں۔ آپ کہیں گے کہ بہتر ہو تاکہ وہ سب بھی میرے ساتھ انتقال کر جائیں۔ ارادہ تو میرا بھی کچھ اسی قسم کا تھا کہ انہیں اپنے ہمراہ لے کر مدھارتا لیکن ملک الموت صاحب نے اتنی جہلت ہی نہ دی۔ اور آٹا خاناً جان قبض کر لی۔

چچا جان! آپ بڑے رحم دل اور بامروت مشہور ہیں۔ اس لیے یہ کہنے کی جرات ہوتی ہے کہ ممکن ہو تو میرے بیوی اور بچوں کا کچھ وظیفہ مقرر کریں۔ آپ کے ایک ڈالر کی قیمت ہمارے پاکستانی ساڑھے چار روپے ہوتی ہے (مجھے اچھی طرح یاد نہیں) پچاس ڈالر ماہوار انہیں زندہ رکھنے کے لیے کافی ہوں گے۔ چچا جان خدا کی قسم میں مذاق نہیں کر رہا۔ صرف پچاس ڈالر ہمارے غریب ملک میں پچاس ڈالر بہت ہوتے ہیں۔ اور ایک اچھا خاصہ کنہہ اس رقم میں ہی مل سکتا ہے۔ لیکن میں جانتا ہوں آپ اصولاً ایسا نہیں کریں گے۔ آپ کو میرے جیسے جہلک منگلوں سے سخت چڑ ہے اور پھر ان دنوں سات آزاد یوں کو روسیوں سے بچانے اور ٹائیڈ و جن بم تیار کرنے کے تردد میں لگے ہیں۔ ایک ناچار مرے ہونے فن کار کی بچیاں جنیں یا مری، آپ کی بلا سے آپ کے دو بڑے بڑے ساتھی ہیں! اچھا چلنے چھوڑیے اس قصبے کو وہ صوبہ جہاں اس خانہ خراب کا مسکن تھا۔ طاہر کے وزیرِ اعظم فیروز خان دن ہیں (میرے انتقال کے وقت تو یہی صاحب اس گدی پر بٹھائے تھے) ان کے نام ایک مفاد شکنی چٹھی لکھ دیں۔ اثر شاید اس کا بھی کچھ نہ ہو۔ کیوں کہ دن صاحب ان دنوں ایک یونٹ کے پیر ہیں ہوں گے۔ خیر آپ کو اس سے کیا۔ آپ چٹھی ضرور انہیں لکھ دیں۔ بہر حال میری واحد امید اب آپ کی ذات ڈالر صفات ہے۔ چچا جان! سب تو یہ سن گسترانہ بات۔ لیکن کچھ بنا رہا بھی نہیں سکتا مرنے دم

تک آپ سے جان بیگ کی دہسکی بھرائے کے جتنے درخواست کرتا رہا اور آپ اسے گول کرتے رہے۔ خدا جانے آپ کیا سمجھے۔ میں تو ہر دم ہر محفل میں آپ کی تعریفیں کے پل باندھا کرتا تھا۔ آپ مائیں یا نہ مائیں میرے ہی قلم کا صدقہ تھا کہ میرے ملک میں لوگ آپ کی سوج بوجہ اور شفقت کے قائل ہو جاتے اور آپ کے اتنے سارے بھتیجے پیدا ہو جاتے۔ میرے غریب ملک میں، مکی مانٹے، خدا اور اس کے رسول کے بعد جس قدر عقیدت مندی سے آپ کا نام لیا جاتا ہے، کسی اور کا نہیں لیا جاتا۔ ہمارے ہی مسجدوں میں فقیہ اور علماء۔ اخباروں کے ایڈیٹر اور مسلم لیگ کے لیڈر اب بھی اکثر خدا اور اس کے رسول کے نام کو زبان پر لاتے دہتے ہیں۔ ان کے دلوں میں جہانمک کر دیکھنے تو ڈار کھٹکتے سنائی دیں گے۔ یہ سب آپ کے اس مرحوم بھتیجے کی پیہم کوششوں کا نتیجہ ہے۔ میں نے تو آپ کے نام کو چپکائے کے لیے یہ کچھ کیا اور آپ سے اس وفاداری کے عوض میں اتنا ہی نہ ہو سکا کہ وہاں سے کوئی سکینڈ ہینڈ پیکارڈ ہی بھجوا دیتے۔ طین ہمارے مانگیں نہیں تو ان کے پرٹھ ہی عنایت کر دیتے۔ واہ بھئی، چچا جان واہ۔

خیر ان باتوں کو چھوڑیے۔ یہ تو اس پر نصیب ملک کی باتیں ہیں جسے میں چھوڑ چکا ہوں جس جگہ میں اب ہوں۔ یہاں انسان کو کسی چیز کی خواہش نہیں ستاتی۔ نہ جان بیگ کی دہسکی کی نہ پیکارڈ کی اور نہ مارین منرو کے جو خٹوں کے پرٹھ کی یہاں بالکل بھوکا عالم ہے۔ چچا جان آپ یہ سن کر حیران اور خوش ہوں گے کہ یہاں میں نے آپ کی طرح واڈھی رکھ لی ہے۔ ہر صبح لب تر شواتا ہوں آغٹوں پہر باد منور ہتا ہوں۔ کوئی ناسد خیال میرے ذہن میں نہیں آتا۔ سالوں کہ اپنے ملک میں فٹش نگار مشہور تھا۔ وہاں میں ہمیشہ فن کی تخلیق کی فکر میں مبتلا رہتا رہتا تھا، یہاں اگر ایک انسان نہیں لکھا۔ واصل چچا جان اگر آپ جیسے سیانے آدمی سے کچھ کہنا لقمان کو حکمت سکھانا ہے،

یہ آرٹ وارث سب بچوں کے چچا کے ہونے پر غور و خوض میں سرور اصل پیر ہے۔ اور اس کے ساتھ اگر جیب میں ڈالیں ہوں تو اللہ کیا ہی کہنے۔ کاش وہاں انسانے کہ لکھ کر اپنی زندگی اور صحت برباد کرنے کے پھانسی کھانڈیا کسی اور جس کی بڑی کرتا اور سٹے سے کھانے ہوئے روپے کے ہل بستے پر دستور سارا سبیل کارکن منتجب ہو جاتا۔ اور تین چار جگہ کر لیا تو دنیا اور آخرت سدھر جاتی۔

چچا جان! آپ سمجھتے ہوں گے کہ میں اس نئی دنیا میں بڑا خوش و خرم ہوں گا۔ ہرگز نہیں۔ آپ کی دنیا کو ٹیڈر و جن بم سے اڑانے کی ضرورت ہے یا نہیں یہ تو آپ بہتر جانتے ہوں گے۔ ہاں اگر میں آپ سے ٹیڈر و جن بم کا نسخہ لے کر آیا ہوتا تو اس دنیا کو ضرور اڑا دیتا۔ دنیا میں تلخی و ترشی جو میرے نصیب میں تھی وہ اس میں دارم اور نورانیست سے کہیں زیادہ بہتر تھی جو مجھے یہاں حاصل ہے۔

چچا جان! کیا آپ اپنا کوئی بہادر غیارہ اور صبر نہیں بھیج سکتے۔ یا ابھی ٹھہر جائیے۔ کو باٹ بم کو ایسا دھڑلے دینے۔ آپ نے اس بم کو بنائے ہیں اتنی دیر کیسے کر دی۔  
 — مشربان فرسٹر لڑکا کیا حال ہے۔ آپ کے بعد وہ مجھے سب سے پیارے لگتے ہیں۔

چچا جان۔ ابی کل کا ذکر ہے۔ کہ حرمین قسیم کے پاس ہیں تھی کرتے ہوئے میرزا سے ڈیپٹر ہو گئی۔ یہ وہ مرزا غلام احمد قادیانی نہیں ہیں جنہوں نے کسی زمانہ میں دہلی کی جوت کیا تھا۔ (اور جن کا یہاں بیاد جتو کے بعد بھی سراغ نہ پا سکا) یہ مرزا اور ہیں۔  
 مرزا اسد اللہ خان غائب۔ ان کا نام بھلا آپ نے کاش کو سنا ہو گا۔ ان کے باپ کا نام اس وقت ذہن سے اتر گیا ہے۔ اتنا معلوم ہے کہ سو پشت سے پٹنہ آیا پہلوی تھا۔ یہ صاحب ہمارے بد نصیب اور وہ زبان کے بہت بڑے شاعر جو گز رہے ہیں۔

آدی مزے کے نلکے۔ ذرا بے تکلف ہو گئے۔ کہنے لگے ”اماں سعادت ! یہ کیسی جنت ہے۔ دنیا میں تو اس کی بڑی تعریفیں سنتے تھے۔ یہاں نہ تو ڈر ڈور تک کوئی انسان نظر پڑتا ہے نہ کسی کو شعر کہنے سننے کا ذوق ہے۔ ہاں بس کسی سے کہلو کہ ایک بڑا سا ساج کا انتظام تو کرادو۔۔۔ اولڈ ٹام یا کسی اور کا۔ بہتر ادا اس صاحب کے نام تک لکھ دیتا ہوں۔ شراب طورہ پی پی کر ذہن دو مانع کند ہو چکا ہے۔ اور ہاں بس بھلائی جو دوسری تو کہیں نظر نہیں پڑی ؟

بچا جان ! مجھے ان مرزا غائب کی خاطر بہت عزیز ہے۔ اس لیے میرے لیے نہ بھی۔ ان کے لیے ہی ایک کس بڑا حیا دہلی کا بھڑاویں۔ شپین ہو تو بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ ہم دونوں کے جگر خراب ہیں۔ ضرور توجہ فرمائیں۔ آپ کا سا ٹنگا اور مہربان اور کہاں ہے ذرا نہیں !

ہاں بچا جان ! میرے انتقال سے کچھ دن پہلے آپ کوئی سیڑ یا میڈو وغیرہ بنا رہے تھے۔ امید واثق ہے کہ آپ کو اس مقصد میں کامیابی ہو چکی ہو گی۔ بڑا چاہے میں بھی آپ کی جنت خواں ہے۔ ناممکن ہے کہ آپ کسی کام میں ناتھ ڈالیں۔ اور وہ سر انجام نہ پا جائے۔ میری طرف سے ڈلڑ صاحب کی خدمت میں عرض کر دیوں کہ اس جنت کے خلع کو بھی اپنے سیڑ یا میڈو میں غائل کریں۔ یہاں کے کارپردازوں کو شیشے میں اتارنا مجھ پر چھوڑ دیئے۔ بات یہ ہے کہ حدیں قریہاں ہم سب کے پاس بہت سی ہیں۔ لیکن ان میں وہ بات نہیں جو آپ کے ہاں کی ہالی وڈ کی ایکٹریوں میں۔ یہ عذریں بہت زیادہ پاک و صاف اور نرانی ہیں۔ پھر اس جنت میں خدا بھلا کرے آپ کا، نہ اخبار ہے نہ میگزین اور نہ ریڈیو۔ اور تو اور ظلم و دات تک ناپید ہے۔ یہ تکم و دات جس سے آپ کو یہ خط تحریر کر رہا ہوں بعد حید اپنے کرام الکاتبین سے مانگ کر لایا ہوں۔

وہ ان دنوں بے کار ہیں۔ اور میرے دنیاوی اعمال کے مستویسے یہ روزِ حساب کے منظور۔ آپ کے بھتیجے کو جنت میں اینٹرم (INTERIM) دیکھ کے یہ دیکھا گیا ہے۔ بعد میں قیاس غالب ہے کہ اسے یہاں سے منتقل کر کے کہیں اور بھیج دیا جائے گا۔

میری موت کا حال سنئے۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ جب میرا انتقال ہوا تو میری گھر والی کو بچے باعزت طریقہ سے کفنائے دفنائے کی کتنی فکر ہوئی تھی، مگر میں پھر بھی کوڑی تک نہ تھی۔ وہ تو خدا بھلا کرے چند ناشر حضرات کا کہ جنہوں نے اس آشفٹ حال کی گتائیں چھاپی تھیں انہوں نے کہاں دریا دلی سے قتال اور قبر وغیرہ کا خرچہ اپنی گرہ سے دے دیا۔ پھر بھی اتنے بڑے افسانہ نگار کا جنازہ جس بلیکس اور کس مپرسی کے عالم میں نکلا وہ ہرگز قابلِ دیدنی ققائے شنیذنی۔ چچا جان! کاش میں آپ کے ٹک کا ولی مودیتی ہی ہوتا۔

چچا جان! آپ آگتا تو نہیں گئے۔ واصل آپ سے باتیں کرنے میں مجھے بڑا ملطف آتا ہے۔ یہ میرا آپ کے نام آخری خط ہے۔ جنت سے خط لکنا اور اسے بھیجا بظرب وادار ہے۔ حکم ووات کا حال عرض ہی کر چکا ہوں ڈاک کا بھی خاطر خواہ انتظام نہیں۔ بلکہ سرے سے سچے ہی نہیں۔ آپ کی سات آزادیوں کے حک کی کوئی راحت بھی یہاں میسر نہیں۔ اس خط کو آپ کے دست مبارک تک پہنچانے کے لیے بڑی منتوں سے ایک صاحب کو بھلا بھلا کرتا رہا ہے۔ ان صاحب کا نام حضرت عزرائیل ہے۔ کافی مشہور بزرگ ہیں۔ بہت ملکن ہے آپ نے ان کا نام سن دیکھا ہو۔ ٹائیں۔ چچا جان یہ کیا۔ آپ عزرائیل کے نام پر پیسے کیوں پڑ گئے۔ یہ ہاتھوں کا ریشہ چر معنی۔ آپ کو ان سے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔ بخیر ام۔ آپ تو کافی ہیں اور پھر اہم تو آپ کو سات آزادیوں کو بڑھا کر ساٹھ آزادیاں بنا نا ہے۔ میٹر۔ میٹر۔ میٹر وغیرہ کی تکلیل کرنی ہے۔ کو باٹ بب ایجاد کرنا ہے۔ خدا نہ کرے۔ اہم آپ کیسے مر سکتے ہیں؟

چچا جان! ایک اور مزے کی بات سنئے۔ ہندوستان میں ایک بزرگ مولانا عبدالماجد دریا بادی ہیں پچھلے دنوں سنا ہے وہ ہمارے محترم گورنر جنرل غلام محمد صاحب سے کسی سلسلے میں نے پاکستان میں تشریف لائے تھے۔ مصدق رسالہ نکالتے ہیں۔ آپ بڑے پایہ کے ادیب اور مانتے ہوئے عالم ہیں۔ اور متعدد قاضی خانہ اور عالمانہ مقالوں اور کتابوں کے مصنف ہیں۔ ان کتابوں کو وہی حضرات پڑھ سکتے ہیں جن کے دل میں خود اور آنکھوں میں سرور دیا اس کے برعکس، جو ماورجن کی آنکھوں پر نقشب اور مذہبی دیوانی کی پٹی بندھی ہو۔ مولانا دیوبادی اس فلم اور سوگ پر جو میرے مرنے پر ہوا بے اختیار تھکاؤٹھے اور اپنے رسالہ مصدق میں انہوں نے اس پر سخت تعجب کا اظہار کیا کہ ایک معمولی خوش نگاہ کی موت کا اس قدر کیوں ماتم کیا جا رہا ہے۔

دیکھا چچا جان! ہمارے ملک میں کیسے کیسے روشن و مانع اور ادیب دوست حضرات ہتے ہیں۔ کیا آپ کے ملک میں بھی اور نصیب ہمیشہ گورے کا لڈول۔ تقاس و دف اور ہر اس فن کار کو جو سچائی اور میاکی سے جھوٹ کے پردے چاک کرتا ہے۔ اور دنیا کو آگے لے جاتا ہے۔ اسی طرح خوش نگاہ کہا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں تو چچا جان سرے سے باوا آدم ہی نہ لگا ہے۔ سچ مانیتے اگر نفاق بھٹیجے کی بات نہ بھر مٹی ڈاڑھی ہوتی، لب ترشے ہوتے، تین بیویوں کا غلام اور دو درجن بچوں کا باپ ہوتا۔ خوش اور عریاں انسانوں کی یہاں نہ ہشتی زلیور کی قسم کی کسی کتاب کا مصنف ہوتا اور اس نے پاکستان میں اگر اللہ کے فضل سے پانچ مکان دو باغ اور دس دوکانیں الاٹ کرائی ہوتیں تو یہی مولانا کا بادی اس کی موت پر بے اتہا تعلق کا اظہار فرماتے۔ اور اسے قوم و ملت کے بے نقصان عظیم قرار دیتے۔ خیر چچا جان۔ مجھے اب اس کا غم نہیں کہ مولانا دیوبادی قسم کے لوگ میرے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔ اس کا فیصلہ تو آنے والی نسل کرے گی۔ اور ہاں چچا جان!

آپ کے دل میں یہ خیال یقیناً کسی حاسد نے ڈال دیا ہے کہ آپ کا یہ بھتیجا کیونسٹ ہے۔ آپ کی سات آزادویوں کے حکم میں ہوتا تو اغلب تھا کہ آپ میکارتھی صاحب کی شہادت پر مجھے سچ کچھ کیونسٹ یا ہم مفر ساختی قرار دے دیتے۔ انہوں نے تلگدستی اور بیماری میں نکل نکل کر مر گیا۔ آپ کے یہاں یقیناً آپ کے بے مثل قتل گھر کی آؤ پنی آدم وہ کرسی میں بیٹھ کر بھل کی رو کے ذریعے خوب مزے سے مرتا — دیے تو خدا کے فضل سے ہمارے پاکستان میں بھی سات آزادیاں ہیں۔ لیکن یہاں ابھی آپ کا سا قتل گھر نہیں بنا — واٹھ باٹھ میں کیونسٹ نہیں ہوں۔ آپ بھی عجب سادہ لوح ہیں کہ میرے حاسدوں کی باتوں میں آکر مجھے کیونسٹ سمجھ بیٹھے۔ خدا را اس بدگمانی کو اپنے دل سے دور کیجئے۔ میری بات پر یقین نہ آتا ہو تو آپ پاکستان میں اپنے فضل خانے سے اس کی تصدیق کرا سکتے ہیں کہ آپ کے دشمن مینگوف سے میری کبھی ایسی پیاد اور محبت کی باتیں نہیں ہوئیں جیسی کہ آپ سے ہوتی تھیں۔ یہ ہراسر بہتان ہے کہ میں نے مینگوف کو ماموں بنا رکھا تھا۔ آپ جیسا مربی اور مجدد ایک چچا ہی میرے لیے کافی ہے۔ (اور اب تو یہ بھی سنا ہے کہ مینگوف صاحب نے خود اپنی نااہلی کا اعتراف کر کے روس کی وزارتِ مغلّی سے استعفیٰ دے دیا ہے۔)

چچا جان۔ میں تو قسم ہے خدا نے وعدہ لاشریک کی دنیا میں صرف آپ ہی کا بھتیجا تھا۔ اب بھی آپ ہی کا بھتیجا ہوں۔ گو آپ اپنی بدگمانی کی وجہ سے میری ہر فرمائش اور درخواست کو سکا کر ٹھاتے رہے۔ لیکن میری سعادت خندی اور وفاداری میں ہر جو بھی فرق نہ آسکا۔ ویسے چچا جان! آپ کیونسٹوں سے اتنا گھبراتے کیوں ہیں؟ آپ اپنی سات آزادویوں میں موج اڈایش، کیونسٹوں کو اپنے کھاناؤں اور درانتیوں کو چلانے دیجئے۔ ان طرہوں کے پاس نہ آپ کی سس دھکی ہے اور نہ ہی طین ڈالنا لگیں — کیا



آپ تاریخ کے طالب علم نہیں رہے ؟

کیا آپ یہ نہیں جانتے کہ تہذیب اور تمدن کبھی ایک سے نہیں رہے ؟

آپ لاکھ کوشش کریں۔ ڈائیڈروجن بم سے انسان ختم نہیں ہو سکے گا۔

یہ خط بڑی طوالت پر کھینچا گیا ہے۔ ابھی آپ سے اور باتیں کرنے کو دل چاہتا تھا۔ لیکن

دوسرے دشنامی ختم ہو چکا ہے۔ دوسرے حضرت عزرائیل پر تسمہ پا کی طرح سر پر سوار ہیں کہ جلدی

کر دو مجھے اور بھی کام ہیں۔

عزرائیل صاحب کو اس خط کا جواب لکھ کر دیتے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ خود عزرا

آپ کا وقت منافع ہو گا۔ اس جان ہیگ کا ایک کیس ضرور ان کے حوالے کر دیں۔ اور

اگر یہ ممکن نہ ہو تو اس کے کشید کرنے کا نسخہ ہی مرحمت فرمادیں۔ مزید برآں۔ اگر آپ

ہالی وڈ کی کسی تازہ ترین فلم کی رازوں کے پرنٹ بھجوا سکیں تو ممنون ہوں گا۔

عزرائیل صاحب کو ڈراما صاحب سے ملاقات کا بڑا اشتیاق ہے۔ اپنی جوک

یا کرانے کی ٹیکسی ہی میں ڈراما صاحب کے دو ٹکڑے پر پہنچانے کا انتظام فرمادیں۔ اس

یاد آگیا۔ دس یا پندرہ نئے ڈھلے ہوئے ڈرامے بھجوا دیجئے۔ اب تو انہیں دیکھنے کو

آنکھیں ترس گئی ہیں۔

آپ کا مرحوم بھتیجا

سعادت حسن منٹو

# دہقانیا یو نیورسٹی

(۱)

میں ریاست بہاول پور کے ایک گھاؤں میں اپنے ایک ایسے دوست کے پاس  
 ٹھہرا ہوا تھا، جو مجھے دوست سے کچھ زیادہ عزیز ہے۔ اس گھاؤں کا نام خان بیلا ہے اور  
 مولوی غلام قادر، سجادہ نشین درگاہ حضرت مولوی سلطان محمد بخش علیہ الرحمۃ نے مجھے بتایا  
 تھا کہ یہ گھاؤں تاریخی اہمیت کا حامل ہے اور اتنا ہی پرانا ہے جتنا اویچ شریف یا سلطان  
 شریف اور یہ ان شہروں اور قلعہ بندیوں کی ایک کڑی ہے جن پر کئی صدیاں پیشتر واجبہ  
 دہرکار راج تھا۔ (تو کیا وہ بہادر مسلمان جرنیل محمد بن قاسم یہاں سے گذرا تھا؟)

مولوی غلام قادر اس گھاؤں کے نام خان بیلا کی وجہ جوازیہ بتاتا ہے کہ پچاس (یا سو)  
 سال پہلے یہ علاقہ ریاست کے نوابوں کی شکار گاہ تھا۔ جنگل سورتوں کے شکار کے لیے  
 ان کا چھتیا بیلا اب ریاست کے باشندے اپنے نواب کو پیادے یا روایتاً خان سائیں کہتے  
 ہیں (اور دولہا سائیں) بھی کہہ دیتے ہیں، سو خان سائیں کا بیلا ہونے کی وجہ سے خان بیلا کے  
 اپنا نام پایا۔ ایک مقامی بھانڈے (بھانڈے سے میرا مطلب وہی ہے جو انگریزی "باد" کا ہے۔  
 اور یوں مجھے اس ذاتی شاعر کی جنگ یا تھمیک مقصود نہیں جس کے لیے میں نے بھانڈے کا لفظ  
 استعمال کیا ہے۔) جو ایک سرکاری پیش کار تھا۔ اپنے اس دیس کے گھاؤں کے متعلق، پچاس  
 سال پہلے، ایک بند کہا تھا، جو بقول مولوی غلام قادر، اس وقت تک اس پر اور اس کے  
 رہنے والوں پر درست بیٹھتا ہے۔ اور اس مقام و ماحول کے تاثر کو اپنے شریخ اور بوسے

جوئے الفاظ میں سمیٹ لیئے ہیں کامیاب ہے۔ خان بیلا کے اس شاعر کا بند یہ ہے۔

خان و امیلا

یارا یاری و امیلا

مولوی غلام قادر مجھے بتاتا ہے کہ خان بیلا اب تک یارا یاری کا میلا ہے اور اس  
 'دوں کی شبینہ زندگی' تو اپنے انداز میں اپنی ہی ہو شرابا اور دومان انگیز ہے جتنی پیرس اور دوائی  
 مائی۔ شاید رات کو گھاؤں کی المڑ پیرس خان بیلا کی تنگ اور طیر مگی لگیوں کی دیواروں کے  
 ساتھ و بک کر یا باز کی ہدیوں اور کجور کے چھال کے چھروں سے ڈھنسی ہوئی چھت کے  
 نیچے، اپنے گڈریوں اور محبتوں کا انتظار کرتی ہیں دھنسنے والے کے سامنے یہ دومانی تصور  
 بندھتا ہے، مگر مولوی غلام قادر کی معلومات کے مطابق یہ شبینہ زندگی قدرے کشیت اور  
 گھٹاؤنی ہے اور اس کا تعلق دراصل بڑھی، مشاب سے گزری ہوئی، دلاہ محمد توں  
 سے ہے۔ یہ قدیم جاوہر گریاں محبتوں کی طاقتیں بڑی ترکیب سے کاتی ہیں۔ اور ان  
 کے ترستے عاشقوں کو براہ راست اپنی غیروں کے گھروں میں ہی شربت وصال  
 سے مدد ہوش ہونے کا موقع مل جاتا ہے۔ ان کو لگیوں کے نگوڑوں پر مہرباؤں کے انتظار  
 کی کوشش نہیں اٹھانی پڑتی۔ مغرب اور مشرق کی شبینہ زندگی، میں یہ بڑا فرق ہے؛ مشرق  
 میں یہ شبینہ زندگی 'دیز پر دوں کے نیچے ڈھنسی ہوئی ہے اور گہری گھیری دایوں میں  
 بہتی ہے (کیوں کہ ہم بے حد باحیا لوگ ہیں) مغرب میں یہ رنگین شفات کھٹے کی چکا  
 چوندیں اور جاذبیت اور ناپ ندیس کی معیت میں، ونداتی ہے۔۔۔۔۔ لیکن مجھے یہاں  
 نکاسی اور اضافیت کو نگاہ میں رکھنا چاہیے۔ شاید میں پیارے پڑھنے والے کو خان بیلا  
 کے بارے میں ایک بالکل غلط تاثر دے رہا ہوں جس سے اسے یہ گمان ہو سکتا ہے کہ  
 عشق اور آزاد محبت کے لئے یہ گھاؤں ایک مثالی مقام ہے اگر وہ یہاں دومان کی تلاش

میں کچھ عرصہ آکر ٹھہرے گا تو غالباً اسے ایسی ہی جگہ اور وہ کچھ دن کے بعد صبح بھاٹ اور  
برہی کے انداز میں، اس جگہ کو چھوڑ دے گا۔ اور اس صورت میں صنعت تصور کر سکتا ہے  
کہ وہ کو سا جارا ہے اور اس پر راحت پیچھے جا رہے ہیں۔ کہاں ہیں اس کی وہ دو شیرازیں  
اور وہ رومانی شبینہ زندگی — میرے پاس کوئی بڑھی کٹنی گھٹتی ہوئی دیہاتی دو شیرازہ  
کا پیام لے کر نہیں آچکی تھی۔ میں اپنے قاری کو بڑبڑاتے ہوئے سن سکتا ہوں۔

پیادے پڑھنے والے، بات یہ ہے کہ اجنبی اس شہر نگار میں کچھ شک اور کچھ ڈر سے  
دیکھ جاتے ہیں اور دو شیرازیں پر دیسیوں کے پیچھے نہیں جاتیں۔ پروسیوں کے خلاف ان  
کے اس بے پروایانہ اور معاندانہ رویہ کی میرے پاس یہ تشریح ہے کہ خان بیلا میں کوئی  
سینا گھر نہیں، بلکہ خان بیلا کے آس پاس پچاس میل کے واسطے میں کوئی سینا گھر نہیں  
اور جب تک یہاں کی دو شیرازیں غلیں نہ دیکھیں، ان کو پروسیوں کے پیچھے گزرنے کا کیسے  
علم ہو سکتا ہے۔ وہ کیسے ان کو دیس والوں پر ترجیح دے سکتی ہیں — اپنے گھاؤں میں  
رہنے والوں، ان کے اپنے گھروں کے باسیوں کے لیے ان کے بازو ہمیشہ کھلے ہیں ہولی  
غلام قادر جب درجوان تھا تو ایک دفعہ — مگر مولوی غلام قادر شرماتا ہے!

خان بیلا میں محبت، عمر کی قیود سے بیکسر آزاد ہے، سومر سٹ ماہم کا وہ مقولہ کہ  
محبت ایک ایسا جذبہ ہے جس کا تعلق — براہ راست تمہارے پٹھوں میں چند غصہ و دوس  
کی قوت پر ہے۔ کم از کم خان بیلا کے مردوں کے بارے میں غلط ہے۔ یہاں ایسے ساٹھ  
سالہ بزرگ بھی پائے گئے ہیں جن کی خاطر سترہ سالہ دو شیرازیں، اور بیس بائیس سالہ شادی  
خود عورتیں اپنی حالت بگاڑ لیتی ہیں اور مرد عطر کی بازی لگا کر اپنے معزز رائجین سے عشق  
کی دو انتہیں نکالتی ہیں۔ وہ اپنے سن رسیدہ عاشق پر مدد دے جاتی ہیں، وہ دوسرے رو  
کو دیکھنے تک کی دوا دار نہیں جوتیں اور پیارے پڑھنے والے سچ مانو کہ خان بیلا میں شادی

سال کا نو جوان پر ویسی، ایک بوڑھے ویسی کے مقابلے میں ایک پل بھی تو نہیں ٹھہر سکتا۔  
 یہاں اکثر (متنشیات کو چھوڑ کر) عاشقی کی عمر، شادی کے بعد شروع ہوتی ہے۔ جب  
 یہاں کے مردوں اور عورتوں میں ایک تجربہ کار رانچنگلگن لگاتی ہے۔ بیکوٹ کے کاروبار میں  
 مولوی غلام قادر کی نظر میں نفع بھی شامل ہے۔ اس کے حب کے تعویذوں اور گنڈوں کی  
 کافی مانگ رہتی ہے۔ وہ تیر ہفت نئے بھی نیا کرتا ہے۔ مشہور ہے کہ اس علاقے میں  
 وہی ایک ایسا شخص ہے جس کا مطلقہ کا تعویذ، کبھی خطا نہیں جاتا مگر وہ اسے کسی کسی کو ہی  
 دیتا ہے، مطلقہ کا تعویذ اس عورت کے لیے ہوتا ہے جو کسی اور سے محبت کی خاطر یہ چاہتی  
 ہو کہ اس کا خاوند اسے طلاق دے دے تاکہ وہ بعد میں اپنے یا اسے نکاح کرنے میں آزاد  
 ہو۔ یہ تعویذ بہت کڑا ہوتا ہے اور مولوی غلام قادر اس کا سود و پیر سے کم یا یہ قبول نہیں کرتا۔  
 مولوی غلام قادر نے خان بیلا میں عشقہ جذبہ کو زندہ رکھنے میں معتد بہ حجتہ لیا ہے اور جب  
 کوئی عورت یہاں کی تادیب لکھنے بیٹھا تو اس کے لیے سجادہ نشین درگاہ حضرت سلطان محمود خاں کی  
 خدمات کو نظر انداز کرنا مشکل ہو جاتے گا۔

مشا جگلوں کے شکاری 'کولو۔ اس کی عمر پچیس برس کی ہے اپنے بھاری جٹے، رنگین،  
 تصویریت سے پڑھاس اور ہندی سے رنگی ہوئی چمکے لٹاواٹھی کے ساتھ وہ فینو کور کے  
 'سٹریچ انڈین، نادوں کا ایک کروڑ لگتا ہے۔ اس کے پاس ایک نالی بندوق ہے جو لڑکی  
 خرین کے ایک مقامی اسلوا ساز کی صنعت کا نمونہ ہے اور جس میں سرے کے دھب کی سی لہری  
 ہوئی بارود نالی کی دھاسے بھری جاتی ہے۔ اس بندوق کو بھرنا اور اسے پھٹنے کے لیے  
 تیار کرنا پورے پندرہ منٹ کا کام ہے اور بذات خود ایک تکنیک ہے، بنگلوں کا شکاری  
 اپنی اس بندوق پر بے حد معزور ہے اور اکثر وہ اس ہتھیار کو اپنے سینے پر باندھے خان بیلا

کی گلیوں میں ایک عجیب اہمیت آوارہ وطن سرحدی کی طرح پڑتا ہے۔ اسی کی وجہ سے خان بیلا بعض دفعہ ایک خاموش پُر سکون بستی کی جیسے ایک خطرناک سرحدی چوکی کا تاثر دیتا ہے۔۔۔۔۔ مگر جنگوں کا شکار دی، اپنے اس سفاک ہتھیار کے باوجود ایک جنگجو مہاجر نہیں بن سکتا۔ بھنگ سے سبز جوتی ہوئی اس کی آنکھیں اس کے جنگل ارادوں کو بھٹلاتی ہیں۔ وہ مجھ سے اکثر کشمیر کی باتیں پوچھتا ہے اور شادنا کہتا ہے کہ اگر اسے خان بیلا میں زمین کے دھندوں سے (اور عاشقوں) سے فرصت مل سکتی تو وہ جاما پر ضرور گیا ہوتا دیکھا اس کے پاس ایک بندوق نہیں!)۔۔۔۔۔

وہ ہمیں ایک دن دھاند کی مشق اور شکار کے لیے باہر گھومتوں میں لے گیا۔ دھان بیلا کے گرد اس کے باغوں اور گھیتوں میں دامدار چھوٹے گیرے جوتے ہیں۔ لافانی!۔۔۔۔۔ یہاں میں نے اپنی زندگی میں پہلی بار بندوق چلاتی اور معلوم کیا کہ میں کوئی بڑا نشانچہ نہیں۔ اس شکار کی ہم کے دو دان میں جنگوں کا شکاری، کے کردار کا ایک دلچسپ پسو سامنے آیا۔۔۔۔۔ اس نے میرے دوست سے جھجکے ہوئے درخواست کی کہ اسے اپنی جنسی قوتوں کی آزمائش کے لیے ایک ایسی عورت کا راجہ جس سے عورت بالکل اس کی دام چو جائے اور کسی اور مرد کا خیال نہ کرے۔ میرے دوست کے کہنے پر اس نے دفتر دفتر ہمیں بتایا کہ وہ ایک لائیں سالہ لٹانی کے دام تیز ویر میں گرفتار ہے۔ اور یہ کہ پچھلے چند ہفتوں سے اس کی محبت کا جنسی پسو اس قدر تھکن بخش تھا جیسا کہ ہونا چاہیے تھا اور اس کی امساک کی اہلیتوں میں کافی کمی رہنا جو چکی تھی۔ لٹانی میں اس کی پٹھن کی ہی سیلج نہ رہی تھی اور اس نے اس کے۔۔۔۔۔ متعلق بعض باتیں بھی سنیں۔ میرے دوست نے جنگوں کے شکاری سے وعدہ کیا کہ وہ اس کو ایک ایسی زبردست خوراک دے گا جو اسے دھندلے شاد کے شاہی حکیم کی خاص بیامنی کے ایک نسخے سے تیار کی ہوئی ہے اور پھر واپس آکر اس سے اسی پچھن سالہ عاشق کو کرکٹیں کھچر کی

ایک بڑی ڈول اپنے سامنے پلادی —

لیکن میں اصل موضوع سے ادھر ادھر بھاگ رہا ہوں۔ میں نے وہاں کی بستی کی دہقانہ یونیورسٹی پر غم اٹھایا تھا اور اب دیکھتا ہوں کہ اصل موضوع کی بجائے، میں فرحانوں کی عام کمزوری اور خیر ذمہ داری کی وجہ سے، غم بیلہ کی معاشقانہ زندگی کی کشتوں میں پڑ گیا ہوں — خیر! پیار سے پڑھنے والے! اس سب کو ایک تمہید سمجھو — اس اچھے گاؤں پر ایک حاشیہ، جہاں سے میں اپنی غفلت سی یا ترا پر رونا رہا ہوا۔

(۲)

میرے دوست نے مجھے اس یونیورسٹی کی بابت بتایا تھا، جو محض ایک شخص، محض ایک دہقانہ کی ذاتی کوشش اور ہمدردی کا نتیجہ تھی اور جس کے کئی اخراجات کا صرت وہی کفیل تھا۔ اس یونیورسٹی سے قطعاً میرے دوست نے کہا، ایک کتب خانہ بھی ہے، دو ہزار قیمتی اور نایاب عربی اور فارسی کتب کا ذخیرہ — کتابوں کا ذکر سن کر میرے منہ میں پانی بھر آیا۔ مجھے کتابوں سے محبت ہے — پرانی، قدیم، ووق لفظ ہونے انگوٹھوں سے چیلے سطروں والی کتابوں سے خصوصاً۔ دنیا میں کوئی خوشبو مجھے اس خوشبو سے زیادہ پسند نہیں جو بوسیدہ سطروں، ان کی قدیم جلدوں اور زردیائے ہوئے اوراق سے آتی ہے — ہو سکتا ہے تم عربی نہ جاننے کی وجہ سے وہ کتابیں نہ پڑھ سکو اور زرد سطروں پر لکھی ہوئی باتیں تمہارے لیے اسرار ہیں مگر تم میٹھی سی، باسی سی، شہین کی طرح دماغ میں بستی ہوئی سی، خوشبو تو سونگھ سکتے ہو، تم ان کو اپنے دانتوں میں لے کر تھپک تو سکتے ہو!

موجب میرے دوست نے خود ہی ایک روز یہ تجویز کیا کہ میں اگلے روز شام کے چاند کے سائیکل پر غم بیلہ سے رونا ہو کر وہاں کی بستی پہنچ جاؤں۔ جہاں وہ

میرا منتظر ہو گا تو میں نے اُسے دل ہی دل میں سراہتے ہوئے اپنی رضا مندی کا اظہار کیا۔ میرا دوست غلامگے روز صبح پڑاوی کے ہمراہ گھوڑی پر سوار چڑھتا ہوا دوکانوں کی بستی کی طرف روانہ ہو گیا۔ اور جانے سے پہلے اس نے ایک مٹائی کی پشت پر ایک نقشہ مانتا کر دہ دستہ واضح کر دیا جو مجھے اختیار کرنا تھا۔ ویسے راستہ اتنا آسان تھا کہ ایک بچہ بھی اس کو سمجھ سکتا تھا۔

یہاں میں اپنے دوست کے بارے میں کچھ لکھنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ وہ  
عمر گھر میں ایک ضلع دار ہے۔ یہ عہدہ اس جیسے ہر لحاظ سے بڑے اوج پران کن قابلیتوں  
کے شخص کے لیے قدرے مشکل خیر ہے۔ اس کی صلاحیتوں اور اس کے حیرت انگیز کام میں جس پر  
وہ مامور ہے۔ ایک قطعی طور پر بے جوش و ہوش اور عدم متاثریت ہے جیسے رستم کو جری شکوں  
سے لڑنے کی ہمت ہے۔ بچوں کی بات گھڑی دھکیلنے پر لگا دیا ہائے۔ جیسے پولیس کو میوئل کیٹی  
کا وعدہ بنا دیا جائے۔ جیسے مرزا غالب کو مقامی بلدیہ میں کسی میوئل کشش کی مدد میں تھیں  
معاوضہ پر قید دے لکھنے کے کام پر فائز کر دیا جائے۔ — مجھے اداس کے شاہزادے  
کی پاک روح کی جھلک اگر کسی شخص میں نظر آتی ہے تو وہ میرا دوست ہے۔ کتنا عظیم  
ترین اور بلند ہے وہ اس کی صحبت میں گزری ہوئی ایک گھڑی ایک ایسی سعادت ہے  
ایک ایسا دائمی اور لازوال تجربہ ہے کہ آدمی اس کے لیے خوشی سے اپنی بے حصول کمایہ  
زندگی کے لیے کئی سال دے سکتا ہے۔ اس کی صحبت ایک بڑی سی کتاب پر پڑھنے  
کے مترادف ہے اور اس کی گفتگو میں ایک سحر کن، ڈراؤنے والی صفت ہے  
جو سنسنی میں بیان نہیں ہو سکتی۔ اس کی گفتگو کی یہ عجیب کشش، انسانیت کے لیے  
اس کی حقیقی ترسپ، اس کی ان خوبصورت، بڑی آنکھوں میں وہ بے باک اور جواور  
نگاہ جو جھوٹوں اور گھڑوں میں دھبے والے انسانی مینڈکوں کے لیے (جیسے ہم میں سے



میشتر ہیں، بڑے حقیر اور بے رحم ہے۔ اس سب کچھ کو الفاظ میں اس طرح پیش کرنا کہ یہاں  
 بڑھنے والے، تم اس بڑے آدمی کی ایک زندہ جیتی جاگتی تصویر اپنے دوبرودہ بچھنے  
 لگو تو اس کے لیے تو ہا زویل، بیسی صد جیتوں اور محافظہ اور صبر کی ضرورت ہے۔ میں  
 بد قسمتی سے کوئی بازویل نہیں۔ ایک دفعہ کئی سال پہلے، اسے ڈیرہ دون میں آدمی  
 کمیشن کے لیے تقریباً چنا گیا، اس نے کمیشن سے اپنے آپ کو کسی نہ کسی طرح سے بچا لیا۔  
 کیونکہ اس نے مجھے بتایا کہ اگر کبھی فوج میں شامل ہوا بھی تو ایک معمولی پرائیویٹ کی حیثیت  
 سے شامل ہوگا۔ اور یہ محض ایک لڑکے کا ناچختہ جوش تھا۔ اس میں وہ برفانی حوصلہ  
 ہے جسے ہولین سرما کی آدمی رات کا حوصلہ، کہا کرتا تھا۔ وہ ایک بھلا داج پرست  
 گھرانے کا سپوت ہے اور ڈھاکوں کے درمیان پی کے واسی میں اس کا حسین دس ہے۔  
 اس بھلے شاہزادے، کا خاندان اپنی پرانی قبائلی روایات اور اس کے افراد کے درمیان  
 ایک مضبوط خون بندھن کی وجہ سے (جس سے وہ ایک دوسرے سے ایک ایسی غلاظتی  
 و نفاذی سے جکڑے ہوئے ہیں جو ان دونوں میں حیران کن ہے) بچھے اکثر سکاٹ لینڈ کے  
 ان سرحدی قبیلوں کے سرداروں کی یاد دلاتا ہے جن کے متعلق ڈائریکٹ اور اسٹیٹون  
 کے زندگی سے اچلتے ہوئے ناول ہمیں بتاتے ہیں۔ وہ ٹیگور اور اقبال کا عاشق ہے۔  
 (اسے ان کے صفات کے صفات اذہر ہیں) اور ان دونوں نے اس کے گرد کی تکمیل  
 میں بہت جیت لیا ہے۔ اس کے علاوہ کے سادہ دہقانوں کے لیے جو اس کے پاس  
 پانی یا خواہ کی درخواستیں لے کر آتے ہیں اس کے دروازے اور اس کا دل ہمیشہ کھلے دیتے  
 ہیں۔ وہ ان کی معیشت و در کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔ اس کے گھر کی چھت  
 کھینچے وہ دہقان اپنے آپ کو محفوظ پاتے ہیں۔ وہ اپنے سادے ڈکھاس کے پاس  
 لے کر آتے ہیں۔ میرے دوست کو اکثر دکھ ہوتا ہے کہ وہ ان کے لیے وہ سب

کچھ نہیں کر سکتا جو وہ کرنا چاہتا ہے۔ کیوں کہ وہ سمجھتا ہے کہ اس ملک میں اصل مسئلہ روزے ہونے لوگوں کی معاشی اور اقتصادی خوش حالی ہے۔ اس استعدادی نظام میں یہ خوش حالی ممکن نہیں اور غریب آدمی کی اذیت کو کسی طرح بچا نہیں کیا جاسکتا۔ اس کہانی میں اپنے دوست کے متعلق یہی کچھ لکھوں گا۔

اگلے روز چار بجے میرے دوست کے ملازم اور باورچی (اور دوست) غلام نکالنے اپنے سائیکل کو باہر نکال کر صحن میں کھڑے ہوئے شریں کے تنے کے ساتھ کھڑا کر دیا۔ اس نے پپ کے ذریعے بائیکل کے پیوں میں تھابت پیار اور احتیاط سے ہوا بھری۔ دہلا پلا اور "چھلاوہ نما" غلام نکال دیا۔ اپنی زبان کا شاعر بھی تھا۔ اور اس نے ہر بھرتے وقت اپنی سائیکل پر لکھی ہوئی نظم کے "بند" دیکھنے میں گنگنائے شروع کئے۔ یہ نظم جو ہم تقریباً ہر رات، تیل کے میپ کی سیڑی رنگینی، بونی دوشنی سے پی ہوئی دیواروں والے کمرے میں اس سے سنا کرتے تھے اور جس کی سادگی اور خوب صورتی وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو ریاست کے رچنے والے ہیں۔ اس نظم کا پہلا شعر ہے۔

یہ سائیکل گھر پہنچیدائے  
یہ سائیکل گھر پہنچا تا ہے  
تے دھڑے دھڑے  
اور بچھڑے یا ملا تا ہے

میں نے اپنا سامان گھڑائی کی صورت میں باندھ لیا تھا۔ رات کا پاجاما، تریا، اپنے دوست کے کچھ سرکاری کاغذات جن کی اسے پڑتال پر ضرورت تھی۔ اور مسٹر ہیلر ہلاک (MR. HILLIER DELLOC) کے افسانوں اور مضامین کا ایڈیٹوریل، ایڈیشن، گھڑائی کے پیچھے ایک دسی کے ذریعے گیر پر پکس دی گئی، یہ اطمینان کرنے کے بعد کہ ہوا وغیرہ ٹھیک ہے اور یہ کہ بریکیں کام کرتی ہیں ڈایک کام نہیں کرتی تھیں گویا تیار ہوا گئی کے لیے تیار تھا۔

اب میں نے پنوں کی جیب میں سے پکیٹ نکال کر تینپنی کا سگریٹ سلگا یا میرے خیال میں سگریٹ سلگانے کا بہترین اور بہترین لمحہ ہوتا ہے جب آدمی سفر پر روانگی کا آغاز کرنے والا ہو۔۔۔ اور اس تقریباً مقدس ریت کے بجے ایک بڑا اچھا سگریٹ جو تاجا چاہیے۔ بلیک اینڈ اسٹاپا پانچ سو پچپن یا دودھسی سو براؤن جس کا ٹن دس روپے میں ملتا ہے، جس کے کاغذ کا رنگ اینون کی طرح سیاہ دیشی ہوتا ہے اور جس کے مجھے تباکو میں، دلچسپیتین ہے، حشیش کی آغ بھتی ہے۔۔۔۔ مگر غان بیلا میں بہترین اور سب سے بڑا سگریٹ جو دستیاب ہو سکتا ہے وہ تینپنی ہے۔ سب سے شک تینپنی ان گروٹوں میں سے نہیں جو پُرکشش ٹینوں میں سے فراہم اور سکون کے ماہر ادوں کی طرح نکلتے آتے ہیں اور جن کے متعلق ان کے جاننے والے تمہیں یہ بتائے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ان کو ایڈورڈ ہفتم اور دوسرے دولت مند خوش ذوق امیر باقا حدگی سے پینے کے ماوی تھے اور یہ کہ ان کے شاہانہ حلقوں کو ان سے ذرا بھر بھی نقصان نہیں پہنچا۔ جن کے متعلق بتانے والوں کا دعویٰ ہے کہ ان میں استعمال شدہ تباکو سے بہتر تباکو دینیسیا میں اور کہیں نہیں گندھا جاتا۔ تینپنی ایک پروڈکٹری سگریٹ ہے۔ غالباً ایک متوسط الحال سفید پوش سگریٹ۔ مگر یہ ایک اچھا، ایماندار سگریٹ ہے اور اسے کسی کی نفاست طبع پر گراں نہ گزرنے چاہیے۔۔۔ جو کچھ بھی جو غان بیلا اس سے بہتر سگریٹ دینے سے قاصر ہے۔

نظام قادی سائیکل پڑھے میرے ساتھ گاؤں کے باہر سڑک ٹک آیا اور جب ہم خان بیلا کی ٹیرھی میڑی گلیوں اور بوڑھیوں کے سائے بان والے بازار سے گزر رہے تھے دو بازار جہاں چھوٹی دوکانوں میں میاں کے سوداگر بچے گڑاکی بھیلیاں، نمک، تیل، لون۔۔۔ منانے اور کپڑے دھونے کا سامان بیچتے ہیں! وہ مجھے راستے کے متعلق واضح ہدایات

دے دیا تھا۔ اسے شاید میرے منزل مقصود پر پہنچ سکتے کابیقین نہ تھا۔ اس نے مجھے کتوں سے بھی خبردار رہنے کا مشورہ دیا جس پر میں مسکرایا۔ کیوں کہ میں کتوں سے مطلق نہیں ڈرتا اور اسی لوگوں کو تحقیر سے دیکھتا ہوں جو ڈرتے ہیں۔

سڑک پر میں نے اسے الوداع کہی اور سائیکل پر سوار ہو گیا۔ مولوی غلام قادر اپنے آسموں کے بانج میں کھڑا ہوا اپنے چند آدمیوں سے کام کروا رہا تھا۔ ٹانہ ٹاکر میں نے اسے سلام کیا اور پختہ پکی سڑک پر پہنچ گیا جو ریاست بہاول پور کے شمال مغربی حصے کے وسط میں سے ایک شاہرگ کی طرح گزرتی ہے۔ لاہور اور کوئٹہ اس شاہرگ کے دو سرے ہیں۔ پھلج جنگ عظیم میں یہ ذبی اغراض کے تحت بنائی گئی تھی، بعض ٹکڑے چھوٹی سلوں سے سطر ہیں، بعض ٹکڑے ہائڈرو میٹلڈ METALLED ہیں۔ پھلج جنگ نے ریاست بہاولپور کو کم از کم ایک گھنٹیا گرانڈ ٹرنک روڈ تو دے ہی دی ہے۔ ایک شاہی شاہراہ جو مستقبل میں ملک میں تجارت اور صنعت کی دیل پیل میں ترقی کے ساتھ ساتھ اپنی بہت اور ضرورت زیادہ سے زیادہ بنائے گی۔ — آج کل ماسوائے ڈکے ڈک یا موٹر کار کے سڑک پر سے بہت کم ٹریک گزرتا ہے۔ —

ایو سیکل گھر چنپنڈا اے — میں گہری سوچیں سوچتا ہوا، سر پہرے سوچ کی ندیوں ضنا میں سے پیڈل پھتا گاڑتا گیا۔ کھیتوں اور کیکروں اور جوا کے حقیر شروں سے جھکے ہوئے ریشی بھالو الے سروٹوں کے پاس سے، کھجوروں اور دوسرے پڑوں کے جھنڈوں میں دھکتے ہوئے گڑوں کے پاس سے، میں آگے ہی آگے بڑھتا گیا۔ یہ دو مائنیت سے پڑ گڑٹ ہمیشہ ایک ہی سے ہوتے تھے۔ ہر گڑٹ عموماً ایک دوپکے مکانوں، متعدد گھاس کے چھپروں کی جھونپڑیوں، ایک گنبد والے روئے اور ایک پٹلی میناروں والی مسجد پر مشتمل ہوتا ہیں کے سو چاہر گاؤں کا ایک چھوٹا فرعون ہے جو بکری حویلی میں رہتا ہے۔ اس کی اہمیت

گزارہ رحمت، گھاس کی جھونپڑیوں میں رہتی ہے۔ اونچے میناروں والی مسجد چھوٹے فرعون نے ثواب کے لئے جزائی تھی اور غالباً اس سے بھی کہ اس کی رحمت اس میں اللہ کو یاد کرنے میں مشغول رہ سکے اس گاؤں کے پہنچنے والے (یعنی رحمت) اپنی کسی شکل کے وقت اس گنبد دار روئے کے نیچے سوسے ہوئے پیریاوں کے پاس ہاکر گرا گراتے تھے۔ جو ان کو اپنی کرامات کے فیض اولاد اور مویشی حمایت کرتا تھا اور چڑا سوار جسمانی عارضوں سے ان کی اولاد کے بہتر کی جان بچاتا تھا۔ انہیں شاید خدا سے زیادہ اپنے اس پاک آدمی کی اعانت پر اعتماد تھا اور وہ ان سب مافوق العظمت معجزات اور کرامات پر یقین کرتے تھے جو سجادہ نشین ان کو اپنے دل کے متعلق بتاتا تھا۔ اللہ دور تھا، اوپر آسمانوں کے پردوں کے پیچھے، ان کا پاک آدمی ان کے درمیان تھا۔ چھوٹا فرعون پاک آدمی سے بھی زیادہ نزدیک تھا۔

ان لوگوں کے لیے تحریر و تقریر کی آزادی، اشتراکیت، اشتراکیت، جمہوریت اور دوسری تینتیس (29) کتنی دود کی باتیں تھیں، میرے کافی گاؤں سے ذہنی اور ذہنی دو فوجانوں کی گرم اور تندہ کش (کافی کو چوستے ہوئے) ان کے جگ کو جنت بنانے کے ارادے دہانچے سوچیں پتے ہوئے) ان لوگوں سے کتنی صدیاں آگے تھے! ان لوگوں کو تم کوئی سامی ازم، یا کوئی نئی سنی سنی، دوسرے دوسرے سے بدواشت کریں گے، بشرطیکہ ان کے پیر، ان کے خدا اور ان کے چھوٹے فرعون کہ ان سے نہ چھینا جائے ان کے بغیر وہ اس الجی ہوئی، خام و قیاس کھینے جائیں گے۔

— پاس ایک جھاڑ کے پیچھے سے ایک کسرتی بدن کا کتا بھگت میری طرف پھلانگتا ہوا آیا۔ اس کتے کا ارادہ میری ٹانگ بیٹنے کا تھا اور خطرہ دیکھ کر میں فوراً سائیکل سے نیچے اُتر آیا اور دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ سائیکل کو اپنے اور کتے کے درمیان حائل کر کے میں نے اس جھونکتے ہوئے حیوان کو پیش بھری نظروں سے دیکھا وہ اب اپنا ارادہ

بدلتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ مگر وہ ان عام کتوں سے زیادہ دلیر تھا جو ذرا سی سبیل دینے سے دم کو ٹانگوں میں لے کر پلے جلتے ہیں۔ اس نے اپنا جھونکنا اور پکنا جاری رکھا اور دین اقرار کرتا ہوں اگر میں اب خائف ہونے لگا۔ کچھ دیر جھونکنے کے بعد یہ کتاب پرے جھاڑیوں میں چلا گیا مگر میں اس ڈر سے کہ کہیں وہ پھر لوٹ کر میرا تعاقب کرنے کا فیصلہ نہ کرے، کچھ دور سائیکل ہاتھ میں لیے آہستہ آہستہ پیدل چلا گیا۔ میرا

یہ ڈر بے بنیاد تھا۔ کیونکہ ایک بار چوکتا شکست تسلیم کر چکا ہو وہ دوبارہ جنگ کے لیے نہیں لوٹتا۔ ان لوگوں کو جو کتوں سے خائف ہیں۔ میں ایک ٹکڑا بتاتا ہوں کہیں کتوں سے نہ بھاگ۔ واقعتاً اور حیلچلے کے انداز میں ان کے سامنے کھڑے رہو۔ ان کو یہ تاثر نہ دو کہ تم ان سے خائف ہو ورنہ وہ تمہیں کاٹ لیں گے یعنی ان کے کاٹنے سے پہلے تم خود انہیں کاٹ لو۔

میں نے اگلے سڑک پر ایک خاندانی خانے کو جا لیا۔ کہنے کا بڑا بڑا ایک چھوٹے سے ٹوٹر سوار قتلہ ایک پگڑیا پہنے تھا اور ٹوٹا اس کے دیہاتی جیسے اور قدامت کے لیے اتنا چھوٹا تھا کہ اس آدمی کے پاؤں سڑک کی سطح سے گھسٹتے جا رہے تھے۔ مگر اس حالت میں بھی اس پر ہنسنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ اس کے چہرے پر اپنے کہنے کی سرداری اور تمکنت اور سنجیدگی تھی۔ اس کا کتہہ جو لاتعداد عورتوں اور بچوں پر مشتعل تھا اس کے پیچھے دو اونٹوں پر کھانوں میں ٹھنسا ہوا تھا۔۔۔۔۔ کہا سے میں لدی ہوئی عورتوں نے مجھے ایک عجیب دلچسپی سے دیکھا ان میں سے دو بچے ایسی بد صورت نہ تھیں۔ اور وہ آدمیوں کے بازوؤں کے لیے بھرپور نہیں۔۔۔۔۔ میں نے سوچا: ان عورتوں کی زندگیوں میں مصائب جلتے جوتے ہوں گے، یہ بھی لادوں گی لگیوں کے عورتوں پر اندھیرے میں اپنے راجنوں کا استغفار کرتی ہوں گی۔ کون جانتا ہے! پھر بھی ان کو دیکھنے ہوتے اس طرح معلوم ہوتا تھا جیسے ان کو ان باتوں سے کچھ واسطہ نہ تھا ان

کے چہرہ پر (دوائے ایک کے) ایک معصومانہ کنوارہ پن کی چھاپ تھی جو عورتیں چھتا نہیں کیسے  
 پہن بیٹھی ہیں — سندھ سستی اور صحت اور جوانی سے دلکشی ہوئی، اپنے سرخ کپڑوں میں سے  
 جھللاتی ہوئی (مجھے ایسا لگا) وہ کرچی کی بے جان، بد صورت، سیاہ سوکھی ٹانگوں والی خلیوں ڈھاپ  
 راتل پر ٹپ ٹپ۔ ٹپ آٹھ گھنٹے ٹپ ٹپ ٹپ) اور ہر قدم میں مدفن یا مکھنوں بے ہنگم لاشوں  
 کے مقابلے میں کتنی زیادہ خوش نصیب تھیں۔ اس کا کیا کہ یہ عورتیں کبھی کالج میں نہ گئی تھیں یا ان  
 کے گھبرائے خاوندوں کے پاس سوخا دیا دیں نہ تھیں! فتح ان کی ہی تھی، صحت کی دیک ان کی تھی،  
 وہ اپنے خاوندوں کو خوشی اور لطف دے سکتی تھیں، انہوں نے گھر و مرد و بچے غنے اور محبت کی  
 تھی — یہ تاں کہ اب غالباً کس چہرے کے عرس یا کسی قرابت واد کی خادہ میں شریک ہونے ہارنا  
 تھا۔ اور کا ہر تھا کہ وہاں وہ خوب مزے کا وقت کاٹیں گی — صحت اور جوانی سے دیکھتے ہوئے  
 چہرے! (میرا ایک تاثر!)

میں نے ان کو قد سے چمکا ہرٹ سے دیکھے چھوڑا۔ میرے پاس سائیکل کو اتنا آہستہ  
 چلانے کی کوئی وجہ نہ تھی کہ اس کے ساتھ ساتھ رہوں — کھیلتوں میں اور سڑک کے بیچ میں  
 مجھے غنے چرواہے نے جن کے داگ میرے دوست ندیم نے اپنی لافانی فنگروں میں لگائے  
 ہیں۔ وہ عموماً سڑک کے وسط میں نکل اٹھتے اور بے پروائی سے بیٹھے ہوتے بیٹھے ہوتے  
 اپنے بکریوں یا بھیڑوں کے روٹوں کی نگہبانی کرتے تھے — نہنگی ان کے لیے فراخ اور  
 کشادہ اور شیریں تھی، اور دنیا ایک چمکیں ٹھٹھاتی ہوئی گھنٹی، کوئی عالم استاد یا بے حس باپ ان  
 کی جانوں پر ہر وقت سوار نہ رہتے تھے، انہیں خشک کتابوں کے رٹنے کا عذاب بھی معلوم نہ  
 ہو گا۔ وہ کبھی دفتر کے سٹول پر نہ بیٹھیں گے، وہ بھی اپنی اس پھر پر ہی جہان متنا سب الاعضاء  
 خوبصورتی کو نہیں کھوئیں گے (وہ بد صورت اور بحد سے اور کوتاہ نظر نہیں ہوں گے) —  
 — وہ اس طرح پھول چل رہے تھے جیسے ایک درخت اگتا ہے جیسے ایک نیدی برقی چہ

دور ذورقہ کی ٹرس کرے۔ کی طرح مادی فطرت خود مکمل فضا میں، تاروں سے نکری ہوئی رہتی ہے۔  
 بھڑکتی ہوئی شفتیں، قرآنے بھرتی ہوئی ہوا، مادی فطرت میں کوئی نہ، ان ننھے چرواہوں کی تشکیل  
 کر رہی تھی۔ یہ ننھے چرواہے۔۔۔ وہ کبھی نور اسس، کا شکار نہ ہوں گے، وہ کبھی گراپی  
 کے گرد بڑھتیوں اور تاجروں کی طرح محض فراڈ اور عروسی ہی کو زندگی نہ سمجھیں گے۔ وہ کبھی بنگوں اور  
 شاگ اکھیڑوں پر استوار شدہ سونے کی پھل کے پاؤں میں نہ پھنس گئے اور کبھی ہر آدھ آدھ گھنٹے  
 کے بعد ایک بے کار، بے فائدہ ووڈ کے بعد سامنے کے ایرانی راستروں میں بیٹھ کر ایک چائے،  
 اور پانی کا ٹکاس اپنے اندر نہ اٹھائیں گے۔ دولت! سٹوڈی بیک! کراسٹر! جوک!  
 تہذیب! مگر تہذیب اپنے عقب میں کیا لاتی ہے۔ ایک ناقابل علاج بے سکونی اور عروسی،  
 پہلی سادہ زندگی سے دوری، نیوراسس! تہذیب! تہذیب سنگھڑاؤ کو لاتی ہے اور  
 اس کی وہ سب نعمت، الشعود اور لاشعود اور احساس اور ایس کی عجیب و غریب، پاگل بنائیں  
 والی مقبوریوں کو۔۔۔ موجودہ تہذیب دنیا کی بیشتر آبادی عروم آدمیوں پر مشتمل ہے جو عجلت  
 ہوتے ہیں، اور بدھنیں کاٹتے ہیں۔ اتنے بڑے شے کی سبب ناک وسعت کا تصور کرتے ہوئے  
 آدمی وہی جاتا ہے۔ ان آدمیوں کی عروسی جو وہ نہیں کاٹتے ہیں، ان کی جو کسی طرح دولت نہیں  
 کاٹتے، ان کی عروسی جو جنسی طور پر عروم اور غیر مطمئن ہیں اور سائیکالوجی، میگزین کا بہت مطالعہ  
 کرتے ہیں، ان کی جو نہیں جانتے کہ وہ پیدا کیوں ہوئے اور اب جو گئے ہیں تو کیا کریں۔ وہ  
 لاتعداد سگریٹ پھونکتے ہیں، لاتعداد چائے کی پیالیوں میں فراڈ ہونڈتے ہیں۔ یہ  
 ننھے چرواہے تہذیب کے ہاتھ ہوئے اس خوف ناک مارنے سے محفوظ رہیں گے!  
 جب میرے انٹلیکچرل دوست، کپکپاتی ہوئی انگلیوں میں سگریٹ پکڑے، کافی کے  
 پیلے پر اقتصادیات اور ادبی سیاسیات پر عالمانہ بحث کرتے ہیں اور دلتے پیش کرتے ہیں  
 کہ اشتراکیت یا اشتراکیت یا شریعت سب انسانی دکھوں کا تریاق ہے اور یزیدین پر ایک



نیا بہشت لے آئیں گی تو میں کٹر سوچنے لگتا ہوں! کیا یہ سب کچھ انتخابی آسان ہے — کیا اقتصادیات کی تھیوریاں فی الواقعہ دائمی سکون اور خوشی انسان کو دے سکیں گی۔ آدمی نے سائنس میں ادب ہیں، آرٹ میں اتنی ترقی کی ہے مگر کیا بیسویں صدی کا بھڑبھادی جو ہوا میں اڑ کر بارہ گھنٹے میں کراچی سے لندن پہنچ سکتا ہے اپنے بہتر اور مصاحات کے ذائقے کے مورد سے زیادہ خوش، زیادہ مطمئن ہے؟ مجھے اس میں شک ہے۔ مجھے یہ سادہ ترقی (اگر یہ فی الحقیقت ترقی ہے) قدر توں کی ایک کڑی تنقید لگتی ہے۔

میں اب پنچ پرانے پر تھا — یہاں مجھے سڑک کو چھوڑ کر بائیں طرف مڑنا تھا اور ضرر کی پٹری پر پانچ چھ میں آگے جاتا تھا۔ ریاست کی نہریں اس کے غطوں میں اس طرح چڑی جوتی ہیں جیسے انسانی جسم میں شریانیں۔ ان کے ذریعے سے اس صحرائیں زندگی کا خون دودھ ملتا ہے لیکن اب یہ صحرا صحرائیں ہے۔ بیگانہ اور جیسلیئر کے ساتھ کے سرحدی علاقے کو اور حبیب نودوں کو چھوڑ کر ریاست کا ایک بڑا حصہ ان نہروں کی شفقت سے اب ایک سرسبز کھلتا ہوا باغ ارم بن چکا ہے۔ کل کو اگر کسی وجہ سے یہ نہریں یہاں نہ ہیں یا دریا سوکھ جائیں تو یہ سارا خطہ پھر جبروڈ و تلس کے میسر پریشیا کی طرح ایک بنجر، بے آب و گیہ صحرائیں بدل سکتا ہے۔ پانی دیوتا کے ہاتھ میں اتنی حبیب طاقت ہے۔

پنچ پرانے کی ہوا، جس پر پٹری پر سائیکل چلا نا بے حد خوش گزار لگتا تھا۔ نہ کوئی بچکڑے تھے نہ ہی سائیکل کی شکایت آئیز کر اچیں! کیریر پر بندھے ہوئے پمپ کی کٹر کٹر ہسٹ جو مجھے راستہ بھر دق کرتی وہی تھی، پٹری پر آتے ہی بند ہو گئی اور مجھے کئی دھڑبھڑا جانے کے لیے سڑک دیکھنا پڑا کہیں پمپ گڑ تو نہیں پڑا۔ نہر کے دودھ و شراب اور کیلک اپنی خانوں میں سودا کا سونا جیسے ایسا وہ تھے۔ اور ان کے درمیان ضرر، گہری اور زمروں اور پڑا زمینان چھ ہی تھی۔

..... کالے کے دلوں میں جب میں ایٹھو سن اور دانیل و بیگرڈ کے جہاتی ناول پڑھا کرتا تھا اور

ان کے کرداروں کی سی زندگی بھینا جاتا تھا تو میں ان نہروں میں خیاالی سفروں کے پروگرام بنایا کرتا  
 ان دنوں میں ایک عرصے تک بھینگی سے ایک نہر کھنے والی کمپنیز کی کشتی خریدنے پر غور کرتا رہا  
 تھا۔ اور مجھے یاد ہے کہ میں نے بہنی ایک دو انگریزی کمپنیز کو بھی جو کمپنیز کی کشتیاں بھیا کر سکتی  
 ہیں اس مسئلے میں لکھا۔ اس کشتی کی قیمت کا میں اس وقت کمبل نہ ہو سکتا تھا اور آخر مجھے چارو  
 ناچار اس بارادہ کو ترک کرنا پڑا۔ آدمی ان نہروں کے ذریعے تقریباً ساری دیاست کا سفر کر  
 سکتا ہے اور پانی کے بہاؤ پر سفر کرنے سے بے جا مشقت میں نہ کرنا پڑے گی۔ اگر وہ چاہے تو  
 پھلیاں پکڑتے ہوئے سفر کر سکتا ہے یا اپنی کشتی میں بیٹھ کر نیلے آسمان کو اوپر سے گزرتے  
 ہوئے دیکھ سکتا ہے۔ وہ پردوں کی داگنیوں کے ساتھ لاتعداد سکرٹ پی سکتا ہے یا ٹیونس  
 کو چڑھ سکتا ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ اور ایک چیزیں ہیں جن سے وہ اپنا دل بہلا اور اپنا وقت خوشی  
 اور نفع سے گزار سکتا ہے۔ جب وہ ہوتا ہوا کسی آبشار کے پاس پہنچے تو وہ کشتی کو کئے کر گناہے  
 پر لے جائے اور اس کو گوند سے پراشا کر دیکر نگہ یہ بلی ہوتی ہے اور اس کا وزن سو پونڈ ہوتا ہے  
 اگلی نہریں ہوا ر پانی میں اتار دے جہاں سے اس کا سفر پھر جاری رہ سکتا ہے۔ اگر وہ چاہے تو  
 یہ ضروری نہیں کہ وہ دن رات کشتی ہی میں رہے وہ سب گناہے پر اسے بازو کر اپنی چاہنے یا کافی  
 بنا سکتا ہے۔ وہ آس پاس کے گاؤں میں زمینداروں کے ہاں بطور مہمان ٹھہر سکتا ہے اور ان  
 سے رخصت ہوتے وقت اس کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ اپنی کچاندی کے سٹکوں میں  
 اس مہمان نوازی اور پناہ کا صلہ داکرے جو اسے ان کی طریبانہ چشموں کے شیشے میسر ہوئی، مگر  
 وہ جاتے ہوئے اس مہمان نوازی کی آوازیل ایک فراخ شکر گزار مسکراہٹ اور اچھے مہربان  
 الفاظ سے کر کے اپنے میزبانوں کو ہمیشہ کے لیے دلم کر سکتا ہے۔ اگر تم دیاست کے  
 دہشتانوں کی اصل زندگی کا طعنت اور مہماقی اضطراب کے ساتھ مطالعہ کرنا چاہو تو تم یقیناً  
 اس نہری سفر سے بہتر اور خوش گوار سفر کا طریقہ اختیار نہیں کر سکتے۔ جہاد سے ملک میں

لوگ اس قسم کے خیالات پر بستے ہیں۔ ہم ہیں سے بہت تھوڑے ایسے ہیں جن کو قدرت اور کھل ہوا اور مہموں سے محبت ہے۔ بیشتر انسانوں کے لیے واحد مہم سونے کی کان دہانت کرنے کی مہم ہے اور اس کان تک پانے کے ان گنت پانیوں، بخرونی کی مسلسل گھڑیوں، لالچی اور ضمیر کشی اور زمانہ سازی کی بھیانک دلدلوں میں سے ہی گزر کر پہنچا جاسکتا ہے (ہمارے ملک میں ایک وقت لیا تھا اور دولت مند ہونا ممکن نہیں)۔

ہوا پر لڑائی ہونی مبہم آوازیں مجھے سنانی دیتی ہیں۔ نیچے دھکتے ہوئے سبز گھیتروں میں بونیشوں کے گلے میں گھینٹوں کی دھیمی آوازیں۔ شاید یہ دنیا کی سب سے زیادہ رومانٹک اور خوبصورت آواز ہے گھینٹوں کے بچنے کی آواز، شاید پہلی موسیقی تھی جو انسانی کانوں سے سنی ہے۔ یہ یقیناً عظیم ترین موسیقی ہے جو تم سن سکتے ہو۔ خوشی سے ٹھٹھاتی ہوئی گھینٹیاں، غم اور موت کی آواز اور ہولے ہولے جیتی ہوئی گھینٹیاں، بے سکوت کے وقفوں کے بعد موشیوں کے گلے میں بندھی ہوئی گھینٹوں کی ٹن۔ ٹنٹن۔۔۔۔۔ پھر ناخستہ کی کوڑ کوڑ۔ کوڑ کوڑ آئی۔ تم اس آواز کو ان علاقوں میں دہرے اور سپر کے وقت ہمیشہ سونگے اور اگر تم ویسے ہی آدمی ہو جیسا کہ میں تم کو سمجھتا ہوں (اگر تم ویسے نہ ہوتے تو تم اس مضمون کو شروع سے ہی اگت کر کسی زیادہ پر لطف مشغلے کی خاطر، چھوٹے گلے ہوتے، تو تم مزہ کبھی نہ کبھی اس آواز سے مسودہ ہوتے ہو گے، ناخستہ کی صند جو پرندہ ہے وہ آواز ہے۔ آواز رات کے سناٹے میں بولتا ہے، اس کی آواز میں ایک برائی اور بدی کا شرب ہے اور وہ اجاڑ جگہوں اور مستقبل کی مایوسیوں کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ مگر وہ گلوبندہ گلی ناخستہ کی لاپ میں ایک رفاقت سی ہے، ایک اُمید سی۔ یہ ناخستہ آدمی کی دوست ہے، اور جب ملک مسافر اپنے سفر پر اس رفاقت کی لاپ کو سن سکتا ہے وہ ہانتا ہے کہ اس کے لیے کوئی خطرہ نہیں اور ب

ٹھیک ہے

..... پٹری پر تین عورتیں کپڑے دھو رہی تھیں، ایک بوڑھی اور سن دہیدہ تھی،

اور اس کے سفید چاندی کے پریشان بال ہمایں ڈر رہے تھے۔ ابھی اس کا چہرہ چمک رہا تھا اور چھوڑا نہ ہوا تھا اور ہاؤ گرنی سی ڈنگ رہی تھی جس طرح بہت سی بوڑھی عورتیں گئے گئی ہیں (عمر عورتوں کے بڑے صفت مہلک ہے اور انہیں گھناؤنی ہاؤ گرنیوں میں تبدیل کر کے دم لیتی ہے) — عمر عورت کی مستقل، ہر وقت حاضر و منت دل، دشمن ہے اور اپنے شکار کو یہ جہلت ہی نہیں دیتی کہ وہ اس کی موجودگی بھول جائے۔ خوب صورت فلو پٹر بھی اپنی کشش کھو دے گی، اس کے چہرے پر بھریاں پڑ جائیں گی۔ وہ ایک ہاؤ گرنی کی طرح خمیدہ اور خوفناک ہو جائے گی۔ یہ ایک عورت کا ناگزیر گھناؤنا مستقبل ہے! — دوسری دو عورتوں میں سے ایک نہر کے کنارے پر کھڑے چٹخنے میں مہلک تھی، اور دوسری پٹری کے سرے پر کھڑی، کچھ جھکی ہوئی ایک کپڑا پٹری پر تھی — اس نے مجھے کچھ تجرب، سہی ہوئی فکر دے دی تھی — وہ انیسویں برس کی ہوگی، جسم بھر پور اور ترغیب دینے والا تھا۔ میں نے قیاس لگا یا کہ وہ غالباً اس بوڑھی عورت کی بیٹی ہے۔ .... کیا اس کے مشاغل ہمیشہ اتنے ہی محبوب اور معصوم ہوتے ہوں گے جتنا یہ کپڑا پٹری تھا —

آگے جا کر میں نے اس مسئلے پر زیادہ سوچنا شروع کیا، ایک صدمہ میں وہ کیا چیز تھی وہ کیا کشش تھی، کیسا پیغام تھا جس کی وجہ سے تم اس کو دیکھتے بغیر اور ایک نفس خیال دل میں لائے بغیر اس کے پاس سے نہیں گزر سکتے تھے، کیوں ہمیشہ ہمارے خون میں ایک چھوٹا سا کلام، ایک ننھا سا یہجان پیا ہوئے لگتا ہے، کیوں تہلہ چہرہ کانوں کی لہروں تک سرخ ہو جاتا ہے! کیا یہ کشش صرف جسموں کی کشش تھی یا اس میں دودھ، حوس کے اختلاف طبع کی خواہش مضمر تھی۔ ایک دکنی بڑی نوجوان عورت کو دیکھ کر کیوں تہلہ اداں ایک مبہم سی تھنا، ایک اذلی تنہائی کے احساس سے ہلنے لگتا ہے اور وہ نامعلوم حسرت میں کہ تم اس کو کبھی اپنے بازوؤں میں نہ لے سکو گے، کہ یہ مادہ، تہلہ دے مادے میں کبھی مدغم نہ ہو گا، وہ نامعلوم حسرت کیوں جینے میں

دھویں کی طرح اٹھتی تھی۔

عورت کے جن سے بڑھ کر اور کئی چیزوں کا حسن تھا! — یا فرتی ٹاپو کا حسن، سفید  
بابیلوں کے سے بھاگتے ہوئے ایک جہاز کا حسن، اور نگین شفق کا حسن، سو دج کی سنہری روشنی میں  
نہاتے ہوئے کھیت کا حسن۔ ان چیزوں کے حسن سے آدمی تنگ جاتا تھا اور کچھ دیر کے بعد  
ان سے بے پروا ہو جاتا تھا۔ مگر کوئی آدمی ابھی تک ایک خوب صورت عورت کو دیکھنے  
یا گھورنے سے نہیں تنگ اور دیکھنے میں ایک مبہم تناد ہی ہوتی ہوتی ہے کہ کاش ان کے ماتے  
ایک چوکتے اور اس خوب صورت عورت کا جسمانی تصرف ممکن ہوتا، جہاں سے دلوں میں  
یہ تناد ہمیشہ رہے گی اور ہم سب فحش اور عامی حیوان ہر عورت کی عصمت دہی کرنے  
پر آمادہ رہیں گے۔

پیارے پڑھنے والے! ہمیں گناہ اور جرم کا احساس نہ ہونا چاہیے، قدرت کی طاقتیں  
غیر سے اور پر اسرار طریق پر کام کرتی ہیں اور ایک مرد کا ایک عورت کی طرف کھینچنا اتنا ہی قدرتی  
ہے جتنا کہ بارش سے بھیگے ہوئے ایک فحش پرندے کا اپنے گھونسلے میں گیس کر پناہ لینے کی کوشش  
کرنا۔ میں آزاد اور قدرتی محبت کا وہ کیل نہیں مگر اس کو اس قدر گھناؤنا اور ہوناک نہیں سمجھتا  
جتنا کہ لوگوں کے اخلاق کے لحاظ اس کو سمجھتے ہیں۔ مجھے یوں کہے کہ پندوں اور حیوانوں کے جڑوں  
کی محبت میں کچھ گھناؤنا پن نظر نہیں آتا۔ — مگر لوگوں کے اخلاق کے مناسب بچھتے  
ہیں، تو پھر انسان اور حیوان میں کیا فرق رہ گیا۔ وہ بھول جاتے ہیں کہ انسان ہی محض ایک  
حیوان ہے۔ اور کہتے ہی سماجی اور معاشی قوانین کی قید میں اسے کیوں نہ جکڑ دیا جائے، وہ کتنا  
ہی مہذب کیوں نہ ہو جائے اس کی جہلی حیوانیت مر نہیں سکتی۔ یہی جہلی حیوانیت اصل انسان ہے۔۔۔  
خان بیگ سے روانگی کے وقت میں نے فیصلہ کیا تھا کہ میں اپنا اگلا ٹکریٹ تقریباً اپنے  
سفر کا آدھا حصہ طے کر چکنے کے بعد ہیوں گا۔ اب میں آدھے سفر سے کافی زیادہ طے

کو چکا غنا اور میں نے اپنے آپ سے کہا : اب تم ضمیر کی کس سرزنش کے بغیر اپنا سگریٹ پی سکتے ہو۔ میں سائیکل کو پھڑی کے کنارے ایک سنگ میل کے متوازی سے آیا اور گدی پر بیٹھے بیٹھے اور سنگ میل کے اوپر ایک پاؤں رکھے ، میں نے یہ سترک غرض گزار دو سم سراغِ بام دی ..... سگریٹ کو سلگانے میں سگریٹ پینے کا آدھا حاطف ہے اور لیڈی ٹکٹین کے سچے غلام ہمیشہ سگریٹ کو سلگانے سے پہلے بعض جواب کا لکھا غدار کہتے ہیں ..... وہ اسے محبت سے اپنی انگلیوں میں سہلاتے ہیں ، اس کو ڈبیا پر قفلکتے ہیں اور اس طرح جان بوجھ کر اس سلگانے کے لمحے کی عظیم مسرت کا منتظر کرتے ہیں : لیڈی ٹکٹین : اگر میں شاعر ہوتا تو قہار سے غیت لکاتا : کیا ہوا اگر انسان تندرست نہیں ، کیا ہوا اگر وہ غریب اور تنگ دست ہے اور اسے پچھلے ماہ کا مکان کا کرایہ ابھی ادا کرنا ہے ، کیا ہوا اگر کوئی عورت اس سے محبت نہیں کرتی ۔ لیڈی ٹکٹین تو اس کی ہے ..... اپنے سارے چھوٹے تفکرات ، حقیر و محرومیوں کو تم سگریٹ کے ایک کش میں اڑا سکتے ہو ..... میں نے نیچے سبز کھیتوں کی وسعت پر دھواں اڑاتے ہوئے اپنے سگریٹ کو اطمینان اور سکون سے ختم کیا ۔

میں سگریٹ ختم کر کے پھر روانہ ہوا۔۔۔ ایسا نیکل گھر چنچنیا اے۔۔۔ سر پر کی دھوپ کی تہتاہٹ اور خیرگی اب نہ رہی تھی، اور وہ شام کی سرحد پر گویا دم سے رہی تھی۔۔۔ سامنے ایک گاؤں تھا جو پٹری کے نیچے اپنے کھجور کے جھنڈوں اور آم کے پیڑوں کے جھرمٹ میں دھکا ہوا بے حد دعوت انگیز لگ رہا تھا۔ پٹری کی طرف رخ کئے ایک پختہ اینٹروں کا دروازہ ٹلک مکان تھا جس کے دو رخ دان بچھنے کی آنکھوں کی مانند چوکور اور جالی دار تھے۔ اس کے بغل میں ایک دوضہ تھا جس کا گنبد گرما کے آسمان کا سا نیلا تھا۔ مکان کے صحن میں درختیاں چھڑ چھڑاتی اور کوڑا کوڑائی ہوئی پھر رہی تھیں۔ اس گاؤں میں عجیب سکون اور امن پس رہا تھا، یوں محسوس ہوتا جیسے شاخا سی دروازے کے پیچھے آدمی بھی سرست سے ہلکا نہ ہو سکتا

جے..... دل نے کہا کیا اچھا ہوا اگر میں دھاندلوں کی بستی ہو جہاں تمہیں پہنچنا ہے.....  
مکڑیہ گیا وہ آرڈی مٹی اور مجھے بتایا گیا تھا کہ دھاندلوں کی بستی (یا اسلام آباد) مجھے آرڈی پر مٹی۔

(۳)

میں تھوڑا ہی آگے گیا ہوں گا کہ بائیں طرف آسموں کے بانج میں سے ایک کتا مجھ پر بھڑکتا  
ہوا بھپٹا۔ اس دفعہ میں فورڈ سائیکل سے اتر آیا اور کتا دم دبا کر ساتھ ایک بھاڑی میں جا کر  
پیشاب کرنے لگا۔ میں پھر سائیکل پر سوار ہونے ہی لگا تھا کہ بھڑی کے کنا سے پر میشا ہوا  
چودہ سالہ لڑکا جو عمر کے مقابلے میں بڑا معلوم ہوتا تھا اور جس کے ماتحتوں میں دو تین کتابیں  
تھیں۔ جن پر کپڑے کی جلدیں تھیں۔ وہ اٹھ کر میری طرف بڑھا۔

”اپ ضلع دار صاحب کے دوست ہیں اس نے بہادپور دی میں، کچھ شریں چمکیا ہٹ سے  
پوچھا۔ میرے یہ کپڑے پر کو میں ہی ضلع دار صاحب کا دوست ہوں اس نے مجھے بتایا کہ میں اسلام  
آباد کی بستی مٹی اور یہ کہ وہ دھانڈی بستی سے میری راہ دیکھ رہا تھا۔ میرے دوست کے ان کو  
حیرانے کی اطلاع پڑتا تھا پر سے بھواد دی مٹی اس نے غالباً ان کو اس وقت کا اندازہ نہیں  
دیا تھا۔ جب میں وہاں پہنچ سکوں گا۔ اس لڑکے نے سائیکل میرے ہاتھ سے لی و میرے  
گروہ احتجاج کے باوجود اس کے دائیں ہاتھ میں کتابیں تھیں اور بائیں طرف سائیکل اور  
ظاہراً اسے سائیکل کو تالبریں رکھنے کے لیے وقت ہو رہی تھی۔

”سائیکل مجھے دے دو“۔ میں نے کہا۔

”چھوڑو۔ سائیں؟“ اس نے مسکرا کر کہا۔ خرض اخلاقی سے، دکشی سے اور مضبوطی سے۔

”اپنی کتابیں مجھے دے دو“۔ میں نے کہا۔

وہ اس پر بھی رضامند نہ ہوا کہ ان کا تعان کتابیں اٹھائے۔ مکڑیہ نے اسے یہ بتایا  
کہ میں اس کی کتابوں کو دیکھنا چاہتا ہوں کہ وہ کیا پڑھتا ہے۔ یہ اسے عجیب درخواست معلوم

ہوئی اور اس نے کچھ پس و پیش کے بعد کتابیں مجھے دے دیں۔ یہ کچھ بڑے کی جلد کی بوسیدہ  
رجسٹر ٹانگائیں تھیں۔ ہم اب چٹری سے اتر کر ایک کچڑ ٹڈی پر سے سامنے مکانوں کی  
طرف ہیں وہاں تھے۔

”خلع دار صاحب ابھی نہیں آئے؟ میں نے پوچھا۔

”ابھی نہیں؟“ اس نے ریاستی میں کہا۔ ”ماتیں نے پڑتال پر سے پیغام بھیجا تھا کہ آپ  
(مستان آؤ گے۔) انہوں نے شائع فضل سے آپ کو چھ آرڈی بتا دیا تھا یہ گیارہ آرڈی تھا۔ میں  
اسی لیے نمبر پر آپ کا انتظار کر رہا تھا کہ آپ کہیں آگے ہی نہ چلے جائیں؟  
”انہوں نے کہا: ”اگر تم نہ کھڑے ہوتے تو میں ضرور آگے چلا جاتا۔ تم کو بڑی تکلیف  
ہوئی ہوئی؟“

اس کے ہوں پر ایک شرمیل مسکراہٹ کھیں گئی۔ اسے واقعی انتظار کرنا پڑا تھا۔ مگر  
اس نے کہا۔

”نہیں۔ مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ ہم دیسے ہی دوپہر کے وقت باغ میں بیٹھ کر  
سنا یا د کرتے ہیں۔“

میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ وہ مولوی فقیر احمد صاحب کے طالب علموں میں سے  
ہے۔ اسے یہاں ایک سال ہر چکا تھا اور وہ عربی کی غرضت کو چکا تھا۔ مگر صرف ابھی آدھی ہی  
ہوئی تھی۔

”کیا تم مسافر طالب علموں میں سے ہو؟“

”ان سیرنگٹن فیروزہ ہے۔“

”کتنے مسافر طالب علم یہاں پڑھتے ہیں؟“

”کل تیس مسافر طالب علم یہاں تعلیم پاتے ہیں۔ لیکن اس وقت مدرسہ میں پندرہ سولہ



سے زیادہ نہیں۔ ہائی عزم کی چھٹیوں پر اپنے گھروں کو پہنچے گئے ہیں؟  
اس نے مجھے بتایا کہ یہ مسافر طالب علم اکثر تو نزدیک کے گروں کے رہنے والے  
تھے، مگر ان میں تین چار منظر آباد کے تھے، دو تحصیل مسلم کی خاطر کوٹاٹ سے آئے تھے۔ مولوی  
فصرا اللہ ہی ان کے گھانے کا بیج ہوا۔ اشت کرتے تھے۔ کتابیں انہیں جامع سے مفت ملتا  
لی جاتی تھیں۔

اس نے مجھ سے پوچھا کہ میز گھر کہاں ہے۔ میں نے اسے بتایا کہ میں کراچی میں رہتا ہوں  
اور اب چند دنوں کے لیے اپنے دوست ضلع دار کے ہاں ٹھہرا ہوا ہوں۔ پھر اس نے پوچھا  
کہ کیا میں کراچی میں عزم ہوں اور میں نے جواب دیا کہ میں ایک کمپنی میں عازم ہوں۔ اسے یہ معلوم  
نہ تھا کہ کمپنی کیا ہوتی ہے اور وہ کچھ حیران نظر نہ لگا۔ پھر اس کی ذہین آنکھوں میں ایک  
سوچنا کی روشنی آئی۔ شاید اس نے میری کمپنی کو ایک سرگرم یا کھیل تماشے کی کمپنی سمجھا تھا۔ لیکن  
اس نے وضاحت نہیں چاہی۔ — وہ اس خاک کی تپکوں اور سبز سویٹر والے، دبے نپے پائروں  
ابنیں سے جو کراچی میں رہتا تھا بہت کچھ باتیں پوچھنا چاہتا تھا۔ مگر وہ غالباً ایک نووارد و ممان  
پر اپنے آپ کو زیادہ غور کرنے سے شرماتا تھا۔ میں خود اس سے بہت سی باتیں پوچھنا چاہتا تھا  
لیکن عزم ہوا انگشتوں کا تھکاؤ توں نے مجھ سے چھین لیا ہے۔ میں اپنے ہم جنسوں کے ساتھ کچھ  
بے آسودگی کچھ غمت محسوس کرتا ہوں۔ شرمیلے پن اور ڈک کی ایک موٹی آہنی دیوار ہمارے ذہن  
بیشمار مانی رہتی ہے۔ — مجھے یاد ہے۔ ایک دفعہ ایک بڑے شہر میں جہاں میں تنہا ٹھہرا ہوا  
تھا، میں نے پورا ایک ہفتہ کسی سے بات نہ کی تھی اور ڈرتے ہوئے کہیں مجھ سے طاقت  
گراہی تو نہیں چھٹی ادا چاہا جو ہلا کرنے کے لیے میں اس بڑے شہر کی ایک تنہا جگہ پر گیا اور  
وہاں دیر پر میٹ کر ساتے لڑھکتے ہوئے نپے سمندر سے ایک گھنٹہ باتیں کرتا رہا اور  
میں رویا !

— ایک کچی جھوٹی دیر میں جانے کا راستہ تھا اور اس میں سے ہم یونیورسٹی کے

احاطے میں داخل ہو گئے۔ یہ احاطہ کوئی بڑا درخت مرثعہ تھا اور جا بجا بنیادیں نئے حجروں کے لیے  
کھودی جا رہی تھیں۔ سامنے ایک کھلی آسمان کے بالمقابل چھوٹی مسجد تھی۔ میرا کم عمر ساتھی مجھے  
دائیں طرف ایک کونٹے کی طرف لے گیا۔ ہم اندر ایک بھاری پیناٹک تھا وہ وہاں سے گزرتے  
مکان کی شکل کا تھا اس کے سامنے ایک کچا وسیع چوترا تھا اور چوترا کے نیچے عین میں جنگلی  
خود رو بوٹیاں اور کوڑھتوں کی حکومت تھی۔ مکان میں دو کوٹھڑیاں تھیں۔

میرے ساتھی نے اپنے ایک دوست کو آواز دی کہ ایک پٹنگ نکال کر چوترا سے  
پر بچھا دے۔ اس دوست کی عمر چھبیس سال کی ہو گئی۔ اس کا چہرہ ظالم اور عالمانہ تھا۔ اس  
کی داڑھی ریختی بھوری رنگت کی تھی، اس کے سر کے بال ”چھتے“ اور ”تھے“ اور ریاستی رواج کے  
مطابق چھپے سے گزرتے ہوئے تھے۔ وہ کوٹھڑی کے اندر سے ایک قراڑ کا پٹنگ اٹھا  
لایا اور اسے چوترا پر میرے لیے بچھا دیا۔

”آدم فرمائیے۔“ اس نے ایک چونکا دینے والی خوش خلقی سے کہا۔ یہاں طالب علموں  
کو حدیث اور فقہ، صرف و نحو کے علاوہ پرانی عرب خوشش اخلاقی کی بھی تعلیم دی جاتی  
تھی۔ — !

مجھے پٹنگ پر بیٹھے چند منٹ ہی ہوئے تھے کہ وہاں سے ایک شخص اندر

داخل ہوا۔

— ایک شخص جو یہاں کے زمینداروں کا عام لباس، ایک ڈسلی کرتہ اور چادر

پہنتے ہوئے تھا، جو مضبوط گھٹے ہوئے اعضا کا تھا۔ سب دین دار آدمیوں کی طرح اس کی  
چھٹ پٹا پر ساہو اور گول مٹول تھا۔ مگر یہ پیٹ اس آدمی کا حجتہ معلوم نہ ہوتا تھا۔ جسمانی  
ساخت میں وہ مجھے ایورڈسٹ کی اس مشہور تصویر میں دجہاں ایورڈسٹ سے ہوئے سکول ماسٹر

سے یہ کہہ رہا ہے، 'مکتوٰۃ اور شوبہ' سکول ماسٹر مسٹر کی یاد دلاتا تھا، اس کا چہرہ قراخ تھا جس سے ایک کھیتوں کے آدمی کی سادگی ایک جنگی علامت اور ایک قد قیامت کا پتہ ملتا تھا۔ ایک ہلکی سیاہ داڑھی اس کے گول چاند سے منہ کو ایک سیاہ ہالے کی طرح گھیرے ہوئے تھی۔ ہونٹ موٹے اور حساس تھے، آنکھیں روشن اور ذہین اور میرے لیے خوش آمدید سے لبریز ..... اس کا چہرہ ایک بہت ذہین اور انٹلیجنٹ آدمی کا چہرہ تھا۔ مگر اس میں کٹافٹ یا مذہبی جنوں کا نشانہ نہ تھا۔ روحانی اطمینان اور سکون اس کی پیشانی پر دیر حروف میں دم گئے اور موٹے ہونٹوں کی حساسیت بتاتی تھی کہ اسے خدا کی اچھی چیزوں سے حق اٹھانے سے بھی حاد نہیں اور یہ کہ ان نعمتوں کے لیے اس کے دل میں ماسوا شکر کے اور کچھ نہیں۔

یہ شخص مولوی فقیر اللہ تھا۔ اس مدرسہ کا بانی پرنسپل، اس کے اخراجات کا واحد کنین۔ اس کا ہم بڑا تھا اور اسی طرح اس کا دل بھی بڑا تھا۔

اس نے گرجاؤں سے اور سردار آنکھوں سے میاں کے رواج کے مطابق میرے ہاتھ کو دو ہاتھوں میں لے کر مصافحہ کیا۔ اس نے مجھے بیٹھنے کے لیے کہا اس کے طالب علم اندر سے اس کے لیے ایک اور چارپائی لے آئے اور مولوی فقیر اللہ اس کے درمیان میں آگے جھک کر بیٹھ گیا۔ اس کے شاگرد بھی مولوی صاحب کے ساتھ چارپائی پر بیٹھ گئے۔ وہ مولوی فقیر اللہ کا بے حد احترام کرتے تھے۔ اس سے ایسا ہی ڈرتے تھے جیسا کہ کوئی سنت استاد سے ہی ڈر سکتا ہے۔ اس کے باوجود مولوی فقیر اللہ کے مدرسہ میں جمہوریت تھی۔ استاد شاگرد و آخر ایک کنبہ ہی تو تھے۔ آپس میں علم و محبت کے مضبوط رشتے سے منسلک۔

اس نے مجھ سے خوش خلقی سے خیریت پرچھنی وہ باطل خاص ریاستی معلوم نہ ہوتا تھا اور عجیب طور سے اس کے کئی الفاظ اور بے دہیہ گجرات اور جنگ کی یاد دلاتے تھے ماس کے تھ سے میرے پیشے وغیرہ کے متعلق پوچھا، میں نے ہلکے پاتے ہوئے اس سے اس کے درس



فقیر اللہ کا اپنا طالب علم تھا جو ناز پڑھنے والوں کو ناز کے لیے بلاتا تھا۔ مولوی فقیر اللہ نے ناز کے لیے اجازت چاہی وہ اور اس کے شاگرد چلے گئے اور میں اکیلہ رہ گیا۔ میرے ضمیر نے ایک ہلی سی علامت کی۔ کب تک، کب تک تم خدا سے بھاگتے رہو گے.....  
مگر میں ہانگ پر بیٹھا رہا۔ خدا کی محبت کی مزاحمت کرتا ہوا..... افسوس! افسوس میں ایک لکھی اور عہد بن گیا تھا، خدا کا وعدہ کا ہوا، دہندا ہوا..... مگر اس کی رحمت کے پٹ کھلے تھے اور میں اب بھی اس کے قدموں میں جا سکتا ہوں۔ اب بھی اس کے صفوں کی جیک ٹانگ سکتا ہوں..... وہ وقت شاید ابھی نہ گیا تھا۔

میں سڑ میٹر بھاگ کو پڑھنے لگا..... مگر پیشتر اس کے کردہ سیانا اور خوش مذاق انٹریزی مصنف نے یہ بتا سکتا کہ روبسبری (ROBESBBERIE) بظاہر اس قدر معمولی اور منفی طبع پر غیر موثر سردار ہونے کے باوجود کس طرح فرانسیسی انقلاب کا پہلا لیڈر بن گیا، میرا دوست مولوی فقیر اللہ کی محبت میں میرے سر پر کھڑا مسکرا رہا تھا۔

میں نے اپنے آپ کو اس کی آمد پر کتنا آسودہ اور مسرور محسوس کیا۔ ایک بوجھ میرے کندھوں پر سے اٹھ گیا۔ گفتگو میرے لیے ایک کشش ہے، ایک اذیت۔ اب میں بغیر کسی پریشانی یا الجھن کے منہ میں گفتگیاں ڈال کر بیٹھ سکتا تھا اور گفتگو کی ذمہ داری کلمہ اپنے دوست پر ڈال سکتا تھا۔ میرا دوست شاید دنیا کا بہترین انٹرو گتنگو کرنے والا ہے۔ اگرچہ باہر وہ خاموشی کے چلنے والی وقفوں کا ناٹھ ہے۔ ہم اندھیرا پڑتے ملک بیٹھ مولوی فقیر اللہ کے مد سے اور زمینوں کی باتیں کرتے رہے اور کچھ وقت کے بعد جب مولوی فقیر اللہ..... کسی کام کے لیے چلا گیا تو میرا دوست مجھے لکھی سے باہر یونیورسٹی کے احاطے میں لے آیا۔

یہ ایک دیستہ راستہ تھی محرم کی تیسری کا چاند ایک زردی درانقی کی طرح تاریک فنی

آسمان میں معلق تھا۔ اس کی دھماکی زدہ میں ایک سفید چٹان تیار ہو کر اڑا تھا۔ مولوی فقیر احمد کاغذیابا کو شاہ مسجد، ارد گرد طالب علموں کے جھڑپوں، دھم اور پراسرار کھیتوں کی وسعت میں، ایک نیلے جھپٹے کا مات اور ڈھے خاموش پڑے تھے۔ ہم چلتے ہوئے اعلیٰ کی کچی چھٹی دیوار کے پاس آکھڑے ہوئے۔ اس سحر زدہ وقت میں ایک مریضی کے گلے کی گھنٹی کی ٹنٹن ٹنٹن کی آواز آتی دُور کھیتوں سے۔

میرے دوست نے کہا، تم جانتے ہو دنیا کی سب سے اچھی اور خوب صورت آواز کونسی ہے؟

”کونسی؟“ میں نے پوچھا، بالکل معصوم بن کر، اگرچہ میں جانتا تھا کہ وہ کیا کہنے لگا ہے۔ میں اس کو مایوس نہیں کرنا چاہتا تھا۔

”یہ مریضیوں کی گھنٹیوں کی آواز ہے۔ یہ دراصل جھپٹے کا راگ ہے۔ جب نہ ہی اندھیرا ہو اور نہ ہی روشنی۔ اس وقت اس آواز میں بڑی کشش ہوتی ہے؟“

ہم کچھ دیر خاموش کھڑے رہے۔ اچانک میرے دوست نے جو کچھ سوچ رہا تھا مجھے کندھوں سے پڑ کر اپنے سامنے کھڑا کیا اور بڑے جوش سے کہنے لگا: تم نے بڑی بڑی ریویڑیا دیکھی ہیں جہاں ہاکر جہادے لڑکے والہ بن کے ہزاروں روپے خرچ کرتے ہیں، جہاں پروفیسر بے نامہ مضامین پر خشک دٹے ہوئے ٹیکر دینے کے عوض ہزار روپے تحفہ پاتے ہیں..... ہم زندگی کے ہر وہ چند سال انگریزی زبان کے سیکھنے میں ضائع کرتے ہیں مگر کیا ہم انگریزی سیکھتے ہیں؟

ہم میں سے کتنے ہی سارے پاس کرنے کے بعد انگریزی ادب یا شاعری کی کوئی کتاب بھی اٹھا کر دیکھتے ہیں اور جس قسم کی انگریزی ہم سیکھتے ہیں، تم جانتے ہی ہو۔ یہ یونیورسٹی جس میں اب تم کھڑے ہوئے ہو ایک مختلف قسم کی یونیورسٹی ہے۔ اسی قسم کی یونیورسٹیوں میں جہاں

آباد و اجداد کے تعلیم کی روشنی پانی تھی اور فارسی اور عربی زبانوں میں قابلیت اور دسترس حاصل کی تھی۔ تمہارے دادا نے آخر قصیدہ بردہ کی عربی میں شرح لکھی ہے اور فارسی زبان میں کتنی ہی نقلیں لکھی ہیں۔ بے شک ہمارے نزدیک جو کچھ پرانے طرز کے متروک لوگ تھے جن میں اب ہم سوسائٹیکڈ، نوجوانوں کو تنصیح کے پہلو نظر آتے ہیں مگر وہ دراصل کیریکچر کے لوگ تھے اور ہمارے یونیورسٹیوں کے ٹیچرز بڑے چھوٹے۔ لکھو کچھ نوجوانوں کی طرح نہیں تھے جن کی دلوں میں خون کے بجائے پانی ہے..... اور پھر ادب، ادب ہے خواہ وہ انگریزی ادب ہو یا عربی ادب یا فارسی ادب، ادب کا شوق اور مطالعہ ہمیشہ صحیح انسانیت پیدا کرتا ہے اور ادب کا طالب علم خواہ وہ لندن میں ہو یا اسلام آباد میں کبھی کوئی کینڈیا موزی کام نہیں کر سکتا۔ اب اس شخص مودی فیئر لڈ کو لکھو۔ وہ ذیلداری کی خاطر افسران بالا کے پیچھے نہیں بھاگتا پھر تازہ ہی سرنگھ بننے کی خواہش ہیں۔ چنانچہ افسر کو دوسرے درجہ نذرانہ دینے کی فکر میں ہے اس کی فتور ڈی بہت زمین ہے جس کی آمدنی وہ کلم اس دوسرے پر صرف کرتا ہے۔ اس میں اس کی کوئی ذاتی غرض شامل نہیں۔ وہ شین نہیں جگھاتا مگر اس نے دنیا کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا ہے۔ وہ خاموشی سے، دیانت سے اپنا کام کر رہا ہے۔ اس کی آنکھوں میں روشنی دیکھو! اس کی امید، اس کا حوصلہ، اس کی ہمت..... اس کے اپنے دوس کے لیے اس سے بھی زیادہ بلند ارادے ہیں۔ روپے کی قلت کے باوجود وہ اس یونیورسٹی کی وسعت کے متعلق سوچ رہا ہے اس سارے احاطے میں طالب علموں کے لیے جگہ بنوا رہا ہے۔ جوں جوں روپیہ آتا ہے، عمارت پر صرف کرتا جاتا ہے..... اس علاقے میں ہزاروں مشکل آدمی چڑھا لکھا ہو گا ایسے گناہ گاروں میں شہروں سے دور، جہالت اور توہمات کے اس گہوارے میں، ایسا دس تا مگر نہا اور اپنی ساری پونجی اس پر لگا دینا یقیناً ایک عظیم آدمی کا کام ہے۔ یہاں کے پڑھے ہوئے طالب علم اپنے اپنے گھروں میں جا کر علم کا دیا روشن کریں گے۔ غالباً تم کچھ اور سوچ

رہے ہو۔ تم سن تو رہے ہو کہ انہوں نے کیش اور بائرن کو نہیں پڑھا۔ انہوں نے کارل مارکس کا نام نہیں لکھا اور وہ بڑی اشتراکی بغاوت سے بیگانہ ہیں؟ عجیب فرد ہے، میں یہی سوچ رہا تھا۔

اتنے میں مولوی فیقر اللہ بھی وہاں آگیا اور میں اپنی یونیورسٹی کی توسیع کے متعلق اپنی سکیم اور ارادے بتانے لگا۔ ایسے ہی لوگ ہیں جس نے سوچا "جو اخلاقی خلوص اور بے غرضی سے عملی کام کرتے ہیں وہ وہ لوگ انہیں لائیں گے۔ مگر وہ لوگ ان کو طاقت اور تندی بخشنے والے انہی کے مضبوط شانے اور طاقت ہوں گے۔ اور وہ کس قدر پرسکون اور محفوظ معلوم ہوتا تھا۔ جس طرح اس کے کام کرنے کے لیے ساری ابدیت پڑی ہو، جیسوی صدی کی جبلت، ہمارا ذہن بے سکونی کی کیفیت اسے چھوڑ نکالے گی۔

"انشاء اللہ خدا کی مرضی ہوئی تو رفتہ رفتہ سب کام ٹھیک ہو جائے گا؟ اس کی دہمی "سبھی" آواز میں ایک اتفاقاً صبر، تحمل اور توکل تھا۔

اس نے بتایا کہ نئے ہجرے آہستہ آہستہ بن رہے ہیں جس وقت فصل سے کچھ دوسرا آتا ہے اس کا کچھ حصہ اس کام پر لگا دیا جاتا ہے اور بہت سے طالب علم خود تعمیر کے کام میں دروہیتے ہیں۔ اس وقت آمدنی کے مطابق تیس سے زیادہ مسافر طالب علموں کی گنجائش نہ ملتی پھر بھی وہ کسی علم کے بھکاری کو اپنے دروازے سے دایرہ میں نہیں لٹا جاتا تھا۔

میں نے پوچھا "کیا طالب علموں کے پڑھائی کے اوقات مقرر ہیں؟" اس نے کہا "ہم گھڑی کے ساتھ وقت کی پابندی تو نہیں کرتے، ہاں صبح کی نماز کے بعد ہی درس تدریس کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اندازاً بارہ سے ڈیڑھ دو تک چھٹی ہوتی ہے۔ جس کے بعد پھر جانچے نیچے تک تدریس ہوتی ہے؟

"طالب علم نارنج وقت میں کیا کرتے ہیں؟ میں نے پوچھا۔



”خدا بخ وقت ان کے پاس بچتا ہی نہیں۔ شام کے کھانے اور عشا کی نماز کے بعد وہ دس سے تین بجے رات تک مطالعہ کرتے اور اپنے سبق و ہن ثنیں کرتے ہیں۔“  
میرے دوست اور میں نے اس پر احتجاج کیا۔

”صرف تین گھنٹے فینڈ۔ یہ تو بالکل ناکافی ہے۔ آپ کم از کم ان کے بیسے چھ سات گھنٹے فینڈ ضرور وقت کرو دیجئے۔“  
”اں ان کے بیسے کافی ہوتی ہے۔“

مولوی فقیر اللہ اپنے انضباط کی سختی میں نرمی پیدا کرنے کا رادادار نہ تھا اور اُسے یقین تھا کہ ایک معقول آدمی کے لیے چار ساڑھے چار گھنٹے فینڈ کافی ہوتی ہے۔ دراصل عربی صرف دعو ہے حدیث اور حقائق کا کام ہے۔ علم جان جو کھوں کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا ہم نے خود اپنے زمانہ طالب علمی میں ایسا ہی کیا ہے۔“

میرے دوست نے مولوی فقیر اللہ کو سمجھایا کہ زیادہ فینڈ سے لڑکے صبح کے وقت تازہ دم اٹھیں گے اور کام کے وقت بہتر کام کر سکیں گے۔ اس صورت میں وہ اپنا سبق میں جلد یاد کر سکتے ہیں۔ مولوی فقیر اللہ نے وعدہ کیا کہ وہ اس بارے میں اپنے قواعد کو کچھ ڈھیل دینے کے بارے میں کچھ سوچے گا۔ میرے دوست میں لوگوں کو اپنے نظریہ پر پھیلانے کے لیے آنے کی طاقت بدرجہ اتم ہے۔

ہم واپس آئے۔ چار پائیاں اب اندر کو ٹھہری میں سمجھا دی گئی تھیں۔ اور ایک ”بھڑی“ واڈھی والا لٹرا طالب علم ایک طاقتور میں رکھے ہوئے دپے کو روشن کر رہا تھا۔ یہ عمدہ بخشش میرا خاص شاگرد ہے۔“

مولوی فقیر اللہ نے کہا: یہ مجھے بڑا پیارا ہے۔ یہ ہر ایک کی خدمت کرتا ہے۔ یہ میرے درس کا خادم ہے۔“

ہم ابھی بیٹھے ہی تھے کہ دوسرا حدیث مولوی غلام رسول لگیا۔ وہ پاس کے ایک گاؤں اللہ آباد میں جو اتفاق سے وہ جگہ ہے جہاں میں نے پہلے پہل اس دنیا میں آنکھیں کھولی تھیں کسی کام کے لیے گھوڑی پر گیا ہوا تھا۔ اس نے باری باری خوش اخلاقی سے ہماری خیریت پوچھی۔ دو ہاتھوں سے مصافحہ کر کے وہ اپنا ایک ہاتھ سینے پر لے جاتا اور پھر کہتا: خیریت سے ہیں..... الحمد للہ.... خود کا شکر ہے۔ یہ سچے سچے جملے شاید کسی حدیث کے حوالے سے تھے جس میں سچے مسلمان کو وہ آداب سکھائے گئے تھے جو ایک جہان کی خیریت پوچھتے وقت بروئے کار لائے جائیں۔ اس کا خیریت پوچھنے کا مبالغہ آمیز انداز دلکش تھا اور پھر محض اس اور جہان کو ایک گونا مسرت اور اطمینان کا احساس ہوتا تھا کہ دنیا میں کم از کم ایک ایسا شخص ہے جسے اس کی روحانی اور جسمانی صحت کے بارے میں اس تدریجی اور ترقی دہے..... یہ ایک آرٹ ہے جو بدقسمتی سے ہندو دنیا میں ناپید ہے۔

مولوی غلام رسول، مولوی فیض محمد کا پراٹا شاگرد اور اب اس کا دوست ماستر، ایک وحشی طبیعت اور پھر یہ بے بدن کا شخص تھا۔ اپنی گھڑی اور واسکٹ میں وہ منسل شہنشاہوں کی تصویروں کی یاد دلاتا تھا اور اس وقت کے ایرانی مصوروں کے لیے جہاںوں یا شاہ جہان کے ماڈل کا کام دے سکتا تھا۔ یہ مشابہت اس وقت بے حد نمایاں ہوتی جب اسے ساڈ سے دیکھا جاتا۔

قبیلہ چارپائی پر فلکڑا محمد بخش اور دوسرے نین طالب علم بیٹھے دئے کی بجلی مدم لومیں اپنی زوہیا سنے ہنستے دلق والی کتابوں کی آنکھوں سے لگائے اپنے سبق یاد کر رہے تھے.... وہ اصل یہ ان کی کوٹھڑی تھی جہاں ہم نے تصرف بجایا تھا۔

میرے دوست نے ان سے باتیں کرنا شروع کیں۔ وہ تندہت چھلکیے لوگوں کی طرح کوئی تفریح کرنا چاہتے ہی تھے۔ وہ اس نشریہ کے لیے ایک قطار میں چارپائی پر سے ٹانگیں ٹکا کر

بیٹھ گئے... میں وہ گنگو، جہاں ملک بے یا وہے یہاں درج کرنے کی کوشش کروں گا۔ تاکہ پیار سے پڑھنے والے بچے کو یہ اندازہ ہو سکے کہ کیسے طالب علم یہاں تحصیل علم کے لیے آتے ہیں اور یہاں آکر وہ اپنی تعلیم اور یہاں کی زندگی کو کیسا پاتے ہیں۔

پہلا نمبر لکھنے کے بعد غرض کا تعالیٰ سوسے دوست نے چار پانی پر بیٹھے بیٹھے اس سے سوال کیا: (یہ تمام گنگو ریاستی زبان میں ہوتی رہی)

”آپ کا نام کیا ہے؟“

”موسا بن محمد غرض“ (محمد غرض اور اس کے ساتھیوں کی دبی ہوئی ہنسی)

”کس جگہ بیٹھے ہو؟ (کہاں کے رجنے والے ہو)

”دھاکھوٹ سائیں“ (دبی ہوئی ہنسی)

”آپ کا باپ کیا کام کرتا ہے محمد غرض“

”سائیں کچرے بنتا ہے۔“

”اب آپ کیا پڑھ رہے ہیں؟“

”پندرہ نامہ۔“

”کتنی پڑھا ہے؟“

”چھ بیان پڑھ چکا ہوں۔“

ایک دوسرے سوال کے جواب میں اس نے بتایا کہ وہ بیس سطریں روزانہ سبق لیتا ہے

اور اسے یہاں آتے تباہ و عرصہ نہیں ہوا تھا۔

”تعلیم حاصل کرنے کے بعد آپ کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں؟“

”چپ۔“ (اس کے ساتھیوں کی دبی ہوئی ہنسی۔ وہ لہجے آہستہ سے کہنی مار کر کہاتے

ہیں: ”تباہ و عرصہ غرض“) مولوی غلام رسول نے ہنستے ہوئے کہا: ”مسجد کا مٹا بنے گا اور کیا۔“

محمد بخش کے ساتھ بیٹھے ہوئے اس۔ چکیلے ٹڑکے نے جو مجھے نر سے لایا تھا اپنے ساتھی کی طرف اشارہ کرنا دیکھ کر اس کی بجائے جواب دیا۔

”سائیں میں بتاؤں یہ کیا کرنا چاہتا ہے۔ اس نے ایک دفعہ مجھے بتایا تھا یہ دوکان کھولے گا۔“  
 ”بہت چغلیوز“ منگولے محمد بخش نے کہا۔ ”دوکان ناو دوکان! نہ سائیں میں دوکان نہ کھولوں گا۔“  
 ”اس نے مجھے بتایا ہے کہ یہ دوکان کرے گا۔“ چکیلے ٹڑکے نے کہا۔

میرا دوست بولا: ”بھئی محمد بخش! دوکان کھولنا کرنی بری بات تو نہیں۔ بہت اچھی بات ہے۔ میں خود ایک چھوٹی دوکان کھولنا چاہتا ہوں۔ اچھا تم دوکان نہیں کھولو گے تو بتاؤ تم اہل کیا کرنا چاہتے ہو؟“

منگولے محمد بخش نے کچھ تامل سے جواب دیا سائیں میں پڑھتا ہوں گا۔“  
 اس پر اس کے ساتھی گنگھیاٹے اور ہم سب ہنسے مگر میرے دوست نے کہا: ”اس سے اچھی بات تو دیکھا ہے کہ آدمی پڑھتا ہی رہے۔ علم ہی حاصل کرتا رہے۔ ساری عمر“  
 ”میں نے اپنے تعلق سوچا، میں نے بھی ایسا ہی کرنے کی کوشش کی تھی مگر انجینئرنگ کے آخری سال میں دوبارہ میں ہونے کے بعد میں نے ہمت ہار دی تھی اور قیصری بار پاس ہو کر فارغ التحصیل ہو گیا تھا۔“

”محمد بخش تم نے گاڑی دیکھی ہے؟“

”سائیں ایک دفعہ بھین میں دیکھی تھی۔ جب میں چھوٹا سا تھا۔“

”کیا تم اس پر چڑھے تھے؟“

”کوئی نا سائیں!“ (نہیں سائیں!)

”اچھا یہ بتاؤ گاڑی کیسی ہوتی ہے اور کیسے چلتی ہے؟“

محمد بخش نے سوچ کر کہا: ”سائیں لال رنگ کی ہوتی ہے اور نیچے پینٹ ہوتے ہیں۔ اور

اندراجا تبھیٹھنے کی بجائیں ہوتی ہیں آگے سائیاں ایک کالادھوت اس کی گھنٹی ہے۔  
میں نے پوچھا کہ انہوں پر چلتی ہے مگر گرتی نہیں۔ آخر کیوں چہیں گرتی؟ اور عجیب بات ہے  
کہ اس رٹکے نے جس نے گاڑی تھا بنا اس وقت دیکھی تھی جب وہ چار پانچ سال کا ہو گا۔ مجھے اس  
کی ٹھیک وجہ بتا دی۔

مولوی فقیر اللہ جو ہمارے ”تروت“ میں گئے ہوئے تھے اب آکر اپنے شاگردوں کے  
درمیان بیٹھ گئے۔ میرے دوست نے انہیں بتایا ان کا شاگرد محمد بخش کہتا ہے کہ وہ ہمیشہ  
پڑھتا ہی رہے گا۔

مولوی فقیر اللہ بوسے ”محمد بخش کی میں آپ کو بات سناؤں۔ یہ چمک جنداں پر اُٹری  
اسکول میں پڑھتا تھا اس کے باپ کا خیال تھا کہ یہ میٹرک یا ایف۔ اے ویزہ ہو کر کہیں ماسٹری اور  
کلر کی کر کے اپنی روزی پیدا کرے گا۔ مگر محمد بخش نے انگریزی پڑھنے سے انکار کر دیا۔ ماسٹر نے  
سمجھایا اور پشیمان، اس کے باپ نے بہتر اسرار اٹھا اس نے صاف جواب دے دیا کہ میں انگریزی  
نہیں پڑھوں گا۔ آخر جب انسپکٹر صاحب آئے تو اس کے باپ نے ان سے کہا کہ محمد بخش انگریزی  
نہیں پڑھتا اسے سمجھائیں۔ وہ بھی بہتر ازور راتے رہے۔ آخر انہوں نے مجھے بلوایا سمجھایا اور فرمایا  
کہ آپ اس کو سمجھائیں کہ انگریزی پڑھنا گناہ نہیں اور اس میں کوئی ہرج نہیں۔ انسپکٹر صاحب  
اور میں نے اس سے پوچھا: حتم کہ انگریزی پڑھنے میں کیا اعتراض ہے۔ یہ جواب دیتا ہے: سائیں  
وجہ یہ ہے کہ انگریزی الٹی زبان ہے اور الٹی لکھی جاتی ہے اور خدا کی... زبان سیدھی لکھی جاتی  
ہے اس لیے یہ شیطانی زبان ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ اگر میں حضرت محمد رسول صلعم کا نام  
انگریزی میں لکھوں تو وہ نفوذِ بائبل کا لکھا جائے گا، انسپکٹر صاحب اور مجھ سے اس منطق کا  
کوئی جواب نہ بن پڑا اور ہم نے فیصلہ کیا کہ اسے مجبور نہ کیا جائے جو اس کے جی میں آئے کہے۔  
ایک روز یہ خود ہی میرے مکان پر ایک مسافر طالب علم کی حیثیت سے آکر ٹہرا ہوا اور میرے

پاس اتنا خرمدن تھا کہ اسے واپس لوٹوں۔ مگر بخش اسٹریٹ جہانے کا پانی گرم کر دیا۔  
 اور یہ مدرسے کا فکرمند خادم جس کے چہرے پر ہمیشہ خوشی اور تندرستی کی تمامت برحق  
 تھی نوراً اپنے استاد کی فیصل میں تھا۔ اس نے صحن میں سے کھڑکیاں جمع کر کے چوتھے پرانے  
 جلائی۔ چائے بنانے میں دوسرے طالب علموں نے اس کی مدد کی اور ماسٹر غلام رسول اور  
 نور مولوی فقیر اللہ نے بھی ہاتھ بٹایا۔ تم جان سکتے ہو وہ چائے جس کی تیاری میں اتنے  
 آدمیوں کا دخل ہوا، منہ ہو کیسی چائے ہوگی۔ یہ وہ مہذب چائے نہ تھی جو پانچ منٹ  
 میں تیار ہو جاتی ہے اور جس میں دو سو کی ایک بوتل اور دھنی کے دو چھپے ٹاں کو صحن میں اندر لے  
 لیا جاتا ہے۔ یہ چائے دو سو میں پکانی گئی اور ابھی دھنی آگ پر تھی کہ برد کھانڈ اس میں چھپوں میں  
 نہیں بلکہ مٹیوں میں ڈالی گئی۔ جو کھانڈ اس کے پکے میں لگا اور جب وہ تیار ہو گئی تو ماسٹر  
 غلام رسول کتلی کا خاکہ امداد سے آیا اور اسے چھوٹے چھوٹے ٹیٹے کے گلاس میں ڈال کر میں  
 پیش کرنے لگا۔ میں نے پانچ گلاس پیئے۔ یہ بے حد لذت تھی، بے حد بھٹی اور لاپائی کی خوشبو نے  
 اسے ایک ایسا مشروب بنا دیا تھا جو شاہزادوں کے پیئے کے لائق ہے۔ مجھے معلوم ہے وہ لوگ جو  
 اپنے خیال میں اصل چائے پیئے ہیں اس دہقانی چائے پر ”برتری“ کے..... انداز  
 میں جنسیں گے۔ مگر میں ان کو بتا دوں کہ جہاں ان کی چائے ان کو بے خوابی اور منجھوڑے ہونے  
 ا مصاب دیتی ہے، یہ چائے اپنے پیئے والوں کو صحت دیتی ہے۔ اور مگر لچھ کی ہی جیو کیسی لذت  
 چائے تھی وہ اور وہ پیل میں مدغم دیکھ ہوئے ”بے نقص“ جہاں نواز دہقان! ان کی سادہ  
 پُر مذاق گفتگو، فیسری کا چاند و دوازے کے باہر ایک مفید خبر کی طرح چمکتا ہوا۔ کیا آدمی کا دل  
 اس سے بہتر اور کچھ اپنے ملک سے مانگ سکتا ہے!

کھانڈ کے بعد جو چٹیل کے بڑے متعدد دست پچنے میں مرزا کے سالن اور تنور کی روشنیوں پر  
 شعلہ نما، ہماری مولوی فقیر اللہ سے اس کی پھیل زندگی اور مدرسے کے تعلق کچھ اور باقی ہوئی۔

کھویا ہوا حق

اس نے یہیں بتایا کہ وہ لڑکا بھی تھا کہ تعلیم کے شوق میں گھر سے نکل گیا اور مختلف درس گاہوں میں پھر پھر ان کی تحصیلِ علم کرتا رہا۔ دو پہلے طاعی شریفین میں رہا۔ وہاں سے وہ سرہند شریفین گیا اور وہاں سے گجرات شریفین و گجرات شریفین کے مدرسۃ الاسلامیہ میں وہ وہاں کے معلمِ حضرت مولانا ارشد علی کی تعلیم میں آٹھ فوسال رہا۔ مولانا مولوی ارشد علی صاحبِ خدا کے برگزیدہ بندے تھے اور فقہ اور حدیث میں عالمِ مجتہد تھے۔ ان کا وہ کھانا بھی خود ہی پکاتا اور ہر وقت ان کی خدمت میں رہتا۔ وہ بھی اسے بے حد عزیز رکھتے تھے۔ رخصت کے وقت انہوں نے اسے دعا دی۔ ”جافقیڑا نیزی زندگی خدا کی راہ میں وقت ہوگی“ وہ واپس اپنے آباؤ اجداد کی دھاندلوں والی بستی میں کوئی بارہ سال کے بعد لوٹا۔ یہاں اسے اپنی بستی میں اپنی جیوار والدہ کا آخری دیدار نصیب ہوا۔ ان کی وفات کے بعد اس نے یہاں اس درس و تدریس کا کام شروع کر دیا۔ جس کو جاری ہونے اب پچیس برس ہو چکے تھے۔ وہ تین بیٹائی ہیں۔ ان کی مشترکہ زمین ایک سو پچاس بیگھے ہے جسے انہوں نے تقسیم نہیں کیا۔ اور اس میں سورت سو بیگھے زمین ایسی ہے جو قابلِ کاشت ہے۔ باقی کل زمین ہے اور اسے بانی بھی نہیں پہنچ سکتا۔ اسے خود تو درس و تدریس اور عام مدد کے کام سے فرصت نہیں ملتی اس لیے چھوٹا بیٹائی زمین کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ سب سے چھوٹا بیٹائی اس مدرسہ میں طالبِ علم ہے رچے بکھنت نکلے ہے اور خرچ اخراجات بشکل جو توڑ کر پورے کئے جاتے ہیں۔ مگر انشاء اللہ خدا بہتر ہی کرے گا۔ یہاں دس سال کے طالبِ علم کو فقہ، حدیث اور دینی تعلیم میں اتنا کچھ پڑھا جاتا ہے کہ اور کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ مدرسے نے پچھلے سال تین طالبِ علم تیار کر کے خیر المدارس مئتان شریف میں بھجوائے ہیں جو اگلے سال کامیاب ہو کر اور علامہ کی مدد حاصل کرنے کے بعد یہاں تدریس میں باقاعدہ شامل ہوں گے۔ پھر کام زیادہ باضابطہ ہو جائے گا۔“

میرے دوست نے پوچھا ”مولوی صاحب! اسلامی قوانین کیا آپ کے خیال میں موجودہ زمانے میں کامیاب ہو سکیں گے؟“

مولوی فقیر اللہ نے جواب دیا: ”کیوں نہیں اللہ کے قوانین ہر زمانے اور ہر وقت کے لیے ہیں۔ ان میں کوئی تبدیلی نہیں آ سکتی؟“

اس نے جیس بنایا کہ وہ مولوی مولوی صاحب کی جماعت اسلامی کا باقاعدہ رکن تو نہیں مگر اس جماعت اسلامی والوں کے طمع نظر سے اسے کوئی اختلاف بھی نہیں۔ جماعت کا اخبار ”کوثر“ یہاں باقاعدہ آتا ہے اور جمعیت العلماء نے جند کا اخبار ”الجمیۃ“ بھی۔ مولوی فقیر اللہ، مولانا ابراہیم آزاد اور دیوبند کے مولوی حسین احمد مدنی کا نام ادب اور تعظیم سے لیتا تھا۔ وہ دونوں، اس نے کہا، عالم متبر ہیں۔

یہ ریاستی و جنتان عالم جس کا عربی فقہ اور حدیث کا مطالعہ وسیع تھا، جو جسم طہانیت اور وضو تھا، جو فلاو کے مجھے کی طرح شمس اور دن کی طرح ایسا تیار اور بے باک تھا۔ چمکے شریعے حلیہ انداز سے اور ریاستی لمبے میں بولی چوٹی اور دو میں ہمارے سوالات کا جواب دے رہا تھا۔ کھلی جواؤں اور صانع خوداک کے بنے ہوئے مضبوط پٹے والا یہ شخص بد باری، جسٹس خوش اخلاقی اور جہان فراموشی کا یہ چٹلا۔ رسول عربی کا مذہب صرف ایسا ہی شخص دنیا میں پیدا کر سکتا تھا۔۔۔۔

۔۔۔۔ شاید پیار سے پڑھنے والے! تم اسے مکمل طور پر سمجھا، ہوا اور تربیت یافتہ و بکھر اور شری مذہب اور سادگان (یہ جہلا ہماری انگریزی یونیورسٹیوں میں پڑھے بغیر کیسے ہو سکتا ہے) میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ ایک مکمل انسان تھا، اس نے مذہب کی سبب روح اپنے اندر تحلیل کر لی تھی اور اس کا دھڑکتا ہوا چہرہ اس کی اندرونی روشنی کا پتلا دیتا تھا۔۔۔۔ وہ ایک مذہبی جونی نہ تھا۔ ان آدمیوں میں سے جن میں جو خدا کا پھر ہیں کہ اپنے ہم نفسوں پر سچ بن جیتے ہیں اور ان کے لیے دائمی عذاب متعین کر دیتے ہیں۔۔۔۔۔۔ فسادات کے زمانے میں اس نے مصافحات کے ایک جند و گمراہی کے مدرسے میں پناہ دی تھی اور غصیلے مجھے سے ان کی جان بچائی تھی۔ مذہب میں جو حقیقی طور پر خوشامد اور شیعانی عنصر ہے وہ جنوں کا ہے۔ اور میری نظر میں ایک مذہبی دیوانے سے



بڑھ کر قابلِ نفرت اور گناہم شخص اور کوئی نہیں ہو سکتا.... ہم اسی جنوں کی وجہ سے مغرب سے کن رہ کش ہوتے جا رہے ہیں، مگر یہی جنوں، ایک کربہہ تشکیک میں، دوسرے ازموں میں ہم پر مسلط ہو رہا ہے.... جنوں آدمی کا سب سے ذلیل جہیل جذبہ ہے۔ یہ نفرت کی دہائی کو پیدا کرتا ہے۔ نفرت ہمیشہ تباہ کرتی ہے اور نفرت پر جو کچھ بننا ہے زندہ رہنے والا نہیں ہوتا۔

مولوی فقیر اللہ کے مذہب میں یرواری اور محبت تھی۔

اگلی صبح میرا دوست اور مولوی فقیر اللہ جیسے نہری پٹری سبک چھوڑنے کے لیے آئے۔ اسی پچھلے رات کے میرا سائیکل پکڑا ہوا تھا۔ پٹری پر پہنچ کر میرا دوست اور مولوی فقیر اللہ جیسے چھوڑ کر چلے گئے۔ مگر میں کچھ دیر سائیکل پکڑے بیچے اس "فٹلری لا" کو دیکھتا رہا۔ جو صبح کے امن میں، کھیتوں کے درمیان چڑھا تھا اور جہاں سے ایک نیلا دھواں ابل کھاتا ہوا اور پراٹھ رہا تھا۔ یہ روت و بھقان کا ایک معمولی غریب خانہ مکان نہ تھا بلکہ علم کی روشنی کا ایک بڑا طاقت ور روشن مینار تھا جس کی شعاعیں ارد گرد کی ظلمت کو دور کرنے کی جدوجہد کر رہی تھیں۔ میں سوچ رہا تھا: جب میں کچھ روپے پس انداز کروں گا تو ایک دن کوپاسی کو ہمیشہ کے لیے غیر یاد کب دوں گا، میں میکرو ڈورڈ کے اس دفتر کی سیلینٹری کو خیر یاد کہوں گا۔ میں اچھے، پدرانہ بھرتیہ کو اور اپنے کافی ہاؤس کے فرمیں، دفتروں اور نو جوانی باجمت انقلاب پسند جرنلسٹوں کو خیر یاد کہوں گا۔ میں بیک باڈر میں اپنے متعین فلیٹ کو جس کے دروازے کی تختی پر لکھا ہوا ہے: "محمد محمد علی ملے بی۔ ایس سی (انجینئرنگ)"، آخری دفعہ قفل کروں گا اور گاڑی پکڑ کر اسلام آباد کے نزدیکی اسٹیشن پر اتروں گا۔ ایک طالب علمانہ سادہ لباس پہنے، میٹھ پرکڑوں اور کتا بوں کی ایک گھڑی لاؤں اور ہاتھ میں ایک موٹی موٹی پکڑے میں صبح کی نماز کے وقت اس پگڈنڈی پر چلتا ہوا دنگڑے علم غیب کی طرح مولوی فقیر اللہ کا دروازہ کشکشاؤں گا اور جب وہ نیک آدمی باہر آئے گا تو میرے آنے کا مقصد پوچھے گا تو میں جواب دوں گا: "میں مسافر طالب علم

کی حیثیت سے درس میں داخل ہونے آیا ہوں ۛ  
اور ٹکڑے ٹکڑے کی طرح میں بھی ہمیشہ بچتا رہوں گا۔

# معلوماتی قاعدہ

قدر سے بڑے بچوں کے لئے

مصنف نے یہ قاعدہ لکھ کر ٹیلیسٹ بک کمپنی کو بھیج دیا تاکہ وہ اسے سکروں کے لیے منظور کرے۔ مگر کمپنی کے صدر نے قاعدے کا مسودہ انسپکٹر جنرل پولیس کو بھجوا دیا۔

یہ سائنس کے حیرت ناک کرشموں کا زمانہ ہے۔ کوئی دن نہیں جاتا کہ ہماری پائیدار و جنیم سائنس دان ہمیں کسی نئی ایجاد سے ششدر نہ کرتے ہوں۔ ان ایجادوں نے ہماری زندگی اور ہماری موت تک کو بھی از حد آسان اور خوش گزار بنا دیا ہے۔ ان کا ذکر یہاں میں سب سے پہلی اور سب سے مفید جڑی ایجاد ہے وہ ٹائیڈروجن بم ہے۔

کہنے کو یہ معنی ایک بم ہے لیکن حاصل یہ ہے بڑے کام کی چیز۔ ہم تو پہلے بھی سنتے تھے، ہستنا بم، ڈوڈل بم، مگر ٹائیڈروجن بم کی ایجاد کے بعد وہ کھلونے بن کر رہ گئے ہیں۔

پتہ! یہ سب تسلیم کر چکے ہیں کہ اس کُتے پر انسان کے لیے زندگی وہی ہو چکی ہے۔ تلج کی قلت پڑنے کی ہنگامی اور سیاسی لیڈروں نے ہمارا یہاں رہنا دو بھر کر دیا ہے۔ زندگی کے کام بے سود اور باسی ہو چکے ہیں اور ان کا ہوا دو ٹوٹ چکا ہے۔ ویسے دنیا ہو بھی تو بہت پرانی ہو چکی ہے۔ دس ادب سال یا دس کھرب سال، ابھی تک سائنس دان دنیا کی عمر کے متعلق آخری فیصلہ نہیں کر سکے۔

اور اس وقت ہمیں جس ایجاد کی سب سے زیادہ ضرورت ہے وہ ٹائیڈروجن بم ہی

ہے اور ضرورت ایجاب کی ماں ہے۔ (یہ محاورہ ہر ہم کی ایجاد کے وقت کام آنے لگا اس لیے اسے یاد کرو!) — یہ تم جانتے ہو کہ دنیا کی آبادی بڑی تیزی سے بڑھ رہی ہے اور یہ بے مد نظر نگہ بات ہے۔ ٹائیڈوجن بم کی مدد سے دنیا کے سیاسی لیڈر اس آبادی کو وقتاً فوقتاً گھٹانے اور مناسب حدود میں رکھنے کے قابل ہو گئے ہیں اب دنیا کی بڑھتی ہوئی آبادی خطرے میں نہیں رہے گی۔ پڑائے ننانے میں اسٹامیاں اس مقصد کے لیے دنیا پر قطعاً طاعون اور تاتار نازل کیا کرتے تھے۔ حضرت موسیٰ کے وقت مصر میں آٹھ طاعونیں یکے بعد دیگرے بھی گئی تھیں۔ شہر کے شہر خالی ہو گئے تھے۔ ان طاعونوں کے باوجود بھی مصر میں چند انسان باقی رہ گئے تھے۔ ٹائیڈوجن بم مصر کی آٹھ طاعونوں سے زیادہ کا درجہ ہے۔ اس کے موجدوں کا دعویٰ ہے کہ یہ بم جس شہر پر گرسے گا وہاں انسان تو انسان طاعون تلک کا خاتمہ ہو جائے گا۔

پھر ایک بات اور بھی ہے۔ طاعون اور تاتاریوں کو شہر خالی کرنے اور آبادی گھٹانے کے کام میں کئی کئی دن لگ جاتے تھے۔ کام پھر بھی خاطر خواہ نہ ہوتا تھا اور ادا وھوا رہ جاتا تھا۔ آج کل دنیا کا زمانہ ہے ہم سالوں کا فاصلہ گھڑیوں میں طے کر رہے ہیں۔ آج کل ہم انتظار نہیں کر سکتے۔ ہماری خواہش ہے کہ اگر ناشتہ اس جہان میں کریں تو نیچے اگلے جہان میں جا کھائیں۔ ٹائیڈوجن بم اہل بھر میں بڑے سے بڑے شہر کو نیست و نابود کر دے گا۔ مجال ہے کہ کوئی شخص بتایا وہ جاتے سولے دغا بیا، سیاسی لیڈروں کے جو پیٹے ہی اس شہر کو خالی کر کے کہیں اور مرنے سے بچ کھا رہے ہوں گے۔

چچا سام کے پاس ٹائیڈوجن بموں کا بہت ذخیرہ ہے۔ چچا سام اس پر فخر سے چھوٹے نہیں ساتے۔ دس کے پاس ہی ٹائیڈوجن بم کے ڈبیر ہیں۔ لیکن چچا سام کا لگان ہے کہ ان میں سے ٹائیڈوجن بم بھری ہوئی۔

چچا اکثر کہتے تھے گئے ہیں کہ ہمارے ٹائیڈوجن بم روسی ٹائیڈوجن بموں سے کہیں بڑھیا

اور قیامتی پس اب ایک اور ہم کو بالٹ ہم سختے میں آ رہا ہے اُسے اور جنتان کے پر بیڈ ٹیٹل سیز  
بیروں خاص اپنی سرکردگی میں تیار کروادے ہیں۔ یہ اب تک تیار ہو چکا مگر وہ پروفیسر جن کے  
ذہن سے یہ کام خاص جعل ثابت ہوا۔ وہ دراصل ایک کیسیا گر فضا اور سیز بیروں کو آتو بنانا رہا تھا کہ بالٹ  
ہم ٹائیڈ و جن ہم سے دس گنا زیادہ کارگر ہو گا۔ اس کے بعد نائیڈ و جن کی ایجاد کی باری ہوگی۔ جو  
کو بالٹ ہم سے سو گنا زیادہ طاقت ور ہو گا۔ بچو! اسی لیے اب ہمدا مستقبل بڑا شاندار ہے۔ ہمدا  
نجات اب یقینی ہے۔

۲۰۔ اعرینا سال آگیا۔ یہ سال نئی خوشیاں اور نئی آملگیں اپنے دامن میں سے کرا رہا ہے۔  
**نیاسال** ہر نیا سال مبارک اور سعید ہوتا ہے اور ہرگز رہا ہوا سال نخوس اور بُرا۔ ہرگز دے  
ہوتے سال میں اتنے قتل و زلزلے اور قحط ہوتے ہیں کہ ان کے واسے میں سوچا تک نہیں جاسکتا۔  
تازہ ترین نئے سال کے آغاز کے شگون بڑے مبارک ثابت ہوتے ہیں سال کے پہلے ہی پہنچتے ہیں  
یہ خبر آگئی کہ چند لغوات پسند ہندو تھیوں نے پانامہ کے صدر جوشے دیویوں کو گولی کا نشانہ بنادیا۔  
جس وقت یہ واقعہ ہوا مرام چند سحر و خرافاتین کے ہمراہ گھڑ دوڑ ملاحظہ فرما رہے تھے پریڈ ٹیٹل چنے  
جائے سے پہلے آپ پانامہ کی پولیس کے ہر و عزیز چیت تھے اور پولیس ہی کے ہوتے پریڈ ٹیٹل  
بنے تھے۔ ہندو تھیوں نے دھائیں دھائیں چھ سات نارتھ کئے اور کرنل صاحب کے علاوہ دو تین  
خواتین کو بھی ڈھیر کرنے کے بعد موٹر میں فرما ہو گئے۔ پچاسام کی راستے ہے کہ یہ سب کیونٹوں  
کی کارروائی ہے اس لیے ہماری بھی میں دانے ہے۔ ہم ان کے اعلاحت گزار بھتیجے جو ہوئے!  
ہر نئے سال کے پہلے دوڑ لوگ نے عہد اور نئے ارادے ہاندھتے ہیں یہ ارادے اور  
عہد توڑنے کے لیے کیے جاتے ہیں۔ بچو! تم نے بھی اپنے آپ سے ایسے ہی وعدے ضرور  
کیے ہوں گے۔ مثلاً یہ کہ تم آئندہ اپنا سکول کلام اپنے بڑے جانی سے کروانے کی بجائے خود  
کیا کرو گے کہ تم بڑے اچھے لڑکے بن جاؤ گے کہ تم ہمیشہ سچ بولا کرو گے خواہ تمہارا باپ مارا

کرنبداری قلم اڑا دے وغیرہ وغیرہ۔ پھر باغیچہ نہیں اگر تم نے اس وعدوں میں سے ابھی تک ایک بھی پورا نہیں کیا یہ وعدے کیسے ہی اسی لیے جاتے ہیں تاکہ انہیں توڑا جاسکے۔

آؤ آج نہیں ایک ایسے آدمی کی کہانی سنائیں جو طبعی طور پر بے حد کاہل ہے۔ ہر نئے سال کے شروع میں یہ آدمی صدقِ دل سے عہد کرتا ہے کہ وہ اب اپنی زندگی کا ایک نیا دورق اُٹھے گا۔ وہ صبح اٹھا کر سہ گاہ اور چھڑی اٹھنے میں لگے رہتا تھا باغ کو جایا کرے گا۔ وہ نیم سحری سے اپنے کمزور پیچھے پھروں کو چڑی طرح بھرے گا اور ایک ایک پھول کے قریب ناک لے جا کر سونگھے گا۔ وہ خوش الحان پرندوں کی بولیاں سنے گا اور خود بھی ایک پرندے کی طرح بیٹیاں بھائے گا۔ وہ ایسا سعادت مند اور فرماں بردار لڑکا بن جائے گا کہ دوسرے لڑکوں کے والدین اپنے بیٹوں کے دو برو بطور مثال پیش کیا کریں گے وہ سگریٹ بالکل نہیں پئے گا اور اس کے دوستوں کی اسے سگریٹ پلانے کی کوششیں اس پر قہر اُٹھائیں گی۔ وہ سال میں کم از کم ایک ناول، دس علمی مقالے اور پندرہ مختصر افسانے مکمل کرے گا دیہ آدمی اپنے آپ کو مصنف بھی سمجھتا ہے،

اب پھر اتم سچ مانو اس کاہل آدمی نے اپنا ایک عہد بھی تو پورا نہیں کیا۔ اس سال کی کوئی بات نہیں دیکھی وہ باغ میں چھپنے کے لیے بھی نہیں گیا کیوں کہ وہ چھڑی نہیں خرید سکا۔ اس کے والدین اس سے سخت ناراض ہیں اور اس کے دو برو دوسرے والدین کے بیٹوں کو بطور مثال پیش کرتے ہیں کہ کتنے کامیاب سال ہے کہ ناول کے پچھلے دو صفحوں کے علاوہ اس نے ایک سطر بھی نہیں لکھی۔ حالانکہ ایڈیٹر اس کے دوست ہیں وہ اس کی ہر چیز چھاپ دیتے ہیں یہ سب اود کاہل آدمی ہر روز ایک نمبر کے کنادے دھوپ میں بیٹھ کر لاتعداد سگریٹ پیتا ہے اور زندگی کے بیش قیمت لمحوں کو رائیگاں جانے دیتا ہے۔ اس آدمی سے سبق لے۔

امیر آدمی نئے سال کا استقبال بڑے اہتمام اور چاؤ سے کرتے ہیں۔ ان کی تعویذیں

ہمارے فیضی کے دسواں میں چھپتی ہیں۔ ڈاکٹر سٹہن کو یہ بڑے آدمی کسی شاذ و نادر میں  
 جمع ہوتے ہیں اور وہاں دوسرے امیر آدمیوں کی خوبصورت بیویوں کے ساتھ ڈانس کرتے  
 ہیں بارہ بجے جب نئے سال کے پہلے دن کا ڈروڈ ہوتا ہے تو یہ دکنی ہوتی مکیا کے جام  
 سے اُسے یہی خیراڑ کچتے ہیں نئے سال کی آمد کو منانے کا اصل طریقہ یہی ہے۔ ہزاروں  
 رنگ جڑوئی میں شمشیرتے ہونے فٹ پاٹھوں کے پتھر پر بستر پر نئے سال کا استقبال کرتے  
 ہیں وہ نئے سال کی قرین کرتے ہیں۔ اسی لیے نیا سال ان سے ناراض ہو جاتا ہے۔ ان لوگوں کے  
 لیے اس نیا سال طلوع ہی نہیں ہوتا۔ بچو! ان کے لیے شاید یہ سال بھی طلوع نہیں ہوگا۔ تم  
 کہیں غریب نہ بننا!

بچو! جب ہم بیمار ہوتے ہیں تو فوراً ڈاکٹر کے ہاں بھاگ جاتے ہیں یا ڈاکٹر کو  
 ڈاکٹر اپنے ہاں بلوائیتے ہیں۔ ڈاکٹر کو اپنے ہاں بلوانا آسان نہیں ہوتا کیونکہ ڈاکٹر کو اور  
 بھی تو کئی کام ہوتے ہیں اس کو بلانے کے لیے سوا دی بھی بھیجنا ضروری ہے۔ وہ نہ ڈاکٹر  
 نہیں آئے گا۔

ایرو! ڈاکٹر صاحب بھی آگئے۔ وہ پہلے ہمارے فیضی ٹھرتے ہیں پھر ہمارے زبان نکلوا کر  
 دیکھتے ہیں پھر اپنے سامنے دیکھنے کے آئے سے ہمارے سینے کا معائنہ کرتے ہیں اور نہ کہہ کر وہ  
 ایک ٹنڈا سامنے لیتے ہیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہم نے ڈاکٹر صاحب کو اس وقت بلایا ہے  
 جب کہ پانی سر سے گزر چکا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کھڑے کھڑے نسخہ لکھ دیتے ہیں کہ دایات دینے  
 ہیں شفا ریجن کو چھتھو دن کے علاوہ کھانے کے لیے اور کچھ نہ دیا جائے جب انہیں نہیں دی جاتی  
 ہے تو وہ تدریس حیرانی ہی کرکتے ہیں جیسا کہ انہیں اس نفلت کی توقع نہ تھی لیکن وہ فیض چھڑاتے  
 کسی صورت میں بھی نہیں۔

بچو! ہر ایک شخص ڈاکٹر کے کالج سے سند حاصل کر کے اپنا مطلب کھل سکتا ہے۔ اس

سندے سے لوگوں کا علاج کرنے کا پروانہ مل جاتا ہے۔ کوئی شخص ڈاکٹر کے علاج سے مرہم  
جائے تو ڈاکٹر کو کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ یورپ میں کن ایک ایسے ڈاکٹروں کی شاہیں ہیں جنہوں نے  
کن اچھے بھلے آدمیوں کو چپکے سے قتل کر دیا ہے لیکن ان کی بابت کوئی بھی نہیں جانتا۔

ایک بار کسی ڈاکٹر کے ہتھے چڑھ جاؤ تو پھر تباہی آسانی سے خلاص نہ ہوگی۔ ایسی صورت  
میں بچاؤ کا دوا دینا طریقہ یہی ہے کہ آدمی اس شہر سے چلا جائے جس میں وہ ڈاکٹر رہتا ہے۔ تمہیں کوئی  
معمولی شکایت ہے تم ایک ڈاکٹر کے پاس جاتے ہو وہ تمہارے جسم اور دماغ میں کن اور دماغ  
دیاقت کرے گا اور تمہیں یقین دلا دے گا کہ تمہارا اس وقت تک زندہ رہ جانا ایک معجزہ ہے۔  
وہ ایک علاج تجویز کرے گا جو کافی لمبا چڑھا ہو گا ڈاکٹر عموماً بجائی چلنے سے مل جل کر کام کرتے ہیں مثال  
کے طور پر تم ڈاکٹر کا ماکے پاس زکوم کے علاج کے لیے جانتے ہو یہ تباہی سے بچے بد قسمتی ہے۔  
ڈاکٹر گاماتہیں ڈاکٹر شیفٹنگ سکوپ سے تمہارے سینے کا معائنہ کرتا ہے اور اپنے سر کو تشریش سے  
بالتے ہوئے اپنی دانتے دیتا ہے کہ تمہارے پیسیپرے بالکل گل چکے ہیں اور ان کا فوراً ایکس رے  
ہونا چاہیے۔ اپنی فیس وصول کرنے کے بعد وہ تمہیں ایکس رے کے پنے اپنے دوست ڈاکٹر لیڈا  
کے پاس بھیجتا ہے۔ ریڈیا لیسٹ ڈاکٹر لیڈا کے ایکس رے ہمیشہ صاف اور سچا ہوتے تھے۔  
اس کی ایکس رے مشین خراب ہے اور اس کی چوکشا داڑھی ہمیشہ کسی نہ کسی طریقے سے مریض اور  
ایکس رے کم لیٹ میں مائل ہو کر فوڈا ستیا ناس کر دیتی ہے۔ ڈاکٹر لیڈا تمہارے پیسیپرے کا  
ایکس رے مینا ہے جو دراصل اس کی داڑھی کا ایکس رے ہے۔ ابھی سو فیض لینے کے بعد ڈاکٹر  
لیڈا ایکس رے کی عکس تصویر تمہارے حواسے کرتا ہے اور تمہیں ڈاکٹر تھیا کے گھر کا پتا بتاتا  
ہے جہاں ایکس رے فوڈوں کو پڑھنے کا ماہر ہے۔ ڈاکٹر تھیا تمہیں یہ بتا سکتا ہے کہ کیا تمہارے  
دوا پیسیپرے بے کار ہیں یا صرف ایک۔ تھیا ایکس رے کے بغور دیکھنے کے بعد تمہیں مذ  
کھونے کا حکم دیتا ہے اور اپنا سر ہلاتا ہے، اپنے دانت فوراً نکلواؤ، وہ کہتا ہے تم احتجاج کرتے



ہو کہ انہیں دسے پھیپھڑے کا ہے و انہوں کا نہیں۔ مگر تھپا پر خاک اثر نہیں جوتا۔ اپنی فیس سے  
 کہ وہ تمہیں ڈاکٹر گھیشا کی طرف بھیجتا ہے۔ گھیشا و مذاں ساز ہے۔ وہ تمہیں فوراً کرسی پر  
 بٹھا کر تہا دے۔ دانت نکالنے شروع کر دیتا ہے گھیشا دس روپے فی دانت کے حساب  
 سے و دس روپے فیس وصول کرتا ہے تم قسم کھاتے ہو کہ تم کبھی کسی ڈاکٹر کا منتہ نہ دیکھو گے۔  
 دو ڈاکٹروں کی ایک مرض کی تشخیص ہمیشہ مختلف ہوتی ہے ایک ڈاکٹر کے نزدیک اگر  
 تہا د مرض سیٹر یا ہے تو دوسرا اسے ٹیڈرو فرمایا تہا ستے گا۔ نئی دواؤں کی ایجاد کے بعد دواؤں  
 ڈاکٹروں کے نسخوں میں کوئی فرق نہ ہو گا۔ پینسلین کے انجکشن سیٹر یا کے لیے بھی اتنے ہی مفید  
 ہیں جتنے ٹیڈرو فرمایا کے لیے پینسلین کی ایجاد کے بعد مرض کی تشخیص ایسی اہم نہیں رہی  
 ہر ڈاکٹر دوسرے ڈاکٹر — کا بیماری جانتا ہے اور سمجھتا ہے کہ دوسرے ڈاکٹر کو میڈیسن  
 کی الف پے بھی نہیں آتی۔

پھر انہیں یقین آنے یا نہ آتے۔ جے یہ سچی بات کہ ڈاکٹر خود بھی بیمار پڑ جاتے ہیں اور  
 قواعد میں نئے دواؤں ڈاکٹروں کو مرتے بھی دیکھا ہے۔ بیماری میں ڈاکٹروں جیسا بزدل  
 کوئی ہو تا ہو گا۔ وہ ٹیڈر پاؤں چھوڑ جاتے ہیں۔ ڈاکٹر اپنا علاج خود کبھی نہیں کرتے بلکہ ہمیشہ  
 دوسرے ڈاکٹروں سے کرتے ہیں۔ اور چیتہ چیتہ مہیتہ سے رجوع کرتے ہیں اور ہوسو مہیتہ چیتہ  
 سے۔ میرے ایک ڈاکٹر دوست کا قصہ سنو ایک روز اُسے معمولی طیر یا ہوا۔ اس کی حالت  
 خراب چھو۔ اُسے یقین تھا کہ وہ دو گھنٹی کا یہاں ہے۔ وہ ٹیڈر سے بڑے درد بھرے لمحے میں  
 بار بار کہتا، اب کیا بنے گا۔ وہ اپنے میری بچوں کو وصیت کرنا چاہتا تھا مگر میں نے اُسے  
 سمجھا تھا کہ تھوڑی دیر اور انتظار کرنے پر راضی کیا۔ اس حالت میں اس نے کئی بار اشد  
 اور خدا کو یاد کیا۔ ویسے تو خدا کو یاد کرنے میں کوئی ہرج نہیں۔ لیکن یہ ڈاکٹر دہریہ ہونے  
 کا دعوے دار ہے۔

پھر! بعض ڈاکٹر ایسے ہوتے ہیں جو مریض کا معائنہ کرتے وقت اس سے باتا دے  
سانس لینے کی دد زشیں کرتے ہیں۔ مثلاً وہ ڈبل نونیا کے مریض کو کہیں گے سانس روک لو  
اب لمبا سانس لو۔ اور لمبا، اپنا دایاں بازو اوپر اٹھاؤ، اب بائیں اٹھاؤ، اٹھ کر بیٹھو  
اور بیٹھے بیٹھے اپنے پاؤں کو چھوؤ۔ وہ مریض کی تربت برداشت آزمانے کے لیے اس کے  
ہیٹ میں زود کا گھوسا دسید کر کے اس سے پوچھیں گے: ”یہاں دود تو نہیں ہوتا۔ ایسے ڈاکٹروں  
کو بار بار بلانا اچھا نہیں۔ میں ایک ڈاکٹر کو جانتا ہوں جو مریض سے دد زش نہیں کرتا وہ صرف  
اُسے ننادے تک گفتی کرانے سے مطمئن ہو جاتا ہے۔

اب ڈاکٹروں کی ایک قسم اد بھی ہے ان کا دوا داند سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ یہ مختلف  
علوم کے ڈاکٹر ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر علم الہد سے کے ڈاکٹر، علم وادب کے ڈاکٹر، فلسفہ کے  
ڈاکٹر، سیاسیات کے ڈاکٹر، یہ لوگ ایک دو سال کسی یونیورسٹی میں بسر کر کے پادانچ سو ملے  
کا تھیس لکھتے ہیں جس کو اسوا ایک دو ہڈ سے پردیسر کے کوئی نہیں پڑھتا۔ ان پردیسروں  
کی سفادش پانہیں ڈاکٹری کی سند مل جاتی ہے۔ میرا ایک دوست علم وادب کا ڈاکٹر ہے۔  
اس نے چند گپت مراد یہ کے زمانے میں شاعری کے ترقی پسند رجانات پر ہزار ملے  
کا تھیس لکھا تھا اس کے پردیسر نے اس تھیس سے اپنی انجیلٹی کو جملانے کا کام لیا اور میرے  
دوست کے لیے ڈاکٹری کی سند کی سفادش کر دی۔ یہ تھیس عربی زبان میں تھا۔ یہ ڈاکٹر بے  
برد ہوتے ہیں ان کے نظر آتے ہی اچھے اچھوں کے اوسان خطا ہو جاتے ہیں۔ ایک دفعہ میں  
نے ایک معزز خوش پرش زرجوان کو ایک دیوار بھاندتے دیکھا وہ ایک ڈاکٹر سے بچی کر بھاگ  
رہا تھا! بات یہ ہے کہ یہ ڈاکٹر ڈاکٹر بن جانے کے بعد بھی تھیس سوچتے اور لکھتے دہتے ہیں۔  
ٹاں پھر! اب تم سوال کر دگے کہ یہ جو سلطان آت زنجبار ڈاکٹر بنے بیٹھے ہیں تو کیا  
انہوں نے بھی زنجبار کی پھلیوں اودان کی گوتوں پر کوئی عقناتہ مقالہ ظلم بند کر کے کسی یونیورسٹی

میں پیش کیا ہوگا۔ نہیں یہ سلطان آفت زنجبار دوسرے کئی ملکوں کے سیاسی لیڈروں کی طرح  
اعوامی ڈاکٹر ہیں۔ پچھلے سے پچھلے سال یہ کانوں کے آپریشن کے لیے آپ سنتے ہیں اچھا سام  
کے ملک میں تشریف لے گئے تھے۔ وہاں کی یونیورسٹیوں کو ایسا موقع خدا سے انہوں نے  
سلطان پر ڈاکٹری کی ڈگریاں نہجاہد کئے میں بڑی سرگرمی کا مظاہرہ کیا۔ اب آپ خدا کے  
فضل سے کم از کم آدھ جن علوم کے ڈاکٹر ہیں۔ لیکن دنیا یونیورسٹی کے آپ علم و ادب کے ڈاکٹر  
ہیں۔ چیمپان یونیورسٹی کے سماجی قوانین کے ڈاکٹر۔ اوٹاوا کے کیمسٹری کے ڈاکٹر ٹیکساس  
سے جینیات کے ڈاکٹر۔

بھو! قوم کے لیے ہر قسم کے ڈاکٹر ضروری ہیں یہ نہ ہوں تو دوسرے ملک میں اجڈ  
اور غیر مہذب سمجھے گلیں۔

آؤ بھو! تمہیں بتے بیٹیوں کی باتیں سنائیں بتے بیٹیوں اور ہم  
بتے بیٹیوں کے بارے میں انسانوں میں بہت سی عادات ہیں ایک سی ہیں تم نے کئی ایک  
بتے دیکھے ہوں گے جن کی شکلیں اور زندگیاں بعض آدمیوں کی شکلوں اور زندگیوں سے بڑی  
مشابہ ہوتی ہیں۔ یہ بتے اپنی پھلی ٹانگوں پر کھڑے ہو جاتیں اور کپڑے پہن میں تو ہر جہت  
انسان لگنے لگیں گے۔ اسی طرح اگر بعض انسان اپنے گشتوں کے بل پر اپنے بازو آگے ٹیک میں  
تو ان میں اور جنوں میں فرق جتنا مشکل ہو جائے گا۔ لیکن بتے کی قدرت نے ایک ایسی شے دی  
ہے جو آج تک کسی انسان کو میسر نہیں آسکی۔ وہ شے ہے بتے کی صاف شفاف اور چمکیلی مٹم۔ تم نے  
مزدور ایسی عورتیں دیکھی ہوں گی جو مٹم کے کوٹ پہن کر بیٹیوں کی بھسری کرنے کی کوشش کرتی ہیں  
مگر وہ بات پیدا نہیں کر سکتیں۔

اس مٹم کو دھونے کی ضرورت نہیں ہوتی اس لیے بتے بہت کم نہاتے ہیں۔ زیادہ  
جو اتو زبان سے اپنی مٹم کو پاٹ لیا اور وہ پھر دھوئی کی دھوئی شفاف پانی میں بھیگنے سے بتے تلخ

ہو جاتے ہیں، بیچل جی کی مثل اسی سے تو بنی ہے، انسان بھی نہانے کے معاملے میں بتوں سے سبق حاصل کر سکتا ہے، ہم بلا وجہ نہاتے اور منہ دھوتے ہیں اگر ہم غسل نہ کیا کریں تو ہمارے جسم پر میل کی تہیں جمتی جائیں گی اور خوبصورت پشت بن جائیں گی پھر ہمیں کپڑوں کی ضرورت نہ رہے گی، تم نے اپنے شر کی گلیوں میں ایسے کئی آورہ آدمی دیکھے ہوں گے جن کے جسم پر میل کی پشت چڑھی جرتی ہے وہ کپڑے نہیں پہنتے۔

افریقہ کے ایک دولہا سفر کا قول ہے کہ نہانا ایک فضول رواج ہے۔ تم خود دیکھو ہمیں دنیا میں آنے اور یہاں سے وخصت جو نئے پردہ و غسل دے جاتے ہیں یہ بالکل بیکار ہیں، ان کا ہمیں کوئی فائدہ نہیں ہوتا، نہانے کی بات نیچے میں آپڑی میں نہیں بتاؤں تاکہ جتنے بیٹوں کے بارے میں میری زندگی میں دو تین جتنے بٹیاں آئے ہیں آؤ تمہیں ان کی کہانیاں سناؤں تاکہ تم عبرت پکڑو اور تمہیں معلوم ہو کہ ان میں اور انسان میں کوئی خاص فرق نہیں۔

مجھے ایک بت یاد آتی ہے جب میں چھوٹا تھا تو یہ بتی ہمارے باورچی خانے میں چوہے کے پاس بیٹھ کر انگ پر رکھی جوتی و دودھ کی دیگی کی رکھوالی کیا کرتی تھی یہ میری خال کی چھینتی تھی اور بالکل کابی اعتبار بتی تھی۔ عام بیٹوں کی سی چوہے کے عادت اُسے چھوٹک نہ گئی تھی، یہ بتی اپنے دودھ کے پیچھے ٹرے اور کابی میں پہلو بھر دودھ پر شا کر تھی بہر خیال ہے کہ یہ دنیا میں واحد بتی تھی جو دودھ کی رکھوالی کرتی تھی۔ میں نے ایسی بُر و بار اور شریف نفس بتی کبھی نہیں دیکھی، اس کی پشت برف کی طرح سفید تھی اور اُبلتے ہوئے دودھ کی دیگی کے پاس اپنی پھل ٹانگوں پر بیٹھ جوتی یہ ایک وضع دار، حسن رسیدہ خاتون کی مکمل تصویر نظر آتی تھی۔ میں نے ایسا دھار اور گھڑ پامرف دو تین خواتین میں دیکھا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس قد نیکی اور شرافت اس کی عمر کی وجہ سے نہ تھی وہ ضرور قیوں کی کسی شاہانہ اور عمدہ نسل سے تھی۔ اس میں امیر زادیوں اور شاہزادیوں کی خوب تھی وہ ایک پارماجن تر ضرور لگتی تھی لیکن میں اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر اس کے بارے

میں قسم کھانے کو تیار ہوں کہ اپنے اٹھارہپن کے زلمے بھی اس نے زور چڑھے نہیں کھائے ہوں گے۔ جو چہ اس نے کھائے ضرور ہوں گے۔ کون بتی اس کمزوری سے پاک ہے۔ مگر اس نے یہ کام اپنی خامہ داری کے فرض کے طور پر کیا تھا۔ اور اب اپنے کیے پر چھہ دل سے پشیمان تھی۔ وہ یقیناً ایک قابلِ مثالِ تہی تھی۔

اس تہی کے انجام کے متعلق مجھے کچھ یقین نہیں — میں بڑا ہوا تو میرا چھوٹا بھائی ایک دن کہیں سے ایک بوٹھڑا پگڑا لایا اس کے دسر کا پچھلا حصہ اور ٹانگیں سیاہی مائل مٹکی رنگ کے تھے اور سر اور گردن کا حصہ سفید یہ بوٹھڑا آدمی تھا۔ ہم نے اس کا نام ٹام رکھا۔ ٹام جلد ہی سارے گھر کے کالاف لابن گیا۔ گھر میں ہر کوئی اُسے گرد میں اُٹھا لیتا اور اُسے چکارتا۔ اس بے جا لڑ پیار نے ٹام کی عادتوں کو بالکل بگاڑ دیا۔ ٹام میں ایک پیدائشی شکاری کی سی خصلت تھی اور ابھی یہ دو تین جینے کا ہی تھا کہ یہ ہمارے صحن میں اُگے ہوئے بڑے پھل کے پٹے بیٹھ کر گھبرائی اور چڑھائی کو ٹھانی ہوئی لکڑوں سے تاکا کرتا اور اپنے پٹے تیز کرتا۔ ان دنوں میری والدہ کو مرغیاں پانے کا بڑا شوق تھا۔ جب گھوٹے طام چڑھے اون کی گیندوں کی طرح اُچھلتے اور چھدکتے ہوئے صحن میں پھرتے تو ٹام میری والدہ کے پیڑھے کے ساتھ دھب کر انہیں دلچسپی اور حسرت سے گھورا کرتا۔ میری والدہ کو یقین تھا کہ ٹام ایک اچھا بلا ہے اور گھر کے چڑوں کا رکھوالا ثابت ہوگا۔ ہم جو ٹام کے منہ میں خون کی دھب آتے دیکھتے تھے اس کی جھلکی کے متعلق اتنے پُر یقین نہ تھے۔ ہم نے پیشین گوئی کی کہ ٹام کسی دن چڑوں پر چھپٹ جائے گا۔ لیکن میری والدہ نے ہمیں ٹام کے بارے میں اس طرح سوچنے پر ڈٹا۔ شروع شروع میں اس قدر تو غیب کے سامنے ٹام کے اس جبر اور صبر نے ہمیں واقعی حیران کر دیا۔ اور ہم خیال کرنے لگے کہ شاید اس کی چڑوں میں دلچسپی ان کی رکھوالی کی وجہ سے ہے۔

آخر ہمارے پیشین گوئی درست ثابت ہوئی۔ میری والدہ باوجود جی خانے میں مصروف پر نماز

پڑھ رہی تھیں، ٹام ان کے ساتھ حسب دستور دیکھا بیٹھا تھا ایک سرخی اپنے نچے چوڑوں کو لیے  
 بارہ کی خانگیں آگئی۔ چوڑے بار بار بچہ کہتے ہوئے ٹام کے سامنے سے گزرتا تھا ان کے نزدیک  
 ٹام بھیجے تھا ہی نہیں ہیں نے دیکھا کہ ٹام کی آنکھیں غری ہو گئیں وہ اپنی زبان کو باہر نکال کر ناک  
 پر پھیرتا۔ وہ اپنے کو بڑی مشکل سے قابو میں رکھے ہوئے تھا۔ جب وہ مجھے اپنی طرف دیکھتے ہوئے  
 پاتا تو وہ بالکل گرہیں بن جاتا اور دوسری طرف دیکھنے لگتا جیسے کہ اُسے چوڑوں سے کوئی  
 تعلق نہ ہو۔ اب ٹام کو کھانا تھا تو صرف والدہ کا۔ وہ ناز پڑھ رہی تھیں۔ آخر ٹام سے شر ہا گیا۔  
 یحکوت وہ ایک چھوٹے سے چوڑے پر جھٹکا جو پھدکتا ہوا بالکل ٹام کے ناک کے قریب آ گیا  
 تھا ٹام اُسے وارچ کر باہر بھاگتا ہم سب اس کے پیچھے بھاگے اور اُسے زخمی چوڑے کو چھوٹنے  
 پر عیب دے کر دیا۔ ہمیں ٹام کی اس ناشگوار لڑائی اور نید سے بن پر ہلاکت آئی۔ ہم سب بھائی بھائی  
 نے جھگڑا کیا کہ اب ہم ٹام کو بالکل نہ لگا نہیں گئے۔ ہم اس کی بگڑالی ہونی عادات کو سناؤنا چاہتے  
 تھے۔ ٹام پر ہماری بے رحمی کا زور بھر رہی اثر نہ ہوا۔ اس نے اب بلا دھرمک اور بے شرمی سے  
 میری والدہ کے سرخی خانے کا صفایا کرنا شروع کر دیا۔ اب اس کے طور طریق بالکل خراب ہو گئے۔  
 آخر میرے چھوٹے بھائی اور میں نے اس پر ایک جرگہ بٹایا اس میں فیصلہ کیا کہ ٹام  
 کو جھوٹ موٹ پھانسی کی سزا دی جائے۔ ٹام کے گلے میں پھندا ڈال کر اس کے دوسرے سرے  
 کو پھل کی فٹنی سے باغ دیا گیا مگر ٹام ہوا میں نہیں ٹلک رہا تھا اس کی پھل ٹانگیں زمین پر نہیں  
 ہم نے ایک سرے ہوئے چوڑے کو جسے ہم نے اُسے چھوڑنے کے لیے چھوڑ کر دیا تھا، اطم سے  
 دو گز کے فاصلے پر رکھا دیا تاکہ ٹام کو روحانی سزا بھی ملے۔ گھر کے سب لوگوں نے اُسے بے حد شرمندہ  
 کیا اور میرے چھوٹے بھائی نے جس کا اصل دوست وہ تھا اس کا منہ کالا کر کے اُسے آئینہ بھی  
 دکھایا۔ اس سزا کے بعد بھی ٹام کی اصلاح نہ ہو سکی۔

جب ہم کو یقین ہو گیا کہ وہ قطعی خراب ہو گیا ہے تو ہم نے ایک دن اُسے چند نوٹ دلائے

کے حوالے کر دیا ہم نے انہیں کچھ پیسے دیے اور انہیں ہدایت کی کہ اسے شہر سے چھ سات میل دور سے جا کر ٹیوں میں چھوڑ دیں۔ اونٹوں دسے ٹام کو لے گئے، مگر اس کے چھٹے یا ساتویں دن ٹام صاحب پھر گھر میں موجود تھے ٹام پہلے سے قریب اور موٹا ہو گیا تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ اپنے واپسی کے سفر میں اس نے چوہوں کا خوب شکاویہ کیا تھا۔ اس کے بٹھرے پر ذمات کے آثار تک نہ تھے جہاں سے اس کا دس بارہ میل دور سے گھر کا راستہ ڈھونڈ کر پہنچ جانا معتاد تھا۔ ہم نے پھر اسے اپنے دلوں میں بڑی۔ وہ ہمارا بڑا تھا اور ہمارے پاس ہی لوٹ آیا تھا۔ اس کی اس سستیابی نے اس کی دھاک بٹھا دی اور ہم اسے اس دھک اور عزت سے دیکھنے لگے جیسے بغداد میں پرامن شہری سندباد جہازی کو دیکھتے ہوں گے۔

جب ٹام سن بلوغت کو پہنچا تو وہ کافی ادب و ادب وارہ مزاج ہو گیا۔ اب وہ گھر سے کئی کئی دن غائب رہنے لگا۔ شہر سے دور دراز جھٹوں میں اس کے بڑی صحبت میں گھومنے کی ایک دھیریں میں ہیں۔ لیکن بھلتے یا پھینکے کے بعد وہ گھر آ کر ہمیں شکل ضرور دکھا جاتا۔ ایک دفعہ ٹام چھ پھینک نہ آیا۔ ہمیں خیال ہونے لگا کہ کہیں کسی کتے یا عالم آدمی نے اُسے مار ہی نہ دیا ہو۔ ایک شام ہم صحن میں بیٹھے ٹام کے مارے جانے کا افسوس ہی کر رہے تھے کہ ٹام سر جھکا کر مسکین صورت بنائے دو داڑیوں میں سے اندر داخل ہوا۔ اسے شاید کچھ ذمات حق کر اس نے اتنا غصہ گھر سے فراہم کر اچھا نہیں کیا اور شاید اس نے یہ بھی تاڈ لیا کہ ہم اُسی کا ذکر کر رہے ہیں۔ ایک شرمسار جھرم کی طرح ہمدی طرت دیکھ کر بغیر وہ سیدھا سیڑھیوں کی سمت گیا اور چڑھتا ہوا سرے چھوٹے بجائی کے کمرے میں جا بیٹھا۔

ٹام کے یہ چھپن کتنی ہی مدت تک رہے۔ ایک بار جب وہ اسی طرح گھر سے بھاگا ہوا تھا۔ جہاں سے ہساریں کی مرغیاں اور مرغنے پڑا سرا طود پر غائب ہونے شروع ہو گئے۔ کسی کو معلوم نہ ہو سکا کہ ان کو کون سے جا رہا ہے۔ اور ان کا چور کون ہے۔ محلے پھر میں کمرام لگی گیا اور

دلی کے ایک چھوٹی دلاس داسے حکیم صاحب نے جن کی آٹھ نو مرغیاں ایک ایک کے غائب ہو چکی تھیں، محلہ کی مسجد میں بذریعہ اشتہار یہ اعلان کیا کہ مرغیوں کے چور کا پتا لگانے والے کو شہرت انعام کی ایک بوتل اور پانچ روپے نقد انعام دیا جائے گا۔ بڑے عرصے تک جو مشیاد چور کا کھوج نہ لگا سکا پھر کسی نے ایک کوڑا کرکٹ کے ڈیر کے پاس ایک مرغی کی پکلی ہوئی گردن اور پردیجھے اس سے سب پر جید کھلا کر یہ کسی چور کا کام نہ تھا اور یہ کہ مرغیوں کو کوئی ہلاکھا رہا ہے۔ شام کی شہرت کی وجہ سے شام پر خشک کیا گیا۔ برحقا جی شام۔ اور وہ ایک دفعہ اپنے اس شرمناک شغل کے جرم میں پکڑا بھی گیا جب محلے کی تمام مرغیاں ختم ہو گئیں اور ڈیرے نہ رہے تو تمام ایک اچھے لڑکے کی طرح ہر گھر میں لوٹ آیا وہ اب بڑا موٹا تازہ اور چاق و چوبند شام تھا اور پہچانا نہ جاتا تھا۔

ایک دفعہ میں کانچ میں تھا کہ تمام پھر غائب ہو گیا۔ اس دفعہ وہ کوئی ایک سال لا پتہ رہا۔ لیکن اس کی سکاوی اور جیل سازی کو جانتے ہوئے ہمیں یقین تھا کہ وہ زندہ ہو گا اور ضرور وہاں آئے گا۔ اس عرصے میں میں نے اُسے صرف ایک دفعہ دیکھا۔ گراما کی ایک شام کو میرا ایک دوست اور میں خواتین کی خاطر ادھار مانگی ہوئی برہن لگانے اور سیاہ سوٹ ڈانٹے سینہ جا رہے تھے۔ جب ہم فریاضوں کے کلب کے پاس سے گزرتے تو اگلے درجن کا سے مور چنگرے بٹے قیاس کلب کے چپ کلب سے بھاگتے ہوئے نکلے۔ ان میں ایک چھوٹی کالی بی بھی تھی جو رو لگاتے ہوئے حق اور پالتو حق۔ وہی ایک خاتون حق باقی غالباً سب مرد تھے۔ ان میں بہادر شام بھی تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے فوراً نظر چرائی۔ یہ لوگ کلب کے کسی ڈر سے لوٹ کر آتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ میرا دوست اور میں اس خیال پر بے حد جلتے۔ ظاہراً تمام اب فیض ایسل سوسائٹی میں گھومتے پھرنے لگا تھا۔ مجھے اس پر فخر کا احساس ہوا۔

شام اب بھی بہارے پاس ہے۔ وہ اب بوڑھا ہو چلا ہے اور اب اس نے غائب ہونا چھوڑ دیا ہے۔ اور خوشی کی بات یہ ہے کہ اس نے شادی کر لی ہے اور اپنی ہی قسم کی ایک



پھر جی کی کے ساتھ ایک پڑا ہوا گھسٹا زندگی گزار رہا ہے۔ اب بے حد مڑا اور سست ہو چکا ہے اور اس کے اندر سے پن کا تو بس پوچھو ہی نہیں وہ سگرے کی قاضی اور تروڑ کے بیچ ٹپک کھایا ہے۔ اس کی بیانی میں کچھ کمزور ہو گئی ہے۔

یہ ہے نام کی کہانی یہ پڑی لمبی ہو سکتی تھی، مگر اسے چھوٹا کرنا پڑا ہے۔ پھر اس کہانی سے جو تجربہ نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ ہماری ساری تہذیب اور رسم و رواج کے باوجود اپنی اصل میں انسان کی اور ایک بے کی زندگی میں کوئی فرق نہیں۔ اسی افریقہ کے زولوٹو سفر کا وجہ میں نے پہلے نقل کیا ہے) کہنا ہے کہ انسانوں کی طرح بے بیوں کے بھی سماجی تعلقات اتنے ترقی پا چکے ہیں اور آج کل کے ہیں کہ اگر ایک بیویں صدی کا بلا چاد سو سال قبل مسیح کے بے کو دیکھ لیں تو حضرات سے منہ پھیرے۔ پھر میں اس میں کوئی کلام نہیں کہ جو عیش و آرام بے بیوں کو قدیم مصر میں میسر تھے وہ آج کل انہیں چھپا سام کے دیں میں بھی نصیب نہیں۔ قدیم مصری بیوں کی پرستش کرتے تھے۔ ہر مصری کے گھر میں بیوں کے کئی کئی خاندان پرورش پاتے تھے اور بے کو مارنے والے کی سزا قتل ہوتی تھی۔ آج کل بے بیوں کی وہ قدر کہاں۔ ہائے عبرت ہے۔

## سوالات

- ۱۔ اگر ایک طاعون ایک بڑے شہر کو چار مہینے اور دس دن میں خالی کر سکتا ہے تو تباہی اش کو خالی کرنے کے لیے ایک ہائیڈروجن بم کو کتنی مدت درکار ہو گی؟
- ۲۔ نیا سال کیوں مبارک ہوتا ہے۔ اسے منانے کا صحیح اور مناسب طریقہ کیا ہے۔
- ۳۔ 'بردا' اور 'آن کر' کی تصویروں کو دیکھ کر کھسو؟
- ۴۔ ڈاکٹر قوم کے لیے کیوں ضروری ہیں۔ قسم نمبر دو کے ڈاکٹر بھنے کے لیے کیا کیا پاپڑ بیٹے پڑتے ہیں۔

۴۔ بچے بچیوں سے ہمیں کیا سبق حاصل ہو سکتے ہیں۔ اپنے کسی جاننے والے کی زندگی کو سامنے رکھ کر بتاؤ کہ اس کی زندگی بچے سے کس لحاظ سے مختلف ہے ؟

## آخری دن

ہم ڈھاکہ کے پریس کلب میں بیٹھے تھے۔ یہ ہمارا اُس مٹھی دھوپ اور نرم دیں گنوں کے شہر میں آخری دن تھا۔ اور ہم اگتائے ہوئے اور کچھ اُداس تھے۔ ہم میں سے نصف لوگ پہلے ہی اپنی خیر سگالی کو ختم کر کے کیلوں کے گچھٹوں سے لہے پھندے واپس معرب کو "فلانی" کر چکے تھے۔ نادسٹ، پاپس ابھی تک ڈھاکہ کے ہی میں تھا۔ لیکن وہ کلب کے لچ پر موجود نہیں تھا۔ کلب ایک چھوٹے سے باغ میں ایک خوش نما دو منزلہ عمارت ہے اور ڈھاکہ کے اخبار نویس اس معاملے میں بہت خوش نصیب ہیں کہ انہیں ایسا پڑگون اور آرام وہ گوشہ میسر ہے۔

لچ کچھ شرقی تھا، کچھ مغربی اور مناسب پیالے پر پُر نکلتے۔ ہمارے علاوہ میز پر انفارمیشن آفیسر اور ڈھاکہ کے کی انگریزی اخباروں کے نمائندے تھے۔ اور وہ دو خوب صورت اور چار منگ لڑکیاں تھیں جن میں سے ایک بے حد شرمیلی تھی۔ اخبار نویسوں نے خود کھانا ترتیب دیا، اور لچے ان کی سادہ خیر رمی سی بہانہ تواریزی بڑی بھائی۔ لچ کے بعد ہم اور ہر کی منزل کے لاؤنج میں باتیں کرنے اور سگریٹ پینے کے لیے جا بیٹھے۔ وہاں کسی نے بلدیہ گارڈنز کا ذکر کیا اور کہا کہ ہم اُسے دیکھنے بغیر ڈھاکہ سے نہ جائیں۔

"ابھی کیوں نہ چلیں؟" لڑکیوں میں سے ایک نے تجویز پیش کی۔ دہلی دہلی شرمیلی ہنسی ہنستے ہوئے، مسٹر گولڈ، توپ و تفنگ، کے گلے، باتوئی اور دلچسپ لہجے سے

نے خود کو بطور گائیڈ پیش کیا۔ گوگول نے کہا کہ وہ اس جگہ سرباد ہو گیا ہے۔ اور اُس کے چپے چپے سے اُسے نفرت ہے۔ لیکن وہ میزبان کی روایات کی خاطر ہمارے ساتھ جانے لگا۔ ہم ہائیکرو بس میں ٹھنس ٹھنسا کے بیٹھ گئے۔ بورس میسگر ساتھ بیٹھا تھا۔ علم دونوں میں ابھی تک بول چال بند تھی۔ اور چائنا کی ویدیائی بند گاہ کے سخت جھگڑے کے بعد ایک دوسرے کو نہہر گتے تھے۔

ہائیکرو بس ایک خاموش سڑک کے کنارے تھیں اور چھوٹوں سے ڈانچنے ہوئے ایک دروازے پر ڈکی اور جسم نیچے اترے۔ مسٹر گوگول نے اندر جانے کے ٹکٹ خریدے۔ اندر جانے کا ٹکٹ تھا! عجیبے چادے گوگول پر ترس آیا۔ میرا خیال ہے کہ دوسروں کے لیے ٹکٹ خریدنے کا اس کا پہلا تجربہ تھا۔ اور ہمیشہ دوسرے اس کا ٹکٹ خریدتے تھے۔ میزبان کی قیمت ہوتی ہے۔ مجھے ایک غریب اخباری نمائندہ کے اس طرح ہٹنے کا افسوس ہوا۔ لیکن ہم بدلا کیا کر سکتے تھے۔ بچا رہا، بچا رہا گوگول!

پہلے ہم عجائب گھر میں داخل ہوئے جو بلدیہ باغ کا ایک حصہ ہے۔ یہ میوزیم مجھے پر سکون اور تالوٹی لگا اور فضا میں دھمکی پھونکنے والی سی برقی جو عجائب گھروں سے منظر سے ہے۔ سبز روشنی رنگے ہوئے شیشوں سے چھن کر آ رہی تھی۔ اور اندر کے چھپنے کو ہٹا کرتی تھی۔ دو کمرے تھے۔ دونوں میں عجوبوں اور فادرات سے پر گلاس کیس بے ہوئے تھے، دیواروں پر کمپنی بہادر اور مغل زمانے کے جنگی ہتھیار لٹک رہے تھے۔ توڑے دار بندوبست، پیش قبض، خنجر، برقعے اور کئی دوسرے ہتھیار جن کے میں نام نہیں جانتا۔ میں نے اس وقت پامپس ناولسٹ کی غیر موجودگی کو محسوس کیا۔ پامپس جو خود کو قدیمی اسلحہ پر اتھارٹی سمجھتا ہے۔ یہاں خوب اپنے علم کے جوہر دکھانا اور جلسے اسٹاک سے چمکانا۔ میں نے سوچا پامپس کی کھوپڑی کتنی ہی بے گار اور

غلط معلومات سے غٹسی ہوئی ہے۔ یہاں اس کی تردید کرنے والا کوئی نہ تھا۔ وہ جو کچھ بھی کہتا چل جاتا۔

دو دن خوبصورت لڑکیاں جو یہاں پہلے پہلی تھیں مجھے شیشے کے صندوق میں رکھی ہوئی پیریز دکھانے لگیں۔ وہ بڑی اچھی لڑکیاں تھیں۔ بڑا مذاق اور سلیمی ہوئی۔ اور میں نے خود کو ایکٹروس کرتے ہوئے ان کے ساتھ چکا لیا تھا۔ اور وہ بھی، میرا خیال ہے مجھے پسند کرنے لگ گئی تھیں۔ پریس کلب میں میں نے انہیں پامپس کی منڈ بن ایڈیٹر کا حال سنایا تھا جس کو انہوں نے مزے سے سنا تھا۔ اور خوب ہنسی تھیں۔ اور دس سیری دوسرے خود بخود ہی ایسی دل نواز صحبت سے انگ رہنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ ہر حال اس کا ستارہ کافی کچھ مانڈ پڑ چکا تھا۔ نگاہیں کیوں کے درمیان پھرتے ہوئے جب دو تین بار ہمارے نظریں ٹکرائیں (ہم ہمیشہ کنکلیوں سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہتے تھے، چوں کہ نفرت بھی ایک قسم کی محبت ہے) تو مجھے ان میں خون آسانی کی جھلک دکھائی دی۔ مسٹر گورل ٹائیڈ کا حق پوری طرح ادا کرنے پر غصہ ہوا تھا۔ اگرچہ اپنی بادیہاں کی سیر کرنے کے بعد بھی اس کی معلومات ہمارے جتنی ہی تھیں۔ لیکن اسے اس جنگ کی تاریخ کے بارے میں کچھ سوچ بوجھ مٹی برائے نام سی۔ اس نے اس کے ہوتے پر ہمیں ایک پوری کہانی سنائی۔

اس جگہ کوئی ایسی چیز نہیں جسے ہدیہ کی کارگزاری سے منسوب کیا جاسکے۔ عجائبات اور نوادرات کا مجموعہ ایک گزرے ہوئے متول شہری کا فراہم کردہ ہے۔ کس لگن، کس محبت سے اس نے ان عجوبوں کو ڈھونڈا اور حاصل کیا ہوگا، گنتے ہزاروں لاکھوں روپے ان کے حصول پر خرچ آئے ہوں گے۔ اپنی مادی عمر میں اس نے یکسوئی سے اور دل دہان سے اپنے مثنوی کے پودے کی آبیاری کی، اور آرٹ

اور جن کی تلاش میں زندگی دے دی اور اس منزل تک پہنچنے کے جنون میں اس کے قدم کبھی نہ ڈگلائے۔

عجائب گھر کے داخلے پر اس میوزیم کے خالق کی بڑی فریم شدہ تصویر مٹلی تھی۔ گولڈ نے اسے خزیہ انداز سے ہمیں پرائنٹ آؤٹ کیا۔ کسی جگہ — میں نے سوچا، میں نے اس چہرے کو دیکھا ہے۔ چھوٹی جھینگل قدرے پر حسرت آنکھیں، تنگ نیچا ماتھا، بھولے ہوئے کمال، موٹے حساس ہونٹ، عموٹو بیاں دو بھیتیں اور چہرہ پیلہ، سر پر سفید گڑی تھی۔ میں نے اسے کہاں دیکھا ہے؟ کسی پرانی جنگلی فلم میں، لاہور کے کسی پھل فروش کی دکان پر انہیں! سکول کی تاریخ کی کتاب میں۔ راجہ رام موہن رائے کی تصویر کے ہلکے سے نقوش میرے سامنے ابھرے۔ فوٹو پرنٹ بھی اسی نسل کا تھا، مفید ڈھنڈلا، مبہم۔ میں نے تصویر کو غور سے دیکھا تو یہ وہ آدمی تھا جس کے دل میں نادر چیزیں اور دوستوں کے لیے اتنی لگن تھی۔ اس کے چہرے میں کوئی ایسی بات نہ تھی جس سے اس کے سحر سے مذاق اور ذوق سخن کا پتہ ملتا۔ یہ ایک عام گول مثول معصوم تن آسان جنگلی چہرہ تھا، کیا چہرے واقعی اتنا کچھ بنا سکتے ہیں جتنا صورت شناسوں کا دعویٰ ہے۔ کیا وہ دل کا سب حقائق اور سوز، اس کی لگن اور ہمیشہ آشکار کر سکتے ہیں۔ میں نے سوچا ممکن ہے دو محض ایک خرقین مزاج آرٹ کے خزانے جمع کرنے والا امیر آدمی جو جس کو کن چیزوں کی حقیقی قدر و قیمت معلوم نہ ہو اور جو انہیں خود نائی کے جذبے کے تحت اکٹھا کرتا ہو۔ میں یقیناً غلط تھا، تصویر کو دوبارہ دیکھنے سے مجھے اس میں ایک عجیب خوبصورتی نظر آئی۔ یہ ایک شائستہ مطمئن چہرہ تھا۔ اپنی قربی کی تہوں کے باوجود آنکھوں میں حسرت ضرور جھانکتی تھی۔ ایک مضطر تھا۔ ان سے زیادہ معصوم آنکھیں میں نے نہیں دیکھیں۔

گولڈ نے تصویر کے عین نیچے ایک جڑاے ہوئے کتبے کی عبارت کی طرف ہماری توجہ دلائی۔ ہم سب نے اسے باری باری پڑھا۔ اس کے باوجود کہ زندگی اور

گزرے جوئے سالوں نے ہمیں سرور دل اور دھم کے جذبے سے خائف بنا دیا تھا۔ اس کتبے کی عبادت میں اتنا درد تھا کہ ہم جذباتی ہو گئے۔ میری آنکھیں بھیگ گئیں اور میں نے جلدی سے اپنے آنسوؤں کو لٹکیوں سے آنکھ بچا کر پونچھ ڈالا۔ میں بلاوجہ ہنس پڑا۔ یہ کتبہ اس امیر آدمی نے اپنے بیٹے کی یادگار میں نصب کرایا تھا جو عین جوانی کے عالم میں دروغ مفارقت دے گیا تھا۔ کتبے کی انگریزی عبادت بڑی ہی مرمع اور قدرے مضحکہ خیز تھی۔ لیکن اس کے ایک ایک لفظ میں باپ کے شدتِ علم کی آنکھ تھی۔

آخر میں آنے والوں سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ اس نوجوان کی سادھی پر پھول سرور چڑھاتے جائیں۔

اس کتبے کے پیچھے ایک پُر درد چھوٹی سی کہانی ہے۔ اگر صرف گڑ گول بتاتا تو میں کبھی یقین نہ کرتا لیکن میں نے ڈھا کے میں اسے ایک دو قابلِ اعتماد آدمیوں سے سنا اور یہ ضرور سچ ہوگی۔ اس میوزیم اور باغ کے معمار کی پہلی بیوی شادی کے چند سال بعد ہی سرگباں ہو گئی۔ اس کے بطن سے اس آدمی کا ایک بیٹا تھا اور بیوی کے مرنے سے اس کی ساری محبت اپنے بیٹے پر مرکوز ہو گئی۔ دس بارہ سال گزر گئے اس آدمی نے دوسری شادی نہ کی۔ پھر کچھ خاندانی دباؤ سے اور کچھ اپنی چاہست سے اس نے دوسرا بیٹا اور چھ بیٹیاں عورت جوان اور خوب صورت تھیں۔ لیکن اس کا دل پتھر کا تھا۔ وہ کمائیوں کی سوئیل ماؤں کی طرح سخت دل اور بے رحم تھی۔ دوسری رانی لیکٹی جب اس نے دیکھا کہ اس کے شوہر کو اپنے بیٹے سے اسی طرح محبت ہے تو اس نے بیٹے کی طرف سے باپ کا دل میلا کرنے کے لیے کئی تریا چلتر کیے۔ سال کے بعد بیگوان نے اس کی گودہری کی۔ تب تو اس پر اپنے سوتیلے بیٹے کا وجود ہی کھلنے لگا اور وہ اسے نقصان پہنچانے کے ور پلے

ہر گئی —!

وہ یہ جانتی تھی کہ اس کے شوہر کی جائداد کا وارث بڑا بیٹا ہی ہو سکتا ہے۔ ایک دن وہ کھل کھل کر اپنے سوتیلے بیٹے سے جواب جان ہو چکا تھا بڑے چاؤ اور بھارے سے پیش آئی اور اسے اپنے ہاتھ سے دودھ کا گلاس پلایا۔ لڑکے کے دل میں کوئی دوسرا نہ تھا۔ وہ دودھ پنی گیا۔ یہ گمان کئے بغیر کہ اس امرت میں نہ ہر گھٹلا ہے۔ چند گھنٹوں کے اندر اندر اور بلیبوں اور عکبوں کی چارہ سازبوں کے باوجود وہ مر گیا۔ اس کے مرجانے کا اس کے باپ کو سخت صدمہ ہوا۔ ایسی باتیں کب چھپ سکتی ہیں۔ بات ظاہر ہونے سے نہ رہ سکی۔ جب باپ پر پڑا حال کھلا کہ اس کے لڑکے کی موت کیوں کر ہوئی ہے تو فریاد علم سے اس نے اپنے حواس کھو دیئے۔ وہ بدل گیا۔ اسے دنیا کی کسی شے سے دلچسپی نہ رہی — اپنے میوزیم اور باغ سے بھی نہیں۔ بیٹے کی موت کے چند ماہ بعد ہی وہ اس سے جا ملا۔

گوگول نے کیا کہ وہ سوتیلے ماں ابھی تک زندہ ہے اور پاس کے مکان میں رہتی ہے۔ مائیکرو بس کے ڈرائیور عزیز الرحمن نے بھی اس کی گواہی دی۔ پورے اس سلسلے سے معاملے کے متعلق بہت زیادہ حذب باقی ہو رہا تھا۔ اس نے اعلان کیا کہ اس عورت سے ملنا چاہیے۔ لیکن کسی دوسرے نے اس کی حافی نہ بھری۔ گوگول نے کلمہ کھلا اس کا مذاق اڑایا۔

ہم میوزیم سے باہر باغ میں آئے۔ گھنے پتوں میں جھپٹے کا سماں تھا اور روشنی گویا شفاف پانی میں سے ٹھہر کر آرہی تھی۔ یہاں دو یا تین پردوں کے یہ شیشے کے گھر تھے۔ پردے زیادہ تر ایسے تھے جو ان ہواؤں میں نہیں اُٹھتے۔ گرین ہاؤسوں سے آگے ہم باغ میں اور جنوری کی مسہر کی ٹھکانی دھوپ میں آئے۔ باغ بظاہر اچھا ہوا



اور دیران تھا۔ آسیب زدہ۔ بوٹوں اور راستوں کے بغیر۔ بابل کے ٹکٹے جوئے باغ دیکھنے کا مجھے اتفاق نہیں ہوا، ان کا منظر بھی کچھ ایسا ہی ہو گا۔ میرا چہیتا انگریزی مسنٹ رابرٹ لوئیس سٹیوئنس اُبڑے باغوں سے محبت کرتا تھا۔ اور اس کی ایک نظم حسین گھر اس طرح شروع ہوتی ہے: پھل اور پھول سے خشک باغیچہ۔۔۔ ایسی جگہ میں رہتا ہوں، باہر سے اجڑی پچھڑی، اور اندر سے بے سامان: مجھے بھی اُبڑے باغ پسند ہیں۔ خصوصاً یہ بلد یہ باغ۔ قتل و خون کے لیے یہ بڑی موزوں جگہ ہے اور جب بھی میں نے کسی کے قتل کا ارادہ کیا، ایسے تین چار آدمی میری نظر میں ہیں جن کے بارے میں کہیں کہیں میرے دل میں ایسی خواہش پیدا ہوتی ہے، تو میں اس کو باتوں باتوں میں یہاں لے آؤں گا۔ جب میرا ان جان شکار جاوا کے بڑکے درخت کو حیرت سے دیکھنے میں مہلک ہو گا، میں چپکے سے اپنا لمبا جاقو اس کی پیٹھ میں بھونک کر اسے چلتا کر دوں گا۔۔۔ سو دج کی گھر ڈی کے پیچھے ایک گھنٹہ اندھیری جگہ ہے جہاں لاش کو مناسب طریق سے ٹھکانے لگایا جاسکتا ہے۔

میں نے بورس کی طرف انگلیوں سے دیکھا کیا اس کے دماغ میں بھی اس وقت قتل کے خیالات گزر رہے ہیں ؟

گوگول کی زبان کہیں چلنے سے مذہمتی تھی۔ میرا خیال ہے کہ وہ دنیا کے سب سے بڑے آدمیوں میں ایک ہو گا لیکن وہ اپنے اخبار کا بڑا کامیاب نمائندہ تھا۔ بیچ لڑانے میں ملہز پچھلے پانچ سال سے وہ ڈھاکہ میں اخبار کے کام کو سنبھالے تھا۔ ہر کوئی اسے جانتا تھا۔ اور وہ ہر کسی کو۔ مگر گوگول قدرے بے پرواہ اور غیر سنجیدہ گائیڈ تھا۔ کوئی اس کی بات کا یقین نہیں کر سکتا تھا۔ ایک درخت کی طرف اپنی سونٹی سے اشارہ کرتے ہوئے گوگول نے بتایا کہ یہ بڑا کا درخت ہے۔ یہ اس قسم کی کوئی چیز نہ تھا۔ اگرچہ کئی اس کی

طرف اشتیاق سے پکے۔ یہ ایک عام کیکر تھا۔ جب لڑکیوں میں سے ایک نے وضاحت کی کہ بیاں گولوں بڑا کا درخت تو وہ آگے کوئے پر ہے، تو بیاں بے گول کر ڈرا خفت ہوئی ہو۔ اس نے جان بوجھ کر غلط معلومات مذہبی تھیں، اس نے صاف صاف اقرار کیا کہ اس کے لیے سب درخت ایک سے ہیں اور اس سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ کیلے کے پودے کو آم کا درخت بنا دے۔

ہم میں سے بیشتر میرے خیال میں گولوں کی کشتی میں سوار تھے۔ ذاتی طور پر میں اب تک ٹاہلی، سرس یا کیکر کے درخت کو ایک نظر میں نہیں پہچان سکتا۔ اپنے پیشے اور کام سے متعلق باتوں کے علاوہ ہمارا عام علم بہت محدود ہوتا ہے اور ہم خدا کی زمین میں آنکھیں نمونہ کر چلتے ہیں۔ اس اُبھڑے باغ میں کئی نادور درخت تھے جن کے پودے اس کے مالک نے دُور دُور کے دیوں سے منگوائے تھے۔ اور انہیں بڑی محنت اور محنت سے سینچ کر پروان چڑھایا تھا۔ وہ ایسے درخت تھے جو بنگال کی دھرتی میں نہیں ہوتے۔ ملایا اور بھنی اور برازیل کے انہانے درخت۔ ہمیں ان کے نام بھی بتائے گئے۔ اور اب مجھے یہ اقرار کرتے ہوئے شرم آتی ہے کہ ان میں سے صرف بڑا کا درخت میرے ذہن میں رہ گیا ہے۔

ہم ایک پتھر پرے حوض پر آئے۔ پانی کے بغیر ایک حوض اچڑی سیڑھیاں پھل تہہ تک جاتی تھیں، کہیں یہ پُر فضا جگہ ہوئی۔ اب یہ ایک وحشیانہ تھل کی حامل تھی۔ خالی شکستہ حوض، ویران درخت، یہ سب اس ٹریڈی کی کہانی بتاتے تھے جس نے ایک امیر اور سلجھے ہوئے خاندان کو آیا تھا۔ ہم درختوں کو دیکھتے تالاب کے گرد چلے اور آخر بیلوں سے چٹے ہوئے ایک کونے میں سورج کی گھڑی پر آئے ہم مغرب سے آنے والوں میں سے شاید کسی نے پہلے سورج کی گھڑی نہ دیکھی تھی

اور ہم نے اس عجوبے کو دیکھ کر ہلکا سا ڈاکٹر پامپس ناوسٹ یہاں ہوتا تو وہ اس موقع پر سوچ کی گھڑی پر ایک طویل اوٹ پٹانگ لیکچر دیتا۔ اور بعد ازاں اس مسلمان موجد کے حالات زندگی پر ایک تبصرہ کرتا جس نے سب سے پہلے یہ گھڑی ایجاد کی تھی۔ وہ اس کی بابت کچھ جاننے بغیر نہیں بٹلنے کی کوشش کرتا کہ اس سے وقت کیسے دیکھا جاسکتا ہے۔ سوچ کی گھڑی ایک پتھر سے چوتھے پر مشتمل تھی جس پر دھرم ہندوؤں کے نشان تھے۔ اس کے اوپر ایک گوبے کے پتر کا سایہ پڑتا ہے اور وقت کی نشاندہی کرتا ہے۔ درختوں کے دھندلکے میں پتر کا سایہ غیر واضح اور نامعلوم سا مانتا تاہم گوگل اور چند دوسروں نے اسے ڈھونڈ نکالا۔ میں یہ دیکھ کر حیرت زدہ ہوا کہ یہ گھڑی محض ایک آرائشی عجب ہی نہ تھی۔ یہ قریب قریب صحیح وقت بتاتی تھی۔ اور سوچ کی گھڑی اس باغ کے آخر میں تھی۔ ہم وہاں سے چھپکاتے دہے قدموں سے دھست چوتے تاکہ خوابیدہ دھڑوں کو نہ جگا دیں۔ لیکن میں نہیں جانتا کہ میرے ساتھیوں کے احساسات کیا تھے؟ سوچ رہا تھا کہ وہ آدمی جس کے اندر اتنی لگن تھی اور جس نے یہ میوزیم اور باغ بنایا تھا ہزاروں میں ایک تھا۔ وہ ایک دھرم مانا تھا۔ ایسے آدمی کم ملتے ہیں۔ اس خراب آبادی میں جہاں ہم میں سے بیشتر زندگی کی گھڑیوں اور الجھنوں کو چھوٹی چھوٹی رنجشوں، غنائی تلیوں اور حقیر مصروفیتوں کی زندگی گزارتے ہیں، اور ساری عمر اپنی ناکامیوں کے زخموں سے گزار دیتے ہیں، ایک لگن رکھنے والا آدمی قابلِ ستائش ہے۔

باہر جانے سے پہلے میں مڑا اور میں نے دونوں ہاتھ جوڑ کر اس آدمی کو پرنام کیا جس کے دل میں حسن کی اتنی لگن تھی اور جو درختوں کو پیار کرتا تھا۔

## چاندنی کا طلسم

یہ طلسم جو چاندنی جنگل اور درختوں پر بھونکی  
ہے صرف ایک بہت بڑے ساحر کا کام ہے۔ درخت  
عجیب خدائی صورتوں میں بدل جاتے ہیں۔ بعض  
دفعہ وہ عظیم آسمان کو چھوتے ہوئے دیو بن جاتے  
ہیں، اور کئی مرتبہ دھک کر ادھر ادھر پھیل  
جاتے ہیں۔ میں نے ایک درخت دیکھا جو اس وقت  
ایک بہت بڑا بادبانی جہاز بنا ہوا تھا اور یوں معلوم  
ہوتا تھا جیسے وہ اپنے تمام بادبان پھیلائے کسی  
جزیرے میں مدفون خزانے کی دھن میں رواں دواں  
کو تیار کھڑا ہو۔ ایک درخت جو ہوائی چکی کا  
روپ دھارے تھا میرے غور سے دیکھنے پر فوراً  
اپنی اصلی شکل میں آگیا۔ اور وہ ایک بڑا اور  
سہیب ٹینک! جو میرے نزدیک آنے پر کیمک میں  
بدل گیا!

(”ڈیاو سے لو کوٹ نک“ — سفرنامہ)

## یہ کتاب

اب سے پندرہ برس پہلے جب محمد خالد اختر کی پہلی کتاب ”یس سو گیارہ“ چھپی تو نقادوں اور پڑھنے والوں نے اسے اپنے اسلوب کی تازگی اور اچھوتے قلیل کے لیے بے حد سراہا۔ کشمیا لال کپور نے اسے اردو زبان کی پہلی سیاسی اور معاشی طنز قرار دیتے ہوئے کہا ”میرا اس کتاب کے متعلق رد عمل یہ ہے کہ کاش میں اس کا مصنف ہوتا۔“ اس کے بعد کے سالوں میں محمد خالد اختر نے متعدد مختصر افسانے، طنزیہ خاکے اور سفری کہانیاں لکھیں جو ملک کے اچھے ادبی ماحناموں میں چھپیں اور اس کا نام بہت سے پڑھنے والوں کے لیے آشنا ہو گیا۔ اس کا طرز بیان خود اس کا اپنا تھا اور اردو کے لیے ایک بالکل نئی چیز! اس کا دوسرا ناول ”چاکلیواڑہ میں وصال“ جو کئی سال پہلے کا لکھا ہوا تھا حال ہی میں چھپا ہے اور ”یس سو گیارہ“ کی طرح ایک انوکھا بزرگ کاوت شاہکار ہے۔

موجودہ کتاب جو آپ کے ہاتھ میں ہے مصنف کے افسانوں، خاکوں اور سفری روئدادوں کا ایک مجموعہ ہے۔ یہ سب کے سب پہلے مختلف رسالوں میں چھپ چکے ہیں۔ اس نے انہیں کتابی شکل دینے کے لیے صرف ان چیزوں کا انتخاب کیا ہے جو اسے زیادہ محبوب ہیں اور جن کو وہ محفوظ کرنا چاہتا ہے۔ محمد خالد اختر بہت سے دوسرے لکھنے والوں کے برعکس خود کو نہیں دھراتا، اس لیے اس کی ہر کہانی اور ہر مضمون کا رنگ ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے، چاہے وہ محبت کے آگے کی تکنیک بیان کر رہا ہو، یا ہردوار میں انسانوں اور پندروں میں مشابہت تلاش کر رہا ہو یا صحرا میں چاندنی کے جادو سے مسحور ہو رہا ہو۔ وہ ہر صورت میں پڑھنے والے کے دل کو بہلاتا اور اسے مسرت سے ہنسنے کرتا ہے!

’چچا عبدالباقی‘ کے روپ میں محمد خالد اختر نے اردو مزاح کو ایک لازوال کردار دیا ہے، اور بہت سے پڑھنے والے مصنف کو اس کی ’عبدالباقی کہانیوں‘ کی وجہ سے جانتے ہیں۔ اس مجموعے میں دو ’عبدالباقی کہانیاں‘ بھی شامل ہیں جن کے اندر یہ کردار اپنی معصومیت، خوش فکری اور مضحکہ خیز خود اعتمادی کے ساتھ بوزی طرح جلوہ گر ہے۔